

لکھا ڈائجسٹ

APRIL  
2016

PDFBOOKSFREE.PK

ماڈل: رانیہ  
میک اپ: پرو پیوٹی پارلر  
فوٹو گرافی: مسویٰ رضا



# رداء الحسٹ

جیسا ڈیٹر  
مسالہ محمود

ایڈیٹر  
سنگی لکچر جعفری،  
نائبہ لکچر، دراز جعفری  
E-Mail: singi@reda.com  
نائبہ لکچر، UAE، غیر مسلم جعفری  
E-Mail: singi@reda.com  
نائبہ لکچر، پاکستان، آصف چان





## افسانے

## سلسلے وار ناول

- زندگی پھول محبت خوشبو ۱۰ شازیہ مصطفیٰ  
 اے عشق ہمیں برباد نہ کر ۹۶ نائیکہ طارق  
 چل اڑ جا اب تیری باری ۲۱۴ عائشہ ذوالفقار  
 اپریل فوول یا فضول رسم سیدہ فرزانہ حبیب ۷۰  
 محبت فاتح عالم ۶۸ ثناء ناز  
 فیصلہ ۸۲ حنا اشرف  
 ہیں ایسے بھی مہرباں ۷۸ ماریہ یاسر  
 اپریل فوول ۱۶۹ ثناء کنول  
 اعتبار یار ۱۷۲ یاسمین آفریدی  
 غریب ۱۷۶ مریم فاطمہ  
 بے وجہ ہی ۲۶ عائشہ الیاس  
 صدائے من ۱۱۴ آسیہ مظہر چوہدری  
 ایک تھی عفاف ۱۸۸ حورینہ سعد  
 دلنشیں محبت ۱۹۳ ماریہ عمران  
 دل کے ہاتھوں مجبور ۲۰۴ سحرش فاطمہ  
 ایسا بھی ہوتا ہے ۲۱۰ عمارہ خان  
 پائل عشق ۲۶ عائشہ الیاس  
 جنون عشق ۱۱۴ آسیہ مظہر چوہدری  
 ناولٹ ۵۶ نظیر فاطمہ  
 حسرتِ ناتمام ۱۵۶ عائشہ مری  
 سب مایا ہے

www.facebook.com/rida.digest

زیر سالانہ بذریعہ رجسٹری  
 720 روپے

اپریل 2016ء

جلد نمبر 20 شمارہ نمبر 4

قیمت 60 روپے

34535726

پبلشر ایڈیٹر صالحہ محمود نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔  
 مقام اشاعت: ۱۱۳۹ ڈی بلاک - 2 - پی - ای - سی - ایچ - سوسائٹی، کراچی

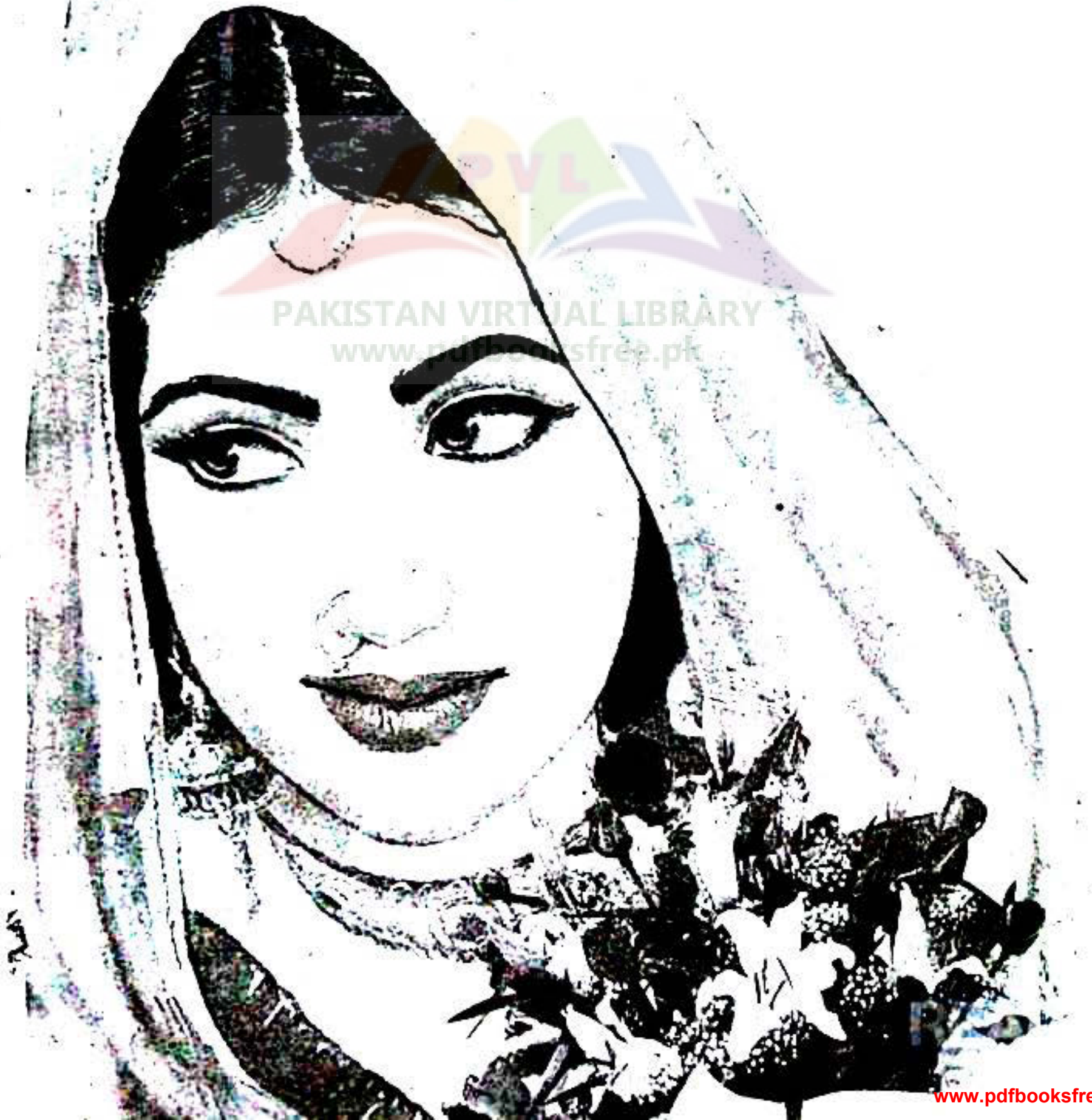
انتباہ:-

ماہنامہ "ریدا" سب سے زیادہ شائع ہونے والی ہفت روزہ کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نیویگیٹل یا ذرا مال دارانہ یا تعلیمی اور طبی ادارے کی بھی ناول کی اشاعت پر ادارہ چوری کی ایف آئی آر درج کر دے گا اس لئے پبلشر سے اجازت لینا ضروری ہے ادارہ "ریدا" پبلیکیشنز۔



# مستقل سلسلے

۲۴۵	صالحہ محمود	۷	سندیسے	صالحہ محمود	ردائے جنت
۲۵۴	ثریا اقبال	۲۳۰	کچن	صدف سعد	ردا کی ڈائری
۲۵۷	شہلا مشائق	۲۴۱	سنگھار	شہلا مشائق	ذرا پھر سے کہنا
۲۳۲	نورین ملک	۲۳۸	اشعار	نورین ملک	خوشبو
۲۵۱	ادارہ	۲۳۴	دوستوں کے نام پیغام	نورین ملک	اس ماہ میں







لحم بہ لمحہ ملکی حالات کی نوعیت تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ روز نئے طریقہ کار دہشت گرد اپنا رہے ہیں۔ کوئی جامع پالیسی بھی ایسی نہیں کہ ان شدت پسندوں کو روکا جائے، سانحہ کہیں بھی ہو یہ دکھ کی ایک بات ہے۔ اقبال پارک میں ایک گھناؤنی سازش کے تحت بم دھماکہ کیا گیا۔ اس میں مرنے والے ہمارے ہی بہن بھائی اور بچے تھے۔ اس میں ”را“ ملوث ہے۔ اپنے ہی بہن بھائیوں کو خون میں نہلایا گیا اور وہ یوں جہنم رسید ہوا کچھ گرفتار پان بھی عمل میں آئیں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے۔ مشتبہ افراد کے نیٹ ورک کو توڑا جائے اور اس سانحے کو سنجیدگی سے دیکھا جائے ہمارے اداروں اور ہماری حکومت کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے یہ معمولی بات نہیں کہ اس سانحے میں 72 افراد شہید ہو گئے۔ ہر بار ایسے سانحے جنم لیتے ہیں۔ ہر بار میڈیا، حکمران، ادارے سب حرکت میں آتے ہیں۔ جامہ تلاشی ارد گرد ماحول کی پوزیشن بھی سنبھالی جاتی ہے لیکن ایک کے بعد پھر وہی خود کش دھماکے اور ہلاکتوں کا سلسلہ سب کچھ وقت کی گرد میں دھواں دھواں بات پھر وہیں سے شروع کہ فلاں جگہ دھماکا ہوا، ہم دہشت گردی کی مذمت کرتے ہیں اگر ثبوت مل گئے ہوں تو پھر دیر کس بات کی فوری طور پر ایکشن لینا چاہیے دنیا کے دوسرے ممالک بھی ہیں آپ اپنے ہمسایہ بھارت کی مثال لے لیجیے کوئی ویزے کے بغیر ایک دن رہ کر دکھا دے۔ یہاں تو ابھی تک ہجرت کا سلسلہ جاری ہے۔ بس اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں محفوظ اور ہمارے ملک کو قائم و دائم رکھے، آمین۔ ہمسایہ ملک بھارت ہمارا دشمن ہے اور اس نے کبھی پاکستان کو تسلیم نہیں کیا۔ ”را“ کی موجودگی ایک حقیقت ہے جو دنیا کے سامنے ہے نہیں جی یہاں تو ہمارے وزیراعظم صاحب! مودی سرکار کے لیے تحفے اور تحائف بھیجتے ہیں۔ دعا کریں کہ اللہ ہم سب پر اپنا رحم و کرم اور ہمارے حکمرانوں کو اللہ ہدایت دے، آمین۔

اپریل کا شمار بہت خوب صورت شمارہ ہے۔ اس بار پھر شازیہ اور نائیلہ خوب صورت انداز میں اپنی تحریر لے کر آئیں ہیں۔ لازوال محبتوں کے یہ ایسے خزانے ہیں جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ سند یہ ضرور لکھیں۔

نوٹ: ردا میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے بارے میں میرا اصول رہا ہے کہ تحریر خواہ کیسی ہو ہم نے ردا میں اس کے حوالے سے تنقید یا ناقابل اشاعت سمجھی نہیں لکھا۔ یہ میرا اور میرے رائٹر کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ لہذا یہی وجہ تھی کہ میں نے ردا کا کوئی ای میل ایڈریس نہیں بنایا۔ اس بات کا آپ بھی خیال رکھیں کہ غیر ضروری کسی رائٹر پر تنقید نہ کریں۔ ورنہ ہم اس رائٹر کو ردا میں بین کر دیں گے۔ ہماری پالیسی کا ایک یہ بھی حصہ ہے۔ آپ تنقید کریں مگر تہذیب کے دائرے میں رہ کر۔

آپی



## مومن، کافر اور منافق کا بیان

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا چار باتیں ایسی ہیں کہ جس میں وہ پائی جائیں گی۔ وہ پکا منافق ہوگا اور جس میں ان میں سے کوئی ایک بات پائی جائے گی۔ اس میں نفاق کی صرف ایک ہی شق ہوگی تا آنکہ وہ اسے ترک کر دے۔ وہ چار باتیں یہ ہیں جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے، کسی سے کوئی معاہدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، جب وہ کسی سے کوئی وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے جب اس کا کسی سے جھگڑا ہو جائے تو وہ گالی گلوچ پر اتر آئے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے۔ انصارؓ سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے اور ان سے بغض رکھنا نفاق کی نشانی ہے۔

حضرت زید بن خالد جہنیؓ کا بیان ہے کہ ابھی رات کی تاریکی باقی تھی کہ آنحضرتؐ نے ہمیں مقام حدیبیہ میں صبح کی نماز پڑھائی اور سلام کے بعد مقتدیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا تمہیں کچھ خبر ہے حق تعالیٰ نے کیا ارشاد فرمایا ہے؟ انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا حق تعالیٰ نے ابھی فرمایا ہے کہ میرے بندے اس حال میں صبح کرتے ہیں کہ ان میں سے بعض مجھ پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض میرا انکار کرتے ہیں۔ پس جو یہ کہتا ہے کہ ہم پر اللہ کے فضل و کرم سے بارش ہوئی وہ مجھ پر ایمان رکھتا ہے اور نجوم کا منکر ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ

فلاں فلاں ستاروں کے اثرات کے نتیجے میں بارش ہوئی وہ میرا منکر اور نجوم پر ایمان رکھنے والا ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرتؐ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ایمان اور کفر و شرک کے درمیان دانستہ ترک نماز حد فاصل ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ کون سا عمل بہتر ہے؟ فرمایا، نماز کو اس کے وقت پر ادا کرنا۔ میں نے عرض کیا اس کے بعد کون سا عمل بہتر ہے؟ فرمایا، والدین سے بہتر سلوک کرنا۔ میں نے پھر عرض کیا اس کے بعد کون سا عمل بہتر ہے؟ فرمایا، راہِ خدا میں جہاد کرنا۔

حضرت عمرو بن شریلؓ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہؓ نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ خدا کے نزدیک کون سا گناہ بہت بڑا ہے؟ فرمایا یہ کہ تو کسی کو خدا کا شریک قرار دے۔ حالانکہ خدا ہی نے تجھے پیدا کیا ہے۔ نے عرض کیا بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ پھر اس کے بعد کون سا گناہ بڑا ہے؟ فرمایا یہ کہ تو اس خوف سے اپنی اولاد کو ہلاک کر ڈالے کہ وہ تیرے رزق میں حصہ دار ہوگی۔ میں نے پھر عرض کیا اس کے بعد کون سا گناہ بڑا ہے؟ فرمایا یہ کہ تو اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جس نے ہم سے دھوکہ کیا وہ ہم میں سے نہیں۔

حضرت علقمہؓ نے بروایت حضرت عبداللہؓ بیان



کیا ہے کہ جب ذیل کی آیت نازل ہوئی۔ (ترجمہ)  
”وہ لوگ جو ایمان لائے پھر انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے ملوث نہیں کیا۔“

تو صحابہؓ پر یہ امر شاق گزرا اور انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے کون ایسا ہے جو اپنے نفس پر ظلم نہیں کرتا۔ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھتے ہو بلکہ اس بات کو اس مثال سے سمجھا جائے کہ حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی تھی اے میرے پیارے بیٹے تو خدا کا کسی دوسرے کو شریک نہ بنانا کیوں کہ شرک ظلم عظیم ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا تم میں سے کسی کے پاس شیطان آکر پوچھتا ہے کہ فلاں فلاں شے کو کس نے پیدا کیا یہاں تک کہ آخر میں یہ سوال کر بیٹھتا ہے کہ تمہارے رب کو کس نے پیدا کیا؟ جب وہ اس حد تک پہنچے تو انسان کو اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے اور آگے بات کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا جس نے اپنے کسی مسلمان بھائی کا حق غصب کیا اللہ اس کے لیے دوزخ لازم اور اس پر جنت حرام کر دے گا۔ اس پر ایک صحابیؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ اگرچہ کوئی معمولی چیز ہی غصب کی ہو؟ فرمایا اگرچہ پیلو کے درخت کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ اگر کوئی شخص مجھ سے میرا مال چھیننا چاہے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ فرمایا اسے اپنا پال نہ دو۔ عرض کیا اگر میرے انکار کرنے پر وہ مجھے قتل کر ڈالے، فرمایا تب تو شہید کا مرتبہ پائے گا۔ عرض کیا اگر میں اس کی بدینتی پر اسے قتل کر ڈالوں، فرمایا وہ دوزخ میں جائے گا۔

انہی راوی سے ایک روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا اسلام کی ابتدا کسمپرسی و غریب الوطنی میں ہوئی اور وہ اپنی ابتداء کی طرح آخر میں بھی اسی طرح بے یار و مددگار رہ جائے گا۔ پس اس مناسبت کی بنا پر بے یار و مددگار بیکسوں کے لیے خوش خبری اور مبارک باد کا موقع ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کسی مرد کو کسی مرد کی اور کسی عورت کو کسی عورت کی ستر کی جگہ کو نہ دیکھنا چاہیے۔ علیؓ ہذا کسی مرد کو دوسرے مرد کے ساتھ اور کسی عورت کو دوسری عورت کے ساتھ ایک چادر میں لپیٹ کر نہ لیٹنا چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ دو لعنتیوں سے بچتے رہو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ دو لعنتی کون کون ہیں؟ فرمایا ایک وہ ہے جو لوگوں کی گزرگاہ میں رفع حاجت کرتا ہو دوسرا وہ جو لوگوں کی سایہ دار آرام گاہ میں غلاظت ڈالتا ہو۔

حضرت جابرؓ نے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ تم میں سے جب کوئی دھونی لے تو تین مرتبہ دھونی لے اور جب کوئی وضو کرے تو ناک میں پانی ڈال کر ناک کو جھاڑ دے۔

حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں ان سے دریافت کیا گیا کہ آپؐ کے نبی نے تو آپؐ کو ہر شے کے طور طریقے حتیٰ کہ بیت الخلا کے آداب تک سکھا دیے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا۔ بے شک آنحضرتؐ نے رفع حاجت کے وقت قبلہ رخ بیٹھنے دائیں ہاتھ سے استنجا کرنے۔ تین ڈھیلوں سے کم استنجا کرنے اور ہڈی اور گوبر سے استنجا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ☆☆



شازیہ مصطفیٰ عمران

سلسلہ دارناول

پہلی قسط

# زندگی بہرے میں بہت شگفتہ

وہ کتنے آنسو بہاتی جا رہی تھی ایک ماں ہی کا تو آسرا تھا اور باپ بھی کبھی کبھی آتا تھا۔ آنسو پھر نکل رہے تھے، دو دن سے یونیورسٹی بھی نہیں گئی تھی، بخار بہت تیز ہو رہا تھا۔





”بیٹا! اب کیسی طبیعت ہے؟“ زبیدہ بیگم نے اس کے سر ہانے بیٹھ کے اس کے الجھے بالوں کو سمیٹا۔  
 ”خالہ ناظم کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے مندی مندی آنکھیں کھولیں۔  
 ”نوج رہے ہیں یہ بتاؤ طبیعت بہتر ہوئی؟“  
 ”جی پہلے سے بہتر ہے۔“ وہ اٹھنے لگی۔  
 ”بیٹا ناشتہ بنا دیتی ہوں تم اس کے بعد دوائی لے لینا۔“ وہ اٹھنے لگیں۔  
 ”آپ رہنے دیں میں خود بنا لوں گی۔“ رورو کے اس کی آنکھیں موٹی ہو گئی تھیں۔  
 وہ آج یونیورسٹی بھی نہیں جاسکی ہر وقت امی کو یاد کرتی رہتی تھی ان کا ماضی ایسا تھا کہ وہ خود بھی کسی سے بات  
 نہیں کرتی تھی ایک یہ رانی کی منہ بولی بہن تھی جو اس کا خیال رکھتی تھی۔  
 ”کاش میں بھی آپ کے ساتھ چلی جاتی۔“ وہ واش روم سے نکلی تھی۔  
 ”شہوار کدھر ہے؟“





”وہ تو یونیورسٹی چلی گئی کہہ رہی تھی آج بہت کام ہے۔“ زبیدہ خالہ نے بتایا۔

”خالہ، ابو کو کتنے دن ہو گئے ہیں وہ آئے ہی نہیں۔“

”بیٹا ایک گھر بار والے کو آنے میں مشکل ہوتی ہوگی تم دل چھوٹا نہیں کیا کرو ایک دن انشاء اللہ شکیل بھائی تمہیں اس گھر میں لے جائیں گے۔“ وہ اسے تسلی اور اطمینان دلائی تھیں۔

نیل فراتنی سا برا اور شاکر اور کم گوشتی وہ تو کسی سے بھی کوئی شکوہ نہیں کرتی تھی اور کبھی اس نے اپنے باپ سے شکوہ نہیں کیا کہ اسے اور اس کی ماں کو عزت سے گھر کیوں نہیں لے کے گئے۔

ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کے وہ اپنے ایساٹمنٹ کھول کے دیکھنے لگی۔ آخری سال تھا اس لئے پڑھائی دل جمعی سے کر رہی تھی۔ شکیل احمد کی بھی خواہش تھی وہ زیادہ سے زیادہ پڑھے، وہ نیل فر سے محبت اور پیار کرتے تھے ہر ہفتے وہ باقاعدگی سے ملنے آتے تھے اور کثیر رقم بھی اس کے خرچ کے لئے دے کے جاتے تھے، اس کے ذاتی اکاؤنٹ میں بھی اس کے لئے خاصی رقم منتقل کر دیتے تھے تاکہ اسے کسی طرح کی بھی پریشانی نہیں ہو۔

رانی کے عالج پر انہوں نے کسی قسم کی کوئی کمی نہیں کی تھی مگر وہ پھر بھی ان کا ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ رانی کی منہ بولی بہن تھی جو ان کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ ان کے شوہر نے انہیں طلاق دے دی تھی، وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ان کے گھر میں ہی رہتی تھیں۔ شکیل احمد ان کی بھی مالی مدد کرتے رہتے تھے، ان کی بیٹی کی تعلیم کا بھی خرچہ اٹھا رہے تھے۔

وہ ایساٹمنٹ بنانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنے لیٹ گئی جب تک شوہر بھی نہیں آئی تھی۔

”تمہیں میں نے صبح اتنا اٹھایا تم اٹھی ہی نہیں۔“

”بس تھکن ہو رہی تھی۔“ کسمندی سے وہ بستر پر پڑی تھی۔

”تم سوائے رونے کے کرتی کیا ہو تھکن تو ہوگی ہی۔“

”زندگی میں رونا ہی لکھا ہو تو اور زیادہ یہ سوچ کے رونا آتا ہے۔“ وہ پرسوج لہجے میں گویا ہوئی۔

”تم شکر ادا کرو کہ تمہارے ابو تمہارا خیال تو رکھتے ہیں تمہیں پوچھنے بھی آتے ہیں میرے باپ کو دیکھو مجھے

اور میری ماں کو بے دخل کر کے جانے کہاں ہوں گے، ضرور اپنی دنیا بھائی ہوگی وہ تو شکیل انکل اتنے اچھے ہیں میرا بھی تمہاری طرح خیال رکھتے ہیں۔“ شہوار کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔

”تم پھر شروع ہو گئیں جاؤ کھانا کھاؤ۔ جب سے یونیورسٹی سے آئی ہو ایسے ہی بیٹھی ہو تمہیں بھوک نہیں لگ رہی؟“ نیل فر نے بات کو ہی کاٹ دیا۔

”تم نے کھانا کھالیا؟“ وہ اپنے کپڑوں کی شکنیں ہاتھ سے نکالتی ہوئی کھڑی ہوئی۔

”آج ناشتہ ہی دیر سے کیا ہے اس لئے کھانے کی گنجائش نہیں تھی۔“

”چلو میں فریش ہو کے اپنا کھانا یہیں لے آؤں گی۔“ نیل فر نے مسکرا کے سر ہلایا۔

”اگر شہوار نہیں ہوتی تو وہ کیا کرتی اتنی پیار کرنے والی زبیدہ خالہ نہیں ہوتیں تو وہ امی کے بعد تو تمہارا ہی نہیں

سکتی تھی۔“ نیل فر کو ایسا لگتا تھا اس کی زندگی سے دلچسپی ہی ختم ہو گئی ہے امی کے بعد جیسے کچھ بچا ہی نہیں ہے۔ امی نے آخری دنوں میں ابو سے کہا تھا۔

”شکیل احمد اپنی بیٹی ساتھ لے جانا یہ میرے بغیر مر جائے گی۔“ نیل فر کا تو رورو کے برا حال تھا شکیل احمد نے

اسے ساتھ لگایا۔

”رانی تم ایسی باتیں نہیں کرو ٹھیک ہو جاؤ گی تم۔“ وہ ہمیشہ تسلیاں ہی دیتے تھے۔ نیل فر کی آنکھیں پھر



آنسوؤں سے بھر گئیں اسے شکیل احمد نے بتایا تھا اس کے دو بھائی بھی ہیں شکیل احمد نے اسے ساتھ لے جانے کی کبھی بات ہی نہیں کی تھی۔

☆.....☆

”آپ ہر وقت کہاں کھوئے رہتے ہیں۔“ ثریا نے انہیں خاموش ایک جگہ بیٹھے دیکھا۔  
”کہیں نہیں۔“

”یہ ضیاء کدھر ہے؟“

”آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔“ انہوں نے بتایا۔

”میں نے کتنے سالوں سے آپ کو اکثر یوں خاموش ایک ہی جگہ بیٹھے دیکھا ہے کیا بات ہے؟“ وہ تشویش میں پڑ جاتی تھیں۔

”ارے تم تو پیچھے ہی پڑ جاتی ہو ایسی کوئی بات نہیں ہے آفس کی میٹنگز تھکا دیتی ہیں۔“ انہوں نے ہمیشہ کی طرح بات کو ٹالا ثریا تو ویسے ہی بات کے پیچھے پڑ جاتی تھیں۔

”آپ ضیاء کو ادھر بھیجئے مجھے کچھ ضروری ڈسکس کرنی ہے آج میں آفس تو جاؤں گا نہیں۔“  
”خیریت!“ وہ پھر کھو جئے لگیں۔

”کہیں ضروری جانا ہے کوئی میٹنگ ہے۔“ وہ کھڑے ہو گئے۔

انہیں نیل فر کے پاس جانا تھا دو ہفتے سے گئے نہیں تھے، انہیں اندازہ تھا وہ اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔

”اگر آپ تھکے ہوئے ہیں تو ضیاء کو بھیج دیں آپ آرام کر لیں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ جائے ضیاء کو بھیجئے۔“ وہ انہیں بولے اور خود بھی جانے کی تیاری کرنے لگے۔  
اتنے میں ضیاء بھی آگیا اسے آفس سے متعلق ضروری باتیں سمجھائیں ثریا اکثر شکیل احمد کی طرف سے پریشان ہو جاتی تھیں۔ شکیل احمد تین بہن بھائی تھے خود بڑے تھے ان کے بعد زہرہ کے تین بچے تھے ایک بیٹی جو شادی شدہ اور دو بیٹے تھے۔ ان سے چھوٹے سجاد احمد تھے ان کے تین بچے تھے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا سجاد احمد نیچے کے پورشن میں تھے کافی بڑا بنگلہ تھا ہر طرح کی سہولت میسر تھی۔

”ضیاء! یہ تمہارے ابو کہاں جا رہے ہیں؟“

”امی کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ وہ ہنسنے لگا۔

”اچانک سے تمہارے ابو غائب ہو جاتے ہیں۔“ وہ بولیں۔

”آپ ابو پر شک کر رہی ہیں؟“ وہ پھر ہنسا۔

”بھائی! امی تو لگتا ہے کسی لڑکی کے چکر میں تو نہیں پڑ گئے ہیں۔“ حمزہ نے بھی مسکرا کے لقمہ دیا۔

”زیادہ الٹی سیدھی نہیں ہانکا کرو میں تو اس لیے فکر مند ہوئی ہوں ایسا لگتا ہے وہ کسی الجھن میں گھرے رہتے ہیں۔“ انہوں نے حمزہ کے دھب لگائی ضیاء کی ہنسی نکلی تھی مگر کنٹرول کیا۔

”آپ کو نہیں پتہ امی ہمارا بزنس بہت پھیل گیا ہے۔ ابو کو اسی کی فکر رہتی ہے لوگ جیس بھی ہوتے ہیں آپ جانتی ہیں کامیاب بزنس مین سے سب جلتے ہیں۔“ ضیاء نے وضاحت کے ساتھ انہیں سمجھایا تاکہ ان کی فکر بھی کم ہو۔

”میں نے شروع سے تمہارے ابو کو محنت ہی کرتے دیکھا ہے۔“ وہ سوچ کے گزرے دنوں کا ذکر کرنے لگیں۔



”پھر کیا مسئلہ ہے آپ ایسا کچھ غلط نہیں سوچا کریں ہمارے ابو ایک کامیاب انسان ہیں جو اپنے کام کے ساتھ اپنی فیکٹری کا بھی خیال رکھتے ہیں۔“

”ہوں یہ تو ہے۔“ وہ ان دونوں کے ساتھ ناشتہ کر رہی تھیں۔

”حزہ کالج چھوڑ دوں یا چلے جاؤ گے۔“

”بائیک ٹھیک ہے میری چلا جاؤں گا۔“ چائے کے جلدی جلدی سپ لیتے دونوں ہی نکل گئے تھے۔

☆.....☆

”امی! یہ فہر کب سے سو رہا ہے اٹھا نہیں۔“ کنول نے ان سے پوچھا۔ زہرہ ناشتے کے برتن ملازمہ سے اٹھوا رہی تھیں۔ کنول دو دن سے رہنے آئی ہوئی تھیں ان کے دو بیٹے تھے عفان اور ریان۔

”آپ اس سے پوچھا کریں کیوں اتنی اتنی رات کو آتا ہے۔“ کنول کو اس لئے بھی غصہ آ رہا تھا دو دن سے یہاں تھیں اور فہر سے ان کی ابھی تک بھی تفصیلی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

”اس کی شادی ہوگی تو ہی یہ ٹک کے بیٹھے گا۔“ زہرہ خود فہر کی طرف سے پریشان رہتی تھیں۔

”سجاد ماموں کی شہداء..... بری تو نہیں ہے۔“

”کئی دفعہ بات کر چکی ہوں کہتا ہے مجھے ابھی کوئی شادی وادی نہیں کرنی۔“

”امی آپ اس کے کہنے میں رہیں تو یہ آپ کو ٹالتا رہے گا زبردستی کریں اس کے ساتھ۔“

”یہ آپ امی کے کان بھرنے آتی ہیں۔“ فہر گرے قمیض شلوار میں ڈانگ ٹیبل پر آ کے بیٹھا۔

”ہو گئی تمہاری صبح۔“ کنول نے قدرے برامان کے ناراضی سے کہا۔

”مصرف بندہ ہوں ظاہر ہے دیر تک سونا میرا حق بنتا ہے۔ امی پلیز ناشتہ تو لگوادیں دو کرارے پراٹھے اور زردی والا آلیٹ۔“ اس نے عاجزی سے کہا۔

”ایسے کون سے کاموں میں رہتے ہو۔“

”ہوتے ہیں کچھ کام۔“ وہ ان کے چڑنے پر محظوظ ہو رہا تھا۔

”کچھ کام خفیہ ہوتے ہیں وہ بتائے نہیں جاتے۔“ وہ رازداری سے اس کی جانب جھکا۔

”امی! اس نے ضرور کوئی شادی کر رکھی ہے اسی لئے آپ کو منع کرتا رہتا ہے۔“

”لاحول ولا قوہ آلی کیوں الزام لگاتی ہیں۔“ وہ تو گھبرا گیا۔

زہرہ، فہر کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

”دیکھ رہی ہیں امی آپ۔“

”سب دیکھ بھی رہی ہوں اور سن بھی رہی ہوں۔“ وہ خود اس کے لئے ناشتہ بنا کے لائی تھیں۔

”تم اتنی دیر سے گھر آتے ہو میری تو جان انکی رہتی ہے اور تمہارے بابا الگ ناراض ہوتے ہیں۔“

”کام کی مصروفیت بڑھ گئی ہے۔“ وہ پراٹھے کا لقمہ منہ میں رکھنے لگا۔

”ایسا بھی کیا کہ گھر والے ہی تمہیں نظر نہیں آتے۔“

”سب نظر آتے ہیں۔“ وہ ہنسا۔

”اچھا آپ کیا شکوے اور شکایتیں کرتی رہیں گی آپ کے دونوں صاحبزادے کہاں ہیں۔“ وہ پوچھنے لگا۔

”اسکول کا ہوم ورک کر رہے ہیں کل تو میں چلی جاؤں گی۔“



”کل ہی تو آئی ہیں۔“ وہ پھر گویا ہوا۔

”منڈے کو ان کا اسکول ہوتا ہے، سٹرڈے اور سنڈے چھٹی تھی سوچا کے دو دن رک آؤں گی۔“ کنول اپنے لمبے چوڑے ڈشنگ بھائی کو دیکھ رہی تھیں۔

”فہرتم نے کیا سوچا ہے۔“ وہ انجان بنا۔

”شادی کرنی ہے یا نہیں۔“

”وہ ابھی تو بالکل نہیں۔“ اس نے نفی میں سر اٹھایا۔

”آپ مجھے بتائیے ہر دفعہ آ کے آپ یہ شادی جیسی فضول خرافات کیوں نکالتی ہیں۔“

”اچھا میری شادی تم لوگوں نے کی جب فضول خرافات نہیں تھی۔“ وہ برا مان گئی۔

”آپ کی شادی ضروری تھی اور بیٹیوں کو جتنی جلدی ہو رخصت کر دینا چاہیے۔“ اس نے مدبرانہ لہجے

میں کہا۔ زہرہ کو ہنسی آ گئی۔

”میں امی سے کہہ رہی تھی سجاد ماموں کی ثناء کے لیے بات کر لیتے ہیں تمہارا جب موڈ ہو شادی کر لینا۔“

”آپلی پلیز! مجھے معاف رکھیں میں نے کبھی ثناء کے متعلق نہیں سوچا اور ثناء میرے لیے بہنوں کی طرح ہے

ویسے ہی میری ایک اکلوتی بہن ہے چاہتا ہوں اور بھی بہنیں ہوں بھائیوں کا بھرم رہتا ہے۔“ اس نے بات

مذاق میں ٹالی۔

”یہ تو امی اسی طرح بکواس کرتا رہے گا۔ پتہ نہیں کیا سوچ کے بیٹھا ہے امی کا خیال نہیں آتا ان کا بھی دل

چاہتا ہوگا کہ تمہارے بچے ہوں۔“

”بھائی جان آپ کا موبائل بج رہا ہے۔“ مہادی اوپر سے تیز آواز آئی۔

”یار لے آؤ نیچے۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کے لیا۔

”پلیز ذرا آپ خاموش ہو جائیں میری ضروری کال ہوگی۔“ وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے کھڑا ہوا کنول

منہ بنا کے رہ گئی بغیر زہرہ ہنسنے لگیں۔ وہ فہر کو جانتی تھیں وہ اتنی جلدی شادی نہیں کرے گا۔ وہ موبائل پر بات کر رہا

تھا اتنے میں کنول اپنے دونوں بیٹوں کو دیکھنے اسٹڈی روم میں چلی گئی تھیں۔

”امی! کیوں آپ میرے پیچھے پڑ جاتی ہیں مجھے جب شادی کرنی ہوگی آپ سے کہہ دوں گا۔“ وہ ماں کو

ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”ابھی ہم تمہاری بات لگا لیتے ہیں۔“

”ابھی بالکل بھی نہیں اور ثناء سے بالکل نہیں کیونکہ مجھے بردبار اور سمجھدار لڑکی چاہیے جو آپ کے ساتھ رہ

سکے۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔ ثناء کچھ منہ پھٹ گئی اور اسے سنجیدہ بھی نہیں لگتی تھی کچھ شوخ و شنگ تھی۔ فہر کا

مزاج سنجیدہ تھا۔

”ثناء بری تو نہیں ہے۔“

”میں بری کہہ بھی نہیں رہا میں نے اسے ہمیشہ چھوٹی بہن سمجھا ہے اس لیے پلیز آئندہ ثناء کا نام نہیں لیے

گا۔“ اس نے آہستگی سے انہیں سمجھایا۔

”اچھا وہ مجھے حیدر آباد جانا ہے کل واپسی ہوگی۔“

”حیدر آباد کیوں اچانک سے۔“ زہرہ چونک گئیں۔



”وہاں فلائی اور بن رہا ہے اسے ہی ڈسکس کرنے جانا ہے کافی لمبا پروجیکٹ ہے دعا کیجیے گا۔“ اس نے ان کے ہاتھ تھامے۔

”پیکنگ کر دوں۔“

”دوسو ٹرکھنے ہیں میں خود رکھ لوں گا آپ پریشان نہ ہوں۔“ وہ انہیں تسلی اور اطمینان دلا کے اپنے روم میں جانے لگا۔

”امی اسے تو میری ذرا پرواہ نہیں ہوتی بہن چاہے کتنے دنوں بعد آئے۔“

”آپنی ایسی بات نہیں ہے آپ میرا کام جانتی ہیں پھر بھی ایسی بات کر رہی ہیں۔“ وہ انہیں منانے لگا۔

”جاؤ تم اپنے کام سے پیار کرو۔“

”لگتا ہے مجھے کچھ سوچنا پڑے گا تا کے آپ سب کا موڈ ٹھیک رہے۔“ وہ معنی خیزی سے بولتا ہوا اوپر کی سمت بڑھ گیا۔ ریان اور عفان بھی اس کے پیچھے بھاگے تھے۔

☆.....☆

”صنوبر پلیر! واپس وہی چینل لگاؤ۔“ وہ بضد تھی۔

”ماہا تمہارا دماغ خراب ہے اگر دادی جان کی نگاہ پڑ گئی تو تمہاری خیر نہیں ہے۔“ وہ اسے ڈرانے لگی۔

”دادی جان سو رہی ہیں تم مجھے دیکھنے دو۔“

”ماہا ماہا تم سدھر جاؤ۔“ صنوبر نے ریموٹ لے کے پھر چینل چینج کر دیا۔

”تم تو یا گل ہو۔“ وہ چیخی۔

”پیچھے دیکھو کون کھڑا ہے۔“ اس نے آہستگی سے اشارے سے کہا۔ دونوں ہال کمرے میں بڑی اسکرین پر اپنے اپنے پسندیدہ چینل دیکھ رہی تھیں۔

”کون ہے۔“ اس نے گردن گھمائی۔ شہزیل کھڑا ہوا کسی سے سیل پر بات کر رہا تھا۔

”شہزیل ہے تمہیں کیا پریشانی ہے دروازہ بند کر کے آتی ہوں۔“

”تم خود ہی دیکھو تمہاری وجہ سے مجھے ڈانٹ پڑتی ہے۔“ وہ تو ویسے ہی ڈرتی تھی۔

”ارے فلم کا اینڈ ہی تو دیکھ رہی ہوں اب وہ ایسا ہے تو کیا کروں۔“ اس نے ٹی وی آف کر دیا صنوبر تو چلی گئی تھی اور وہ شہزیل کو دیکھنے لگی جو بلیک پینٹ پر اسکا ٹی بلیو شرٹ میں ملبوس ڈیسنٹ اور چار منگ لگ رہا تھا۔

”کہاں جا رہے ہو۔“

”مارکیٹ تک جا رہا ہوں۔“ سیل اس نے پینٹ کی پاکٹ میں رکھا۔

وہ ماہا پر توجہ نہیں دیتا تھا مگر وہ پھر بھی اس کی راہ میں حائل ہوتی رہتی تھی۔

”کیا لینے؟“

”سرنے بھیجا ہے۔“

”تم ڈیڈی کو سرکیوں کہتے ہو، انکل کہتے ہوئے زبان میں درد ہوتا ہے۔“ آنکھیں نکال کے اس پر جڑھ دوڑی تھی بلیک ٹراؤزر پر لمبی شرٹ اور دوپٹے میں اسے گھبرانے اور بوکھلانے پر مجبور کر دیتی تھی، وہ بہت محتاط ہو کے اس سے بات کرتا تھا مگر لگتا تھا اسے ڈر یا لکل نہیں لگتا تھا۔

”کوشش کرنا ہوں بچپن کی عادت ہے مشکل سے جائے گی۔“ وہ ہنسا اور آگے بڑھ گیا۔ ماہا بھی پیچھے پیچھے اس



کے آنے لگی شہریل اس کی باتوں سے جتنا بچتا وہ اتنا ہی اس سے الجھتی تھی۔  
”میں ساتھ چلوں۔“

”بالکل بھی نہیں۔“ جھٹ منع کیا لاسٹ ٹائم بھی وہ ساتھ چلی گئی تھی دکانوں پر ادھم مچا کے رکھ دیا تھا۔  
”کیوں بالکل بھی نہیں مجھے بھی کچھ لینا ہے۔“

”میں سر کے کام سے جا رہا ہوں آفس کی کچھ سیٹنگ کا کام ہے کارپینٹر کے پاس جا رہا ہوں۔“ اس نے دوسرا کام بھی بتا دیا تاکہ وہ آگے کچھ نہیں بول سکے۔

”مارکیٹ بھی تو جاؤ گے میں ابھی آئی۔“ شہریل تیزی سے نکل گیا گاڑی کی چابی بھی اندر اپنے کمرے میں ہی بھول آیا تھا وہ لینے کے لیے اندر آیا۔

”شہریل اسے بھی تم ساتھ لے جاؤ کچھ ضروری چیزیں لینی ہیں۔“ بشری نے اسے کہا۔

”ماہا اپنی امی کو حمایت کے لیے ساتھ لائی تھی اسے پتہ تھا جب وہ کہیں گی تو شہریل منع ہی نہیں کر سکے گا۔“

”جی اوکے۔“ اس نے صبر کا گھونٹ بھرا۔ جلدی سے وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی تھی شہریل نے لمبا سانس بھرا تھا۔

”تم مجھ سے اتنا بھاگتے کیوں ہو؟“ گاڑی پورچ سے نکل چکی تھی اور وہ سامنے دیکھتے ہوئے گاڑی چلا رہا تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ مارکیٹ میں بہت دیر لگاتی ہیں اور مجھے دیر لگانے سے کوفت ہوتی ہے۔“

”بعد میں بھی تو بیوی کو لے کے جایا کرو گے جب کوفت نہیں ہوگی۔“ ماہا نے اس کے سپاٹ اور بارعب

چہرے کو دیکھا۔

”میں ایسی ناممکن باتوں کو سوچا نہیں کرتا۔“

”کیوں شادی نہیں کرو گے۔“ ماہا کو تو غصہ آ گیا۔

”آپ یہ بتائیے آپ کو کہاں جانا ہے۔“

”بھاڑ میں۔“ وہ سلگ کے رہ گئی۔

”اگر آپ بلا وجہ آ گئی ہیں تو میں آپ کو واپس ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ اس نے ماہا کے غصے سے پھولے

چہرے کو دیکھا۔

”شہریل اللہ کرے کہ تمہیں محبت ہو جائے۔“

”جی۔“ وہ تو اچھل گیا۔

”کیوں اونچا سنتے ہو۔“ وہ چیخی۔

”پتہ نہیں کیا بولتی رہتی ہیں، مجھے تو آپ کی سمجھ نہیں آتی۔“ وہ ہنس کے اس کی بات کا تمسخر اڑانے لگا۔

”زیادہ بھولے بننے کی میرے سامنے ایکٹنگ نہیں کیا کرو۔“

”اچھا آپ کو لگتا ہوگا۔“ وہ پھر مسکرا دیا ماہا کو زبردست غصہ جو آ گیا تھا اس نے بچپن سے ماہا کو نٹ کھٹ

اور شرارتی دیکھا تھا اور بڑے ہونت کے بعد بھی وہ ایسی ہی تھی۔ ماہا کے ڈیڈی نصیر احمد کو شہریل کسی فٹ پاتھ پر

روتا ہوا ملا تھا اور وہ اس وقت دس سال کا تھا اپنے گھر کا اتنا پتہ بھی نہیں تھا نصیر احمد نے اس کے گھر والوں کو

ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ ناکام رہے تھے شہریل کو بھی اتنا کچھ پتہ نہیں تھا۔

بس اسے اتنا یاد تھا اسکے ابو نے فورٹھ کلاس میں فیل ہونے پر مارا تھا وہ نا سمجھ اس وقت وہ مار نہیں سمجھ سکا اور

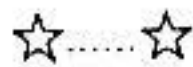
گھر سے نکل گیا اس کے بعد اسے یاد نہیں تھا نصیر احمد نے اس کا ہر طرح سے خیال رکھا تعلیم دلوائی اور بالکل گھر



کے بچوں کی طرح ہی سب اسے سمجھتے تھے، نصیر احمد نے اس کی تعلیم پوری ہونے کے بعد آفس میں رکھ لیا تھا وہ بہت محنت اور سمجھ داری سے ان کا ساتھ دے رہا تھا۔

ما با کچھ اس سے زیادہ ہی فری ہوتی تھی مگر شہریل نے اپنے اور اس کے درمیان لائن کھینچی ہوئی تھی اور نصیر احمد کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ شہریل کو اندر ایک خلا سا محسوس ہوتا تھا اس کے دو چھوٹے بہن بھائی بھی تھے، بہن رمضہ جو اس سے پانچ سال چھوٹی تھی، تین سال کی سیرہ اور ایک سال کا امجد تھا، جانے وہ اب کیسے ہوں گے وہ انہیں کیسے پہچانے گا۔ سولہ سترہ سال گزرنے کے بعد بھی وہ سب یاد کرتا رہتا تھا۔ یہاں رحمت والا میں اسے سب نے محبت سے رکھا تھا۔ مگر اسے اپنے خونی رشتے یاد آتے تھے۔

”کاش میں ایسا کر کے گھر سے نہیں نکلتا۔“ اکثر راتوں کو وہ سوچتا تھا اور ابو اور امی کو یاد کرتا تھا دونوں اس سے دور تھے۔



اسے جاب سے ریزائن بھی خود ہی کرنا پڑا تھا وہاں کا ماحول اسے اچھا نہیں لگا تھا اب وہ دوسری جگہ انٹرویو کے لئے جا رہی تھی۔

”امی، ابو آپ دونوں دعا کیجئے گا میرا انٹرویو کامیاب ہوا چھا ہو۔“ وہ ان دونوں سے دعا لے کے رخصت ہو رہی تھی۔

جب سے جاب سے ریزائن دیا تھا گھر کا خرچ بھی مشکل سے ہو رہا تھا ابو کا علاج بھی رک گیا تھا۔

”جاؤ بیٹا اللہ کے حوالے۔“ وہ خود کو بڑے سے دوپٹے میں سموئے سوچوں میں غلطاں جا رہی تھی اگر بروقت گاڑی کے بریک نہیں لگتے تو وہ ضرور نیچے آ جاتی۔

”اے محترمہ خودکشی کرنے کے لیے میری ہی گاڑی ملی تھی۔“ وہ غصے میں تن پھن کرتا ہوا نیچے اتر۔

”ارے جڑھانے والے تو آپ تھے، آپ کا کیا تھا چڑھا دیتے آپ امیروں کا تو کچھ نہیں بگڑتا مارے تو ہم غریب جاتے ہیں۔“ وہ سامنے والے شخص پر برس پڑی تھی۔ اور وہ حیرانگی سے اس کی دماغی حالت پر شبہ کرنے لگا۔

”مس آپ ہوش میں تو ہیں۔“ شہیر نے سیدھے ہاتھ سے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجا لی۔

”میں اگر بروقت بریک نہیں لگاتا تو..... ریوڈ پر آنکھیں اور کان کھلی رکھتے ہیں۔“

”شکر یہ بہت بہت۔“ وہ بری طرح چڑگئی تھی یہ کیا چپل بھی ٹوٹ گئی۔

”مجھے نہیں لگتا آپ کے آثار ہیں کہیں ٹھیک سے جانے کے۔“ شہیر نے اس کی ٹوٹی چپل دیکھ لی تھی۔

”شٹ اپ اپنا راستہ ناپیے۔“

”میں تو راستہ ناپ لوں گا آئیے آپ کو ہسپتال لے چتا ہوں لگتا ہے آپ کے دماغ میں کچھ خرابی ہے چیک کروائیے گا۔“ وہ اسے چھیڑنے ہی لگا۔

”آپ جاتے ہیں یا میں یہیں چپل آپ پر برسا دوں۔“ وہ اتنی بے زار اور پریشان تھی اسے یہ تک اندازہ نہیں تھا وہ کیا کہہ رہی ہے۔

”او کے میں چلتا ہوں مگر دھیان سے ٹریفک دیکھ لیں کتنی ہے۔“ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا رمضہ اور زیادہ ہر اس سال اور روہانسی ہو گئی۔ انٹرویو کا ٹائم نکل رہا تھا، چپل بھی ٹوٹ گئی تھی اور آس پاس کوئی بھی جوڑنے والا نہیں نظر آ رہا تھا۔



زندگی میں پہلی دفعہ اتنی ذلت اٹھانی پڑ رہی تھی آگے چل کے اسے چپل جوڑنے والا نظر آ ہی گیا۔ پھر وہ انٹرویو کے لیے گئی، اتنی لمبی لائن دیکھ کر تو اور وہ مایوس ہی ہو گئی۔  
”میرا انتخاب تو ناممکن لگ رہا ہے۔“ وہ افسردہ ہو گئی تھی۔

بچھے دل کے ساتھ انٹرویو دے کے نکلی تھی گھر کی مالی پوزیشن اتنی خراب تھی کہ رکھے ہوئے سارے پیسے بھی ختم ہونے والے تھے۔ سمیرہ کا فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن ہونا تھا۔ اسجد کی ٹائمن کلاس کی ایڈمیشن فیس جانی تھی، رمضہ کا سوچ سوچ کے دماغ دکھنے لگا تھا اپنے گھر کا وہی سہارا تھی، گریجویٹیشن کے بعد سے جاب کرنے لگی گریجویٹیشن بھی اس نے ایسے کر لیا اس وقت ابو ٹھیک تھے جب سے انہیں فالج کا ٹیک ہوا تھا وہ کسی قابل نہیں رہے تھے رمضہ کی پوری کوشش تھی کہ ابو ٹھیک ہو جائیں اور اس نے تہیہ کیا ہوا تھا وہ اپنے ابو کو ٹھیک کر کے رہے گی۔

☆.....☆

وہ ابھی گھر میں داخل ہی ہوا تھا، پورے صحن میں پانی پانی ہو رہا تھا تنقیدی اور ناگوار نگاہوں سے اوپر میڑھیوں سے پانی آتے ہوئے دیکھا تھا۔

”صفائی کا ہر وقت بھوت چڑھا رہتا ہے۔“ اس کے جوتے گیلے ہو گئے۔

”امی! امی!“ وہ چیختا ہوا اندر آیا۔

”کیا ہو گیا بیٹا خیریت تو ہے۔“ وہ شاید اندر کوئی کام کر رہی تھیں حنین کی آواز پر گھبرائی گھبرائی آئی تھیں۔

”امی اس لڑکی کو منع کیا کریں جب دیکھو صفائیاں کرتی رہتی ہے پورا صحن پانی پانی ہو رہا ہے۔“ اسے غصہ آ رہا تھا۔

”بیٹا! وہ خود صفائی کر کے جاتی ہے نیچے کی بھی۔“ وہ بتانے لگیں۔

”میں بتا رہا ہوں اگر یہی طریقے رہے تو میں انہیں بھی نکال دیوں گا یہاں سے۔“ وہ ویسے اس سے تپا رہتا تھا اور پھر اسے بے روزگاری کی وجہ سے بھی چڑچڑاہٹ ہوتی رہتی تھی جب سے اس کا ایم بی اے پورا ہوا تھا وہ جاب کی تلاش میں تھا گھر کا خرچہ گھر کے کرائے سے ہوتا تھا، ان کا گھر بھی ڈبل اسٹوری تھا دو پورشن کرائے پر دیئے تھے خود گراؤنڈ فلور پر رہتے تھے وہ تو ابونے ان کے رہنے کا ٹھکانہ کر دیا تھا ورنہ آج کے دور میں دو کمروں کا مکان لینا ہی بہت مشکل تھا، محمد عثمان صاحب کا پندرہ سال پہلے انتقال ہو گیا تھا ان دنوں حنین اسکول میں تھا، حسن اور حراتو اس وقت بہت ہی چھوٹے تھے حنین نے امی کو اپنے دونوں بہن، بھائی کو خود ہی سنبھالا تھا پھر گھر چلانے کے لیے اوپر کے دو پورشن بھی کرائے پر دیے۔ حنین اپنی جاب تلاش کرنے میں لگا ہوا تھا کئی جگہ اپلائی کر چکا تھا ابھی تک اسے معقول جاب نہیں مل رہی تھی۔

”بیٹا! بری بات ہے ہمیں کونسا تکلیف دے رہے ہیں الٹا میرا ہاتھ ہی بٹا کے چلی جاتی ہے۔“ انہوں نے اسے سمجھایا۔

”اچھا یہ بتاؤ ہوا کوئی کام۔“

”پتہ نہیں امی قسمت میں کیا لکھا ہے۔“ وہ برآمدے میں پڑی ڈائنگ ٹیبل کی چیمبر کھسکا کے بیٹھ گیا۔

”اللہ اچھا کرنے والا ہے تھوڑی آزمائش ہے ختم ہو جائے گی۔“ انہوں نے اسے تسلی دی۔

”آئی آپ کا داپر لے لوں۔“ وہ بوتل کے جن کی طرح ہی نمودار ہوئی تھی۔

حنین نے ناگواری سے منہ بنایا تھا۔ اریکہ نے اس کے بگڑے تیور دیکھ لیے تھے۔ کاسنی کاشن کے پرنڈ



کپڑوں میں وہ اپنے دراز بالوں کی چوٹی بنائے معصوم سی لگ رہی تھی۔  
 ”سنو! آج آخری دفعہ کہہ رہا ہوں اگر روز تمہاری صفائی نصف ایمان نظر آئی تو میں یہاں سے روانہ  
 کر دوں گا۔“ بے مروت اور بد لحاظ بنا بول رہا تھا۔  
 ”آئی ایسا ہم نے کیا کر دیا میں تو نیچے کی بھی کر کے جاتی ہوں صفائی۔“ وہ جھٹ بولی۔  
 ”آئندہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”جاؤ بیٹا لووا پیر تم اپنا کام کرو اس کی باتوں کو دل پر نہیں لو۔“ انہوں نے مداخلت کر کے بات کو ختم کیا۔  
 اریکہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا حنین ہر وقت اسے دیکھ کر انگارے ہی چباتا رہتا تھا اسے بہت دکھ ہوتا تھا آٹھ  
 سال سے وہ ان کے گھر کرائے پر تھے حنین کی امی ان سب سے بہت اچھے انداز میں ملتی تھیں مگر حنین کا مزاج کچھ  
 ترش اور روکھا تھا جب کے حسن اور حرافرینڈلی تھے اس کی ان کے ساتھ اچھی بنتی تھی۔  
 ”انسان کو اتنا بھی غرور نہیں کرنا چاہیے، اگر ہم آپ کے گھر میں کرائے پر رہ رہے ہیں تو آپ بے عزتی  
 کرتے رہیں گے۔“ اریکہ نے موقع دیکھ کر اسے سنانے سے گریز نہیں کیا۔

انیسہ بیگم لگتا تھا اندر تھیں وہ بیٹھا کسی نیوز پیپر کو پڑھ رہا تھا ایک دم اس کی آواز پر چونک گیا۔  
 ”آپ کو ہر وقت مجھ پر غصہ پتہ نہیں کیوں رہتا ہے۔“

”تمہاری حرکتوں پر رہتا ہے یہ کیا آئے دن پانی بہا کے صفائیاں کرتی رہتی ہو۔“ وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں ہو رہا تھا۔  
 ”ہم اپنے پورشن کی صفائی کرتے ہیں اگر پانی نیچے آ جاتا ہے تو ہمارا قصور نہیں آپ کے فرش کا قصور ہے اگر  
 ڈھلان نیچے ہے تو پانی نیچے ہی آئے گا فلور ٹھیک کر دیاں یہ پانی نیچے نہیں آئے گا۔“ وہ اسے جتانے لگی۔

”اگر آپ کو پراہم ہے تو تم لوگ یہ گھر چھوڑ دو۔“ وہ دیتا تو بالکل نہیں تھا۔  
 ”آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے ہم یہ گھر نہیں چھوڑیں گے کر لو جو کرنا ہے۔“ وہ تن فن کرتی ہوئی اوپر  
 بیڑھیاں چڑھ گئی۔

حنین نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔  
 ”جو توں سمیت آنکھوں میں کھسی جاتی ہے۔“ وہ بڑ بڑایا، وہ بھی سر کو جھٹکتا ہوا اپنے روم میں چلا گیا۔ وہ اریکہ  
 کی ہر لمحہ بے عزتی ہی کرتا تھا۔

”سمجھتا کیا ہے خود کو ہر وقت دماغ گرم ہی رہتا ہے۔ جنگلی اجڈ۔“ وہ خوب اسے برا بھلا کہہ رہی تھی دماغ میں  
 آگ لگی ہوئی تھی دل کر رہا تھا اوپر سے کچھاٹھا کے اس کے سر پردے مارے مگر اس نے اپنے غصے پر قابو پایا ہوا تھا۔  
 ”اریکہ بیٹا رونی پکالی ہو تو اپنے ابو کو کھانا دے دو وہ نماز پڑھنے جائیں گے۔“ امی کی آواز پر وہ سنبھل گئی۔  
 صبح سے گھر کی صفائی میں لگی ہوئی تھی رات کے کھانے میں بھی دیر ہو گئی تھی۔

”امی! ابھی پانچ منٹ لگیں گے میں دال میں بگھار لگا دوں۔“ وہ جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔  
 ”آرام سے بھی ہاتھ جلا تو تمہارے کام بھی آندھی طوفان کی طرح ہوتے ہیں۔“  
 ”امی آپ تو ڈانٹتی رہتی ہیں۔“

”ڈانٹ نہیں رہی ایک بات بول رہی ہوں۔“ انہوں نے جگ میں پانی بھرا اور گلاس لے کے چلی گئی تھیں  
 اریکہ نے جلدی جلدی رونی بنائی اور کھانا بھی لگا دیا ابو عشاء کی نماز سے پہلے کھانا کھا لیتے تھے تا کے پھر ہضم  
 ہو جائے۔



اس نے ثمرہ سے برتن دھو کے کچن صاف کرنے کو کہا آج تو صفائی اور پھر حنین سے منہ ماری کی وجہ سے سر دکھ رہا تھا۔

”ذلیل انسان کو کسی کی عزت کا ذرا خیال نہیں ہوتا کھڑوس کہیں کا۔“ بستر پر لیٹ کے بھی وہ سب اس کے ذہن سے نہیں ہٹ رہا تھا۔ جانے کیوں وہ اسے سوچتی رہتی تھی جب کے وہ اسے سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی کوشش کرتی تھی اس کا سامنا نہیں ہو۔“

☆.....☆

شکیل احمد دو ہفتے بعد آئے تھے۔ نیل فران کے سامنے پانس خاموش بیٹھی تھی۔

”بیٹا! کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیا کرو۔“

”مجھے کس چیز کی ضرورت ہوگی ہر چیز تو موجود ہوتی ہے اور چیزوں کا مجھے کرنا بھی کیا ہے۔“ لہجے میں محرومی افسردگی تھی۔

شکیل احمد پہلو بدل کے رہ گئے۔ وہ اتنی کم گو اور سادہ تھی وہ حیران ہوئے تھے ان کے خود کے گھر میں ہی بھائی کی بیٹیاں کیسے رونق لگائے رکھتی تھیں۔ کپڑوں کا فیشن کا کتنا شوق تھا اور ایک یہ ان کی بیٹی اسے کسی بات کا شوق ہی نہیں تھا۔

”کیوں لڑکیاں تو بہت سے شوق رکھتی ہیں کپڑوں جوتوں پرس کا۔“ وہ نیل فر کے چہرے کو دیکھنے لگے جو حد سے زیادہ سنجیدہ ہی ہوتا تھا۔

”وہ لڑکیاں بھی اور ہوتی ہیں مجھے جانا بھی کہاں ہوتا ہے گھر پر ہی تو ہوتی ہوں۔“ اس نے وضاحت دی۔

”تم فکر نہیں کرو میں تمہیں جلد گھر لے جاؤں گا اس کے لیے مجھے ذرا گھر کا ماحول ٹھیک کرنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے تمہاری جبرسن کے شاک بھی لگے۔“ وہ اس سے کہتے ہوئے نگاہ بھی چرا رہے تھے۔

”آپ سے میں کہہ بھی نہیں رہی کہ آپ مجھے گھر لے جائیں۔ میں یہاں ہی خالہ اور شہوار کے ساتھ خوش ہوں۔“

”نہیں بیٹا میں تمہیں اپنے پاس رکھوں گا بس تمہارے ابو کو کچھ وقت چاہیے۔“

”آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں میں آپ سے کہہ بھی کب رہی ہوں آپ مجھے لے کے جائیں۔“ زبیدہ خالہ ان کے لیے چائے اور لوازمات لے آئی تھیں۔ شکیل احمد خاموش ہو گئے تھے نیل فر نے ٹرے لے کے سینٹرل میل پر رکھ دی۔

”ارے آپ نے خواخواہ تکلیف کی یہ سب نہیں کیا کریں۔“

”ارے بھیا اتنے دن بعد آئے ہوا اتنا تو کر سکتے ہیں اور کون سا ہمارا خرچ ہوتا ہے آپ ہی دیتے ہوتاں۔“

”ایسی بات نہیں کریں آپ سب میرے ہیں۔ اپنوں پر خرچ کر کے جتایا نہیں جاتا۔“ وہ الٹا شرمندہ ہوئے۔

شکیل احمد نے ایک فلیٹ لے کے دیا ہوا تھا جہاں رانی کو رکھا ہوا تھا فرزند فلیٹ تھا ہر سہولت تھی۔

نیل فر نے چائے بنا کے ان کے آگے رکھی زبیدہ تو چلی گئی تھیں۔

”بیٹا! آج کل ضیاء نے بزنس اور آفس سنبھالا ہوا ہے میں خاصا مصروف تھا کچھ فرصت ملی تو چلا آیا۔“

”میں نے آپ سے کچھ کہا آپ کا جب دل چاہے آجایا کریں۔“ وہ انہیں شرمندہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

”اچھا یہ پیسے رکھو تمہیں اور شہوار کو جو ضرورت ہو مارکیٹ چلی جانا گاڑی میں بھیج دوں گا ٹیکسی رکشہ میں



جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ابو! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“ وہ پیسے لینے سے ہچکچا رہی تھی۔  
”چپ کر کے رکھ لو ہو سکتا ہے شہوار کو ضرورت ہو اچھا ہے چلی جاؤ گی تو اس کی بھی شاپنگ ہو جائے گی۔“  
شکیل احمد نے خاصی کثیر رقم اس کی مٹھی میں دبائی۔  
”ابو! رہنے دیں۔“

”چپ کرو۔“ انہوں نے پیار بھری ڈانٹ پلائی۔  
شکیل احمد چند گھنٹے گزار کے چلے گئے تھے اور اسے پھر بھی نیا انتظار دے گئے تھے۔  
”انکل کے جانے کے بعد کم اور زیادہ اس ہو جاتی ہو۔“ شہوار نے اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھا۔  
”کیا کروں میں پھر۔“ اس نے اس کی جانب دیکھا۔  
”کبھی ہنس بھی لیا کرو۔“

”بلا وجہ ہنسنے والوں کو لوگ پاگل کہا کرتے ہیں۔“ اس نے شہوار کے سر پر ہاتھ مارا۔  
”تم ویسے بھی مجھے پاگل ہی لگتی ہو۔“  
”اچھا!“ اس نے تکیہ اٹھا کے شہوار کے سر پر دے مارا۔  
دونوں کا مشترکہ کمر اٹھا اور خاصا آراستہ بھی تھا خوب صورت بیڈ اور نفیس پردے پڑے تھے۔ ایک سے ایک قیمتی سامان تھا۔

”سنو شہوار! کل شاپنگ پر چلیں گے ابو گاڑی بھیج دیں گے۔“  
”کل یونیورسٹی نہیں جاؤ گی؟“ وہ پوچھنے لگی۔  
”نہیں کل کی تم بھی یونیورسٹی کی چھٹی کر لو تو میرا تو ویسے بھی پہلے ہی موڈ نہیں ہے۔“  
”نیل فردیکہ لو تم ہی زیادہ چھٹیاں کر رہی ہو۔“ لاسٹ ایر ہے۔“ وہ اسے بتانے لگی۔  
”ہونے دو میرا دل نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے پھر میں بھی کر لیتی ہوں لیکن اسائنمنٹ دینا تھا۔“  
”اچھا ٹھیک ہے تم چلی جانا میرا بھی اسائنمنٹ لے جانا تمہارے آنے کے بعد چلیں گے۔“ وہ خود پھر بولی۔

☆.....☆

اس کی واپسی حیدرآباد سے ہو گئی تھی اس نے سوچا گھر میں کنول بھی ہوگی کچھ تو گھر لے کے جائے اس لیے گاڑی اس نے شاپنگ سینٹر کے آگے روک دی۔ کنول اور امی کے لیے سوٹ لینے کا ارادہ کیا کنول کا موڈ بھی تو ٹھیک کرنا تھا۔

وہ دکانوں سے دیکھ کر گزرتا جا رہا تھا مگر اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کبھی لیڈز شاپنگ کی بھی تو نہیں تھی۔  
مسٹر ڈپینٹ پر بلیو شرٹ میں وہ ڈسینٹ سا کھڑا چوائس ہی کر رہا تھا۔  
اسی وقت حواس باختہ نیل فراس کے شانے سے ٹکرائی تھی۔  
”کیا وحشت ہے۔“ وہ مڑا تھا۔

لائٹ انگوری پرنٹڈ کپڑوں میں ملبوس وہ ہر نی جیسی آنکھوں والی جانے کسے دیکھ کے بھاگ رہی تھی۔  
”سوسوری۔“ وہ گرتے گرتے پچی تھی۔



”محترمہ ہوا کیا ہے؟“ فہر کے ہاتھ میں شاپر تھے وہ گر گئے تھے۔ وہ پہلے جھک کے اٹھائے۔  
 ”جی کچھ نہیں۔“ وہ آگے بڑھنے لگی تھی۔

فہر نے کاندھے اچکائے وہ پھر دکان کے اندر گھس گیا۔ پانچ چھ سوٹ لیے اور دیگر مختلف شاپنگ بھی کی اور  
 باہر آ گیا۔ دیکھا تو وہ پری پیکر گھبرائی پریشان کھڑی جانے کے تلاش کر رہی تھی۔

”محترمہ! خیریت تو ہے آپ کی کیا چوری ہو گئی ہے۔“

”جی..... جی نہیں۔“ وہ آنکھوں میں ناگواری لا کے اسے دیکھنے لگی۔

نیل فر کسی دکان پر ڈریس دیکھنے لگی تھی۔ شہوار جانے کہاں نکل گئی تھی اور وہ اسے ہی ڈھونڈ رہی تھی۔

فہر کو جانے کیوں وہ پریشان گھبرائی ہر نی لگ رہی تھی۔ بناوٹ و تصنع سے اس کا چہرہ پاک تھا۔

”تھینک گاڈ! تم مل گئیں کہاں تھیں؟“ شہوار اسے دیکھ کر لپٹ گئی۔

فہر دو قدم پیچھے ہو گیا۔

”کہاں نکل گئی تھیں۔“ نیل فر نے غصے سے پوچھا۔

”ارے وہ میری کلاس فیلور وحینہ نظر آ گئی تھی۔ اس سے بات کرنے کے لیے رک گئی تھی۔“

”آپ کی تعریف؟“ شہوار نے ہنڈسم سے فہر کو مخاطب کر لیا جو ابھی تک وہیں تھا۔

”یہ پریشان کھڑی تھیں میں تو پوچھ رہا تھا ان سے خیریت تو ہے۔“

”ہاں اسی بہانے بات کر لیتے پھر گھر کا ایڈریس پوچھ لیتے آپ مردوں کو میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔“

شہوار اس پر چڑھ دوڑی۔

نیل فر نے اس کے بازو پر دباؤ ڈال کے روکا۔ ”سنیے خاتون! میں ایسا فضول آدمی نہیں ہوں جو لڑکیوں کے

پیچھے بھاگوں یہ مجھ سے ٹکرائی تھیں میں سمجھا ان کے کوئی پیچھے لگ گیا ہے انسانیت کے ناطے پوچھنے لگا۔“ فہر کو

ایک دم ہی غصہ آنے لگا۔

وہ شاپنگ سینٹر کی راہداری میں کھڑے تھے۔ لوگوں کی استفہامیہ اور تنقیدی نگاہوں نے تینوں کو ہی پزل

کر دیا تھا۔

”اچھا یہ اس نے کہا تھا کہ کوئی پیچھے لگ گیا ہے۔“

”شہوار کیا ہو گیا ہے؟“ نیل نے اسے ٹوکا۔

”نیل فر تو نہیں جانتی ان لڑکوں کو موقع چاہیے۔“

”خاتون مجھے معاف کریں میری توبہ، بائے۔“ فہر نے اپنا سر پیٹ لیا وہ کیوں مخاطب ہوا اس بلا سے۔

”سوری!“ نیل فر نے ہی معافی مانگی۔

وہ اونہہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ عجیب بد مزہ ہو گیا تھا۔

”لڑکیوں کی زبان کیسی پیچی کی طرح چلتی ہے۔“ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”فہر صرف وہ لڑکی یہ لڑکی نہیں ہر نی جیسی آنکھوں والی۔“ اندر سے کوئی بولا۔

اس نے گاڑی کو ٹرن کیا تو وہ دونوں بھی گاڑی میں نظر آئیں۔

”یہ گاڑی اور ڈرائیور تو ماموں جان کا ہے۔“ فہر چونک گیا۔

ان دونوں کی گاڑی آگے بڑھ گئی تھی مگر اس کا دماغ تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا پورے راستے وہ اس لڑکی کو



سو چتر ہا جو اس سے ٹکرائی تھی۔

”نیل فرنا م کیسا انوکھا سا لگ رہا تھا۔“

”لو جی ہیرو کی واپسی ہو گئی ہے۔“ مہاد نے اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر ہانک لگائی۔

کنول ابھی موجود تھیں اسے دیکھ کر ناراضی دکھانے لگیں۔

”آگیا میرا بچہ۔“ زہرہ نے تو اس کا ماتھا چوم لیا۔

فہر نے سلام و دعا کے بعد کہا۔

”امی جلدی سے کھانا لگوادیں بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ اس نے سارے شاپرز کنول کے قدموں میں ڈال دیئے۔

”یہ کیا ہے؟“ سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”دیکھ لیں آپ کے اور امی کے لیے لایا ہوں۔“

”حیرت ہے۔“ کنول شاپرزا اٹھائے چیزیں نکالنے لگیں مگر یہ کیا اس میں سے تین چار بیگز سینڈل کے ڈبے

اور دیگر جیولری بھی نکلی۔

”یہ سب تم امی اور میرے لیے لائے ہو۔ کنول حیران ہو رہی تھیں۔

ان سے زیادہ حیران فہر ہو رہا تھا اس کے بھی تو شاپر تھے۔

”یہ بھی تو کھولیں۔“ اس نے دوسرا بڑا شاپر اٹھایا اس میں اس کا خریدا ہوا سامان تھا۔

”یہ آپ کے اور امی کے لیے چند سوٹ ہیں۔“

”اور یہ کس کے لیے ہیں۔“ کنول کو تو اس کے پیچھے لگنے کا موقع چاہیے۔

”یار! پتا نہیں کس کا آگیا۔“ فہر بوکھلا بھی گیا تھا مگر اسے سب سمجھ آگیا تھا اس نے اس لڑکی کے بھی شاپرزا اٹھا

لیے تھے جو اس سے ٹکرائی تھی اس کے اور فہر کے شاپرز بھی گرے تھے۔

”اچھا تب ہی وہ بار بار مجھے دیکھ رہی تھی۔“ وہ سر پکڑ کے رہ گیا۔

”امی، امی دیکھیں اس نے ضرور کر رکھی ہے شادی۔“

”یار! آپی خدا کو مانیں وہاں دکان میں اور لوگ بھی تھے ہو سکتا ہے بے دھیانی میں، میں نے یہ شاپرزا اٹھا لیے

ہوں۔“ وہ صفائی دینے لگا۔

”ویسے بھائی وہ دیکھنے میں کیسی تھی۔“ مہاد کو بھی اسے چھیڑنے اور تنگ کرنے کا موقع مل گیا۔

”یار! تم بھی شروع ہو گئے۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ زہرہ تو ہنس رہی تھیں۔

”امی! میرا یقین کر س یہ غلطی سے آگئے ہیں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”کنول ہو سکتا ہے غلطی سے آگئے ہوں۔“

”ارے ہاں یاد آیا ماموں جان کا ڈرائیور ان لڑکیوں کو لے کے جا رہا تھا۔ یہ سامان اس کے ذریعے ہی جاسکتا

ہے۔“ فہر کے دماغ میں خیال آیا مگر اس نے ان لوگوں کے سامنے کہنے سے گریز کیا۔

”ہمیں بے وقوف سمجھتے ہو۔“

”آپی یار کیا ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ جلدی ہی اکتا گیا ایک تو دو ڈھائی گھنٹے کی ڈرائیونگ سے وہ

تھک گیا تھا یہاں تو الٹی آنتیں گلے پڑ گئی تھیں۔

کھانا کھا کے وہ اپنے بیڈروم میں آگیا تھا۔



اس پری پیکر کا خیال بار بار آ رہا تھا۔“  
 ”نیل فر۔“ اندر بازگشت ہوئے جا رہی تھی۔  
 ”پورا وقت وہ نہیں بولی اور اس کے ساتھ والی کی زبان چلے جا رہی تھی۔  
 نہادھو کے وہ لیٹ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی آنکھ بھی لگ گئی۔  
 شام میں سو کے اٹھا تھا اس کی طبیعت اور مزاج فریش تھا کنول اور بچے نظر نہیں آ رہے تھے۔  
 ”امی! آلی کہاں ہیں؟“

”چلی گئی شعیب کی کال آ گئی تھی۔ انہیں کہیں جانا تھا اس لیے چلی گئی۔“  
 ”ناراض ہو کے گئی ہیں۔“ بہن کی فکر بھی ہوئی تھی۔  
 ”نہیں تو اور ہاں وہ تمہارے لائے ہوئے سوٹ لے گئی ہے اگر ناراض ہوتی تو چھوڑ کے جاتی۔“ مسکرا کے بولیں۔  
 فہر نے ہال کمرے میں بیٹھ کے وہاں کائی وی آن کر لیا تھا۔ کافی دنوں سے نی وی بھی نہیں دیکھا تھا۔  
 ”میں تمہارے ابو کے لیے چائے بنا رہی ہوں۔“  
 ”جی۔“ اس نے اسکرین پر نگاہ جمائے کہا۔  
 فہر کا ذہن دل تو اس پری پیکر میں الجھا ہوا تھا۔

☆.....☆

”اے لڑکی کبھی ناگوں کو بھی آرام دے لیا کر۔“ دادی جان نے اسے اوپر جاتے دیکھا۔  
 ”دادی جان! میں تو شہزیل کو بلانے جا رہی تھی۔“ اس نے کہا۔  
 ”ہر وقت اسے تنگ نہیں کیا کر سنجیدہ بچہ ہے کبھی اسے بھی آرام کرنے دیا کر۔“ رحمت بی بی کو اس کی بڑی فکر ہوتی تھی۔  
 ”ہاں سنجیدہ بچہ ہے میں تو جیسے کٹ کھنی ہوں۔“ وہ برامان کے ان کے پاس ہی آ کے بیٹھ گئی۔  
 ”کتنی زبان چلتی ہے۔“ وہ تاسف سے گویا ہوئیں۔  
 ”کس کی زبان چلتی ہے؟“ منیب احمد نے پوچھا۔ ماما انہیں دیکھ کر سنہل گئی۔  
 ”بابا! میں تو اس شہزیل کو اپنی فرینڈ کے ہاں لے جا رہی تھی۔ وہ دیکھیں اوپر بھاگ لیا۔“ وہ غصے سے بول رہی تھی۔

”بیٹا! ہر کام کے لیے اسے نہیں بولا کر داتنے کاموں میں بڑی رہتا ہے۔“  
 ”سب اسی کی سائیڈ لیتے ہیں۔“

”دیکھا منیب بڑے چھوٹے کی بھی اس لڑکی کو تمیز نہیں اس سے کیسے بات کرتی ہے بڑا ہے بھائی کہہ لیا کرے۔“

”بس رہنے دیں دادی جان۔“ وہ تو کلس گئی۔ شہزیل کو بھائی بولے کبھی نہیں اس نے بچپن سے ہی اس کا نام لیا تھا اور اب بھائی لگانے کا سوال ہی نہیں۔

”تمہیں اگر اپنی فرینڈ کے جانا ہے تو ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ۔“  
 ”ٹھیک ہے بابا ٹھیک ہے میں تو سوتیلی ہوں آپ کی۔“ وہ بچوں کی طرح روٹھ کے چلی گئی۔

(جاری ہے)



عائشہ الیاس

مکمل ناول

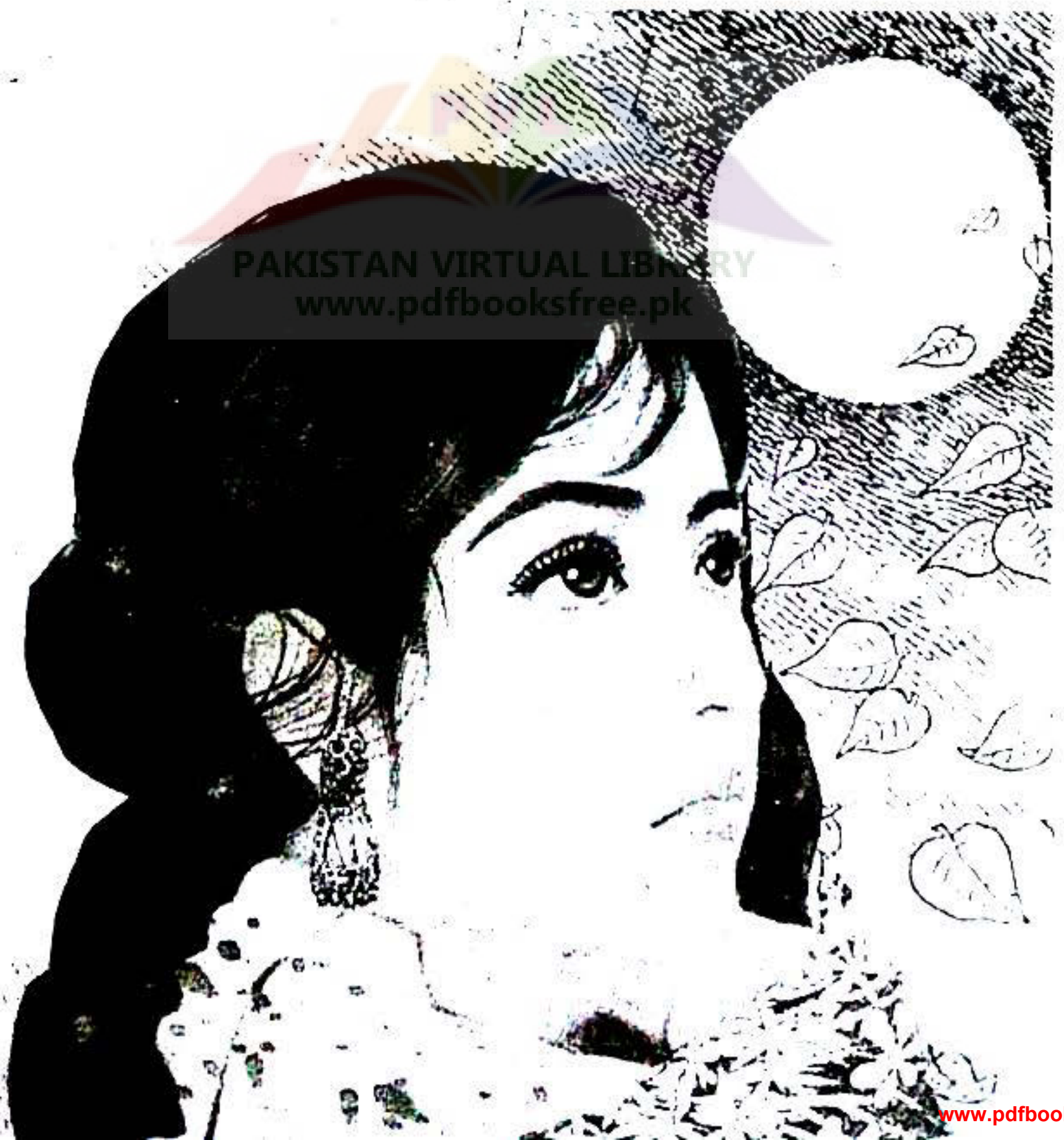
# پابلیکیشن

تیز میوزک کی آواز کانوں کے پردے پھاڑنے کے برابر تھی، تیز میوزک کسی سرور کی طرح سب پر طاری تھا، گہرے اندھیرے میں ڈسکولائٹس جگمگ کر رہی تھیں، نشے میں چور سب ناچنے میں یوں مست تھے کہ





لگتا تھا وہ کسی تقلید میں ہیں، رات کے آدھے پہر میں وہ سب دنیا وہ مافیا سے بے خبر مست و مدہوش ہو چکے تھے۔ وہ ارد گرد سے بے خبر دونوں بالکل ایک کونے میں دیوار سے جیسے چمٹے ہوئے تھے۔ وہ مکمل طور پر اس کے حصار میں تھی۔ اس کا چہرہ صنف مخالف کے اتنے قریب تھا کہ وہ اس کی سانسوں کو محسوس کر سکتا تھا۔ گرم سانس اور شوریدہ دھڑکنیں اس کے احساسات کا اظہار کر رہی تھیں۔ اس نے بڑی نرمی سے اس کے نازک چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر کر اپنے چہرے کے قریب کر لیا تھا اس کی سحر انگیز قربت میں اس کا وجود بکھرنے لگا، اس کی سنہری آنکھوں میں اتنی پیش تھی کہ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنا آپ مکمل طور پر اس کے حوالے کر دیا۔ وہ مکمل طور پر اس کے اوپر جھکا ہوا تھا اور بغور اس کے چہرے کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی عکس ڈھونڈ رہا ہو، پروہاں کوئی عکس نہیں تھا۔ نہ کوئی شبیہ وہ بس ایک خوب صورت مورتی معلوم ہوتی تھی جو اس کی قربت میں پکھل رہی تھی کوئی دھند تھی جسے دیکھ کر اس کی آنکھ برف سی ہو گئی تھی۔ وہ پتھر کا سا بن گیا، اک سایہ سادماغ کے پردے پر لہرایا تھا، اس کے پاس دنیا کے اس وقت سب رنگ موجود تھے۔





پر اس کا وجود سیاہ بنے لگا۔ اس پر وہی مخصوص کیفیت طاری ہونے لگی تھی جس سے وہ ہر سو بھاگتا تھا، اس کا پورا وجود مختل ہو گیا۔ بے چینی اضطرابی ایک بار پھر غالب آگئی تھی۔ دل یکدم سوختہ ہو گیا۔ ایک عجیب ایسی طاقت تھی جو پوری طرح اسے اپنے قابو میں کر چکی تھی۔ جسم اتنی ٹھنڈک میں بھی پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ دھڑکنوں کی آواز اتنی بے ہنگم تھی کہ وہ ارد گرد کے شور سے غافل ہو گیا۔ اس نے برق رفتاری سے اسے خود سے الگ کیا تھا، جیسے اسے کوئی چھوت کا مرض لاحق ہو۔ اس کی روح کو کسی نے اندر تک جھنجھوڑ ڈالا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ اس کے یوں دھتکارنے پر حیرت سے دیکھا تھا جو اسے عجیب نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی سنہری آنکھیں شدت سے سرخ ہو گئیں تھیں۔ وہ ایک پل کے لیے گھبرا سی گئی۔

”ٹیٹ.....“ اس نے خوف سے لبریز لہجے میں اسے پکارا اس سے پہلے کہ وہ اس کی جانب بڑھتی وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا اور وہ حق دق سی اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

☆.....☆

وہ گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ ایک گہری سانس کے ساتھ اس نے اپنی بے ہنگم دھڑکنوں کو درست کرنے کی یا کام کوشش کی تھی اور پھر ہار کر اس نے آنکھیں بند کر کے سیٹ سے سر کو ٹکا دیا، تناؤ کی کیفیت اتنی شدید تھی کہ اس کے اعصاب پر مزید دباؤ پڑھتا جا رہا تھا۔ بند آنکھوں کے پردے پر ایک عکس لہرایا تھا حزیں ملاحظت زدہ آنکھیں جس کے لب جنبش کر رہے تھے، پھول کی ایک ایک پتی توڑ کر وہ اپنی جھولی میں ڈالتے ہوئے اسے ہی دیکھتے ہوئے مخاطب تھی۔

”میرے خیال میں تو ہر انسان کی زندگی میں ایک موڑ ایسا ضرور آتا ہے جس کے دور استے نکلتے ہیں ایک صحیح اور ایک غلط اور ہمیں دونوں میں سے لازمی طور پر ایک چننا پڑتا ہے، پر اس وقت ہم ایسے حال میں ہوتے ہیں جب ہماری تمام صلاحیتیں دم توڑنے لگتی ہیں اور ہم اس قابل نہیں رہتے کہ ہم فیصلہ لے سکیں، بظاہر دیکھنے میں یہ صحیح اور غلط راستے ایک ہی جیسے لگتے ہیں پر یہی ہماری آنکھوں کا سب سے بڑا دھوکا ہوتا ہے، پھر ہمارا اصل امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ خدا بھی یہ فیصلہ ہم پر چھوڑ دیتا ہے۔ ہمارا ایک غلط فیصلہ ہمیں سمندر کی آوارہ لہروں کی طرح لے جاتا ہوا ڈبو دیتا ہے اور اگر ہم صحیح فیصلہ لے لیں تو پھر ہمیں اپنے لیے کسی بھی چیز کے لیے تردد نہیں کرنا پڑتا، کیونکہ اس کی ہر راہ ہمیں خدا ہی دکھاتا ہے، پر زندگی کا اگر کوئی مشکل مرحلہ ہوتا ہے تو یہ راستہ چننے کے لیے ہی ہوتا ہے جس میں ناکام اور کامیاب ہماری نہیں کرداتی ہیں۔“ وہ چپ ہو گئی اور اس کی گہری نگاہیں اسی کے چہرے پر مرکوز تھیں اور آگے سے وہ تہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

”تمہیں اتنا وقت مل جاتا ہے ایسی خشک باتیں سوچنے کا اور آج کے دور میں کون ایسی باتیں سوچتا ہے۔ یہ بزرگوں کا کام ہے انہیں سوچنے دو۔“ اس نے لا پرواہی سے اس کی جھولی میں سے پتیوں کو مٹھی میں بھر کر اٹھایا تھا اور بارش کی طرح اس پر برساتے ہوئے بولا تھا۔ آگے سے وہ پھیکا سا مسکرا دی تھی، جیسے اس نے بھی اس کی بات کو کسی خاطر میں نہ لیا تھا۔ عکس دھندلا گیا وہ بند آنکھوں کے پیچھے بھی اس عکس کے پیچھے بھاگنے لگا تھا، برف بننے عکس سے اس پر جیسے ہذیبانی کیفیت طاری ہو گئی، اس کی آنکھوں کی پتلیاں بند آنکھوں میں بھی ایسی تیزی سے حرکت کرنے لگیں کہ وہ جیسے اسے ڈھونڈ لیں گی پر کوشش ناکام تھی۔ ناکامی کے سبب سینے میں جیسے دھواں اٹھنے لگا۔ کنپٹیوں سے پسینے کے قطرے بہنے لگے جب کہ منہ اور گردن عرق آلود ہو گئی، اضطرابی اتنی بڑھنے لگی کہ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول لیں، سیویم تیزی سے کلب سے باہر آ رہی تھی۔ اس کا موڑ

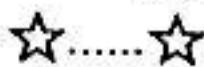


سخت آف ہو چکا تھا۔ آج جو اس کے ساتھ کیا گیا تھا اگر اس کی جگہ کوئی اور اتنی تذلیل کرتا، تو اس نے حشر نشر کر دینا تھا اس کا۔ پر یہاں وہ تھا جس کی کینروہ خود بن گئی تھی اس کی دل کی سلطنت کا وہی بادشاہ بن بیٹھا تھا۔ اس کی یہ حالت اس سے مخفی نہ تھی۔ یہاں لانے کا مقصد بھی تو یہی تھا۔ کسی طرح وہ اس خول سے باہر نکل جائے، پر سب بے سود تھا۔ گاڑی کا جب اس نے دروازہ کھولا تو سامنے اس کی حالت دیکھ کر اس کی ناراضی اڑن چھو ہو گئی تھی وہ فکر مندی اس کی جانب بڑھی۔

”آریو او کے ٹیٹ؟“ اس کی عرق آلود پیشانی پر اس نے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔  
 ”ٹھیک ہوں میں۔“ اس نے ہاتھ پیچھے ہٹایا تھا اس کا اس نے لب بھینچ لیے تھے ضبط کرتے ہوئے۔  
 ”اگر تم ٹھیک نہیں ہو تو ڈرائیو میں کر لیتی ہوں۔“ اسے گاڑی اسٹارٹ کرتا دیکھ کر وہ بولی۔  
 ”نہیں میں کر لوں گا۔“ وہ سفاک سا بولا کہ وہ چپ ہو گئی۔ ایک گہری خاموشی دونوں کے بیچ اتر آئی۔ وہ چپ چاپ بیٹھ گئی اور رخ باہر ونڈو کی جانب کر لیا تھا جس ویک اینڈ کو وہ آج خوب صورت بنانا چاہتی تھی اس کا اختتام کچھ یوں ہو گیا تھا۔ اسے گھر ڈراپ کرتے ہوئے بھی وہ کچھ نہ بولا تھا۔ نہ کوئی معافی نہ افسوس سیاٹ سا گاڑی کو ہوا کے زوروں پر اس کے پاس سے لے جاڑا تھا۔ وہ غصے میں لبوں کو پیچتی ہوئی اندر چلی گئی تھی۔



اس وقت وہ میل بورن کی کونیز فوڈ اسٹریٹ کے ایک لوکل ایریا میں بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ جس جگہ وہ بیٹھا تھا وہاں روڈ کے دو اطراف میں ریسٹورنٹ بنے ہوئے تھے۔ کئی ریسٹورنٹ والوں نے ریسٹورنٹ کے باہر کرسیاں اور ٹیبل لگا کر بیٹھنے کا انتظام کیا تھا۔ اس اسٹریٹ میں لوگوں کا کافی رش ہوتا تھا۔ چونکہ لنچ ٹائم تھا تو رش اور بھی زیادہ تھا۔ موسم کے خوشگوار ہونے کی وجہ سے لوگوں کا ہجوم باہر کی ٹیبلز کی طرف تھا۔ وہ خود بھی باہر ہی بیٹھا تھا۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نہ اس نے صبح کا ناشتا کیا تھا اور نہ ہی ابھی بھوک کے کوئی آثار تھے۔ رات بھر سے جاگ رہا تھا اور اب پورا جسم درد کر رہا تھا۔ گھر اور آفس دونوں جگہ پر اس کا دم گھٹتا تھا۔ لہذا سب سے دور وہ یہاں آ بیٹھا۔ کافی کے سب لیتے ہوئے اس کا دماغ کل رات والی کیفیت میں الجھا ہوا تھا۔ رات سے اب اسے خوف آنے لگا تھا۔ اس کی یہ کیفیت رات میں زیادہ عروج اختیار کرتی تھی۔ اندھیری رات کا اندھیرا اسے اپنے اندر بھسم کر لیتا تھا۔ کیا تھا اس کا علاج؟ سوال یہ ہی سب سے مشکل تھا۔ اس کی طبیعت میں دن بہ دن جڑ جڑا ہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسی جڑ جڑا ہٹ کے سبب آج اس نے فیکٹری کے ورکرز کو بلا وجہ ذلیل کر ڈالا تھا۔ بلا وجہ ان کے کام میں نقص نکال کر ان کی جان عذاب بنادی تھی۔ ساتھ خود کو بھی مزید پریشان کر ڈالا تھا۔ اپنی اس کیفیت میں اسے اکیلا رہنا پسند تھا اور آج اس کا ارادہ بھی یہی تھا۔ ابھی اس نے سوچا ہی تھا کہ سیویم کی کال آنا شروع ہو گئی۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی ریسپونڈ کرنا پڑی تھی۔ ایک واحد وہ تھی جس کے اس کے اوپر بے پناہ احسانات تھے۔



”کہاں ہو تم پورا آفس چھان مارا ہے میں نے۔“ کال ریسپونڈ ہوتے ہی چھوٹے ہی اس نے سوال داغا،  
 پر اس کے چہرے پر کوئی تاثر نمودار نہ ہوا۔  
 ”کونیز اسٹریٹ پر ہوں۔“



”واہ! میرے بغیر تم کیسے چلے گئے شیٹ! اور میں کب سے لنچ کے لیے تمہارا ویٹ کر رہی ہوں۔“ وہ ایک ہی سانس میں بولی جواب میں وہ کچھ نہ بولا۔ اس وقت اس کا کوئی موڈ نہ تھا وہ اسے سن رہا تھا یہی بہت بڑی بات تھی۔

”اچھا لنچ کر لیا تم نے؟“ ہار کر بات اس نے خود ہی بڑھائی۔

”نہیں۔“ وہ مختصر بولا۔

”پھر ٹھیک ہے میں آرہی ہوں، دونوں ساتھ لنچ کریں گے۔“ وہ پر جوش سی بولتی فون رکھ کر تیزی سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر آفس سے باہر نکلی تھی۔ وہ جتنا سب سے بھاگنا چاہتا، اتنا ہی مجبور ہو جاتا تھا اور آخر کو کیسی مجبوری یہ زندگی اسی کی تو منتخب کردہ تھی۔ پر اب یہ بیزاریت اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

☆.....☆

گاڑی پارک کر کے وہ مڑی سامنے ہی اس کی نظر اس پر پڑ گئی تھی جو ارد گرد سے بیزار کسی سوچ میں گم تھا۔ گرے ڈریس پینٹ پر بلیک شرٹ جس پر گرے ہی کلر کا ویسٹ کوٹ پہنا ہوا بالوں کو جیل کی مدد سے پیچھے کی طرف سیٹ کیا ہوا تھا۔ اس کے بال سلکی گھنے تھے، جب وہ جیل نہیں لگاتا تھا تو چھوٹے چھوٹے بال ماتھے کی طرف ڈھلک آتے، جنہیں اکثر وہ بے تکلفی سے سنوارتی، کھڑے نقوش کسرتی جسامت بلاشبہ وہ ایک خوب صورت مرد تھا، اس کی خوب صورتی میں سب سے حسین اس کی سنہری آنکھیں تھیں جن میں بے پناہ خاموشی رقم تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکراتی ہوئی اس کے ٹیبل کی طرف بڑھی تھی۔ اس کی آمد پر اس نے اس پر سرسری نگاہ ڈالی تھی چست بلیو جینز پر اس نے وائٹ کلر کی ریشمی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ جس کے گلے اور آستینوں پر وائٹ ہی کلر کی فرل کا ڈیزائن بنا ہوا تھا۔ سنہرے ریشمی بالوں کی اونچی سی پونی ٹیل بنائی ہوئی تھی۔ کانوں میں وائٹ ہی کلر کے موتی جتنے ٹاپس پہنے ہوئے بلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ وہ بہت فریش لگ رہی تھی۔

”بہت بد تمیز ہو تم میرے بغیر تم یہاں کیسے آ سکتے ہو؟“ وہ آئی گلاسز سر پر چڑھاتے ہوئے ساتھ ہی چیئر کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی مگر اس کی خاموشی ہنوز تھی اب اسے عادت سی ہو گئی تھی۔ اس کے اس انداز کی جیسی وہ براگم ہی مناتی۔

”اچھا بتاؤ تم نے کچھ آرڈر کیا؟“ وہ مینو کارڈ پر نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔

”پلیز سیویم! تم نے جو منگوانا ہے، منگوا لو اپنے لیے پر میرے لیے کچھ آرڈر مت کرنا۔“ اس سے پہلے وہ کچھ آرڈر کرتی اپنے لیے اس نے صاف انکار کر دیا۔ سیویم نے اسے بغور دیکھا تھا جس کے چہرے پر ٹھنکن اور لہجے میں چیز چڑا ہٹ واضح تھی۔ وہ چند ثانیے اسے تکتی رہی پھر سر جھٹک دیا بنا کسی خیال کے۔

”کھانا تو تمہیں ضرور کھانا پڑے گا، میں تمہاری پسند کی گرل فز آرڈر کر رہی ہوں۔“ وہ لہجے میں مسکراہٹ سموئے ضدی انداز میں بولی۔ جب کہ اس کے چہرے پر مزید بیزاریت طاری ہو گئی۔ آخر کو اس نے خش منگوا لی اس کی پلیٹ میں زبردستی ڈال بھی دی لیکن پھر بھی وہ دو چار لقموں سے زیادہ نہ لے سکا۔

”کیا ہو گیا ہے شیٹ! تمہیں ٹھیک سے کھاؤ۔“ وہ اسے دیکھ کر فکر مند سی بولی۔

”میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا مجھ سے نہیں کھایا جائے گا۔“ اس نے پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”اس طرح تم بیمار پڑ جاؤ گے۔“ اس کی بات پر وہ بے دردی سے مسکرایا تھا۔

”بڑا ڈھیٹ ہوں نہیں پڑوں گا بیمار۔“



”ہمیشہ فضول بولنا۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”اور تم بھی جلدی کرو۔ ویسے بھی لٹچ کا وقت ختم ہونے والا ہے اور آفس پہنچنا ہے اب۔“ وہ اب کسی کو بھی خاطر میں لائے بغیر بولا۔

”نہیں تم آفس نہیں جاؤ گے میں نے پاپا سے بات کر لی ہے۔“ اس نے اب نیا آرڈر جاری کیا۔

”کیا مطلب؟“ وہ حیران ہوا۔

”مطلب یہ کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سو تم آفس نہیں جاؤ گے آج۔“ وہ پرسکون سی بولی۔

”میں نے تمہیں کہاناں میں ٹھیک ہوں۔“ وہ اکتا کر بولا۔

”جی نہیں کوئی ٹھیک نہیں ہو اس لیے میں نے ڈیسا ایڈ کیا ہے، تمہارا موڈ فریش کرنے کے لیے آج ہم صرف گھومیں پھریں گے۔“ پر جوش سی اس نے اپنے خیال بیان کیے اور کوفت سے اس کا مزید برا حال ہو گیا۔

”پلیز! میرا کوئی موڈ نہیں ہے کہیں بھی جانے کا۔“ اس نے فوراً دو ٹوک کہا۔

”شیٹ پلیز! ہر بار تم اپنی من مانی کرتے ہو، جس بھی اس حال میں ہو مجھے کچھ معلوم نہیں، جہاں میں لے جاؤں گی وہاں جانا پڑے گا یہ میرا فائنل فیصلہ ہے۔“ وہ بھی دو ٹوک بولی تھی جب کہ وہ پتھر کا سا بنا بیٹھا رہا۔

”چلو اب اٹھو بھی۔“ وہ ہل پے کر کے آئی اسے جوں کا توں بیٹھا دیکھ کر پر زوری بولی۔ وہ ہار کر اٹھ گیا۔

”کہاں جانا ہے؟“ ڈرائیو کے دوران اس نے پوچھا تھا۔

”یار ریسور۔“ اس کے جواب پر اس نے اسے دیکھا تھا۔ جو اسے ہی دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا اس نے جان بوجھ کر وہ جگہ ڈیسا ایڈ کی تھی۔ وہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی بے شک اور وہ سوچتی تھی وہ اسے وہاں لے جا کر شاید اسے ہر چیز سے آزادی دلا دے گی۔ اس کی سوچ پر وہ پھیکا سا ہنس دیا۔ سب بے کار تھا لا حاصل اس کیفیت سے آزادی پانا ناممکن تھا۔ وہ اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی۔ محبت کا وہ ایسا سفر طے کر چکی تھی جہاں سے اس کا پیچھے ہٹنا بھی نہ ممکن تھا۔ حالانکہ اسے کبھی مثبت جواب نہ ملا تھا۔ سارا سفر خاموشی کی نذر ہوا تھا۔ گاڑی پارک کر کے وہ دونوں کونیز پر برتج کی طرف بڑھے تھے۔ کونیز برتج کے ساتھ یار ریسور کا بہتا پانی ایک خوب صورت منظر تھا۔ دریا کے دائیں طرف برتج تھا جس کے ساتھ ہی تھوڑی اونچی سی جگہ پر گھاس کی تہہ بچھی ہوئی تھی، جہاں اکثر و بیشتر لوگ بیٹھ کر دریا کے خوب صورت مناظر کو اپنے اندر تک اتار لیتے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگے گھنے ہرے بھرے درخت ماحول کو تروتازہ کر دیتے تھے وہاں تفریح کے لیے بہت کچھ تھا۔ لوگ دریا میں بوڈنگ کرتے آرام کے لیے بیچوں کا انتظام تھا۔ ساتھ ہی قریب بنے ریسٹورنٹ میں کھانے پینے کا انتظام لوگوں کو اپنی جانب کھینچتا چونکہ آج ورکنگ ڈے تھا اس لیے لوگوں کا ہونا نہ ہونے کے برابر تھا اور اس وقت تھا بھی لٹچ کا وقت اس لیے لوگوں کا ہجوم ریسٹورنٹس کی طرف تھا۔ وہ یہاں آکر واقعی بہت اچھا محسوس کر رہا تھا۔ یہاں کی خاموشی اسے اندر تک پرسکون کر دیتی تھی۔ بہتے دریا کی ٹھنڈی مترنم آواز، درختوں پر پرندوں کی چہچہاہٹ بے پناہ خاموشی میں موسیقی کا کام کرتی تھیں۔ وہ کبھی بھی تنہائی پسند نہ تھا۔ لوگوں کے ہجوم قہقہے رنگارنگ محفلیں سب اس کے شوق میں تھے۔ پر اب پہلے جیسا کچھ بھی نہ رہا تھا۔ وہ ظاہر اور باطن یکسر طور پر بدل گیا تھا یا نہ جانے زندگی بدل گئی تھی۔ پر زندگی کبھی نہیں بدلتی بس لوگ اور ان کے اعمال سب بدل دیتے ہیں۔ وہ کہیں دور جا کر سب



سے چھپ جانا چاہتا تھا۔ تنہائیوں کو اپنا ساتھی بھی اس نے خود ہی بنالیا تھا۔ بڑا عجیب ہوتا ہے تب جب آپ چاہتے کچھ ہوں اور کرتے کچھ ہوں، شاید تکلیف دہ بھی ہوتا ہے بلکہ بہت زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے اس کا اندازہ تب زیادہ محسوس ہوا تھا جب وہ خود اس دورا ہے سے گزر رہا تھا۔

”تمہیں پتا ہے مجھے یہ جگہ کچھ خاص پسند نہیں ہے۔ پر اگر مجھے تمہارے ساتھ یوں چلنا پڑے پھر تو ہر روز میں یہاں آؤں۔“ وہ اس کے کندھے سے سرٹکائے اور دائیں بازو میں اپنا ہاتھ ڈالے اس کے ساتھ جڑی چل رہی تھی۔ لہجہ اس کا جذب سے بھرپور محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ بلاشبہ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور اس کی محبت میں اس کے لیے خلوص، سچائی، ایمانداری ہر رنگ موجود تھا۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ حالانکہ اس کی پیدائش مغرب میں ہوئی تھی۔ پٹی بڑھی بھی یہیں پر اس معاملے میں وہ مغرب کی تقلید میں نہیں چلی تھی۔ اس نے اسے پہلا اور آخری ہی سمجھا تھا اس حقیقت کا اندازہ شیٹ کو تھا جسے آج وہ با آسانی یہاں تھا۔ پرنسپل میں آج بھی ایک دیوار حائل تھی۔ وہ یہاں تھا اس کے ساتھ کو اپنا یا پر اس کی محبت کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ وہ چاہتا تھا وہ اسے پورے دل سے قبول کر لے پر نہ جانے کیا ایک اتنی طاقت اس کے وجود کو گھیرے ہوئے تھی اور پھر وہی بات آ جاتی۔

”جو چاہتا وہ کرنے پاتا۔“ اس کے لیے اذیت کا سب سے بڑا مرحلہ تھا یہ۔

”شیٹ!“ اس کی گہری خاموشی پر اس نے اس کی سنہری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پکارا جواب میں اس نے ہولے سے ”ہوں“ کہنے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ اس سے الگ ہو کر اس کے سامنے آٹھری وہ بھی تھم گیا۔

”مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ اس کے لہجے میں سنجیدگی عود آئی۔

”بولو۔“ وہ بغور اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”پہلے تم وعدہ کرو میری ہر بات کا جواب دو گے۔ کسی بھی بات کو گھماؤ گے نہیں۔“ وہ اس کی عادت سے واقف تھی جسے وارن کر دیا۔

”ایسی بھی کیا بات ہے؟“ وہ گھنے سائے دار درخت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

”نہیں بس تم پہلے وعدہ کرو۔“ وہ بضد تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے وعدہ۔“ اسے معلوم تھا ہار کر اس کی بات ماننا ہوگی، پہلے وہ کچھ دیر خاموش رہی شیٹ کی نگاہ اس کے پرسوج چہرے پر تھی اسے اندازہ تھا وہ کیا بات کرے گی جو وہ اس کے ساتھ کر رہا تھا اس کے بعد اس کا ایسا سوچنا ممکن تھا۔

”تمہیں میلبورن آئے ہوئے ڈیڑھ سال ہو چکا ہے۔ جب تم آئے تھے تب کے اور اب کے شیٹ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تم یہاں اپنی مرضی سے بخوشی آئے تھے تو پھر تمہیں اب کیا ہو گیا ہے؟ کوئی مسئلہ ہے تو مجھ سے شیئر کرو۔“ وہ متانت سے بولی۔ اس کے سوال پر اب کیا جواب دیتا۔ یہ اس سے بڑا سوال تھا۔ اس کی نگاہیں دریا کے بہتے پانی پر منجمد ہو گئیں۔

”تمہارے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ کیونکہ جو بات میں خود نہیں جانتا تو تمہیں کیا جواب دوں۔“ اس کا لہجہ برف کی طرح منجمد تھا اور چہرہ ہر تاثر سے پاک۔

”کل رات جو تمہاری کیفیت تھی، اس سے صاف پتا چلتا ہے تم ڈہنی دباؤ کا شکار ہو، میری مانو تو تمہیں کسی اچھے سے سائیکا ٹرسٹ سے کنسلٹنٹ کرنا چاہیے دیکھنا تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔“



”تمہیں لگتا ہے میں ذہنی مریض بن گیا ہوں۔“ وہ اس کی بات پر شرمندہ سی ہو گئی۔

”میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔“ اس نے فوراً صفائی دی۔

”نہیں میں شاید واقعی ذہنی مریض بن گیا ہوں۔“ اپنی ہی بات کی اس نے تائید کی تھی۔ وہ دو قدم آگے بڑھی اور نرمی سے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

”تم بیمار نہیں ہو، تم نے اپنے گرد آسودگی کا دائرہ خود ہی تنگ کر لیا ہے اور اس سے آزادی تمہیں خود ہی حاصل کرنا ہوگی۔ شیٹ! میں نے تم سے سچی محبت کی ہے اور میں تمہیں ایسے تکلیف میں جلتا نہیں دیکھ سکتی تم جانتے ہو ناں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کچھ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی تھی اور اس کی سوچ کہیں اور ہی پرواز کر رہی تھی۔ پھر وہ کچھ نہ بولا۔ خاموشی پھر طاری ہو گئی۔ وہ بولتی جاتی اور وہ چپ چاپ سنتا رہا، زندگی کی خوشبو میں ناپید ہو گئی تھیں۔ اس کی ناؤ ایسے گرداب میں جا پھنسی جس کا نکلنا اب ناممکن تھا خشک تن بستہ ہواؤں نے اسے کسی پت جھڑ کے سحر کی طرح خشک بنا دیا تھا۔ جن حوصلوں کو تلاشتا تھا وہ..... وہ تو کب کے گنوا چکا تھا۔ وہ کسی ربوٹ کی طرح اس کے ساتھ گھومتا رہا۔ یوریکا اسکائے ڈیک کی بلند و بالا عمارت میں وہ یوں کھڑا تھا جیسے اس کا وجود بیچ خلا میں لٹک گیا ہو۔ جب کہ وہ شیشوں کے پار میل بورن سٹی کی جگمگا ہٹوں کو اپنے اندر اتار رہی تھی۔

”شیٹ! دیکھو کتنا خوب صورت لگ رہا ہے۔“ وہ شیشے پر ہاتھ دھرے اپنے قدموں تلے شہر کی جگمگا ہٹوں کو خیرہ ہوتی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی جواب میں وہ صرف پھیکا سا مسکرایا تھا۔ وہ بھی زبردستی اسے قطعی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی ان نظاروں سے وحشت اتر رہی تھی تو اس بات سے کہ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ راتیں اسے اب اس نہیں آتی تھیں۔ شب رنجور اسے خوابیدہ ہی کیے رکھتیں، بس ایک خواہش تھی کہ جو رات آنکھوں میں کثرت ہے، زندگی بھی کچھ ایسی ہی مختصر ہو جائے اور اس کی زندگی اس رات میں ہی کٹ ہی جائے۔

☆.....☆

ویک اینڈ پرسیویم نے اسے ڈنر پر انوائٹ کیا ہوا تھا۔ شاید وہ کبھی نہ آتا اگر زاہد بیگ کا وہ ڈیرا وانہ دیتی اسے پتا تھا وہ ان کی اتنی عزت کرتا ہے کہ کبھی انکار نہیں کرے گا۔ وہ ڈنر کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ جب کہ وہ زاہد بیگ کے ساتھ بیٹھا بزنس پر ہی ڈسلیکشن کر رہا تھا۔

”سر! میں تو آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ ابھی پارٹنرشپ کو او ایڈ ہی کریں۔“ اس نے متانت سے کہا۔ مسٹر بیگ نے سگار کا دھواں ہوا میں چھوڑتے ہوئے اس کی بات پر غور کیا تھا۔

”ہوں..... میں بھی یہی سوچ رہا تھا، اس وقت مارکیٹ کا آرڈر پورا کرنا مشکل ہے۔ ایسے میں پارٹنرشپ رسک ہے۔“ وہ پرسوج سے بولے تھے۔ مسٹر بیگ کی پیدائش آسٹریلیا کی ہی تھی ان کے والد نے میل بورن میں ہی ایک چھوٹی سی لیدر فیکٹری کی بنیاد رکھی تھی، جسے ترقی کی بلندی پر انہوں نے پہنچایا اور آج ان کی انتھک محنت کی وجہ سے مارکیٹ میں ان کی لیدر کی مانگ میں اضافہ ہو رہا تھا۔

”جی سر! جہاں یہ فیکٹری کو مزید بلندی پر پہنچانے کا باعث بن سکتی ہے وہیں رسک کی صورت میں نقصان بھی ہو سکتا ہے۔“

”اصل میں..... میں نے تو مسٹر جارج کو صاف منع کر دیا تھا، پر ان کا اصرار ہے، میں سڈنی آکر ایک



باران کی آؤٹ لیٹ کا وزیٹ کروں۔“ مسٹر جارج کے بارے میں وہ سن کر ٹھٹھک گیا تھا۔  
 ”سر! جہاں تک میں جانتا ہوں ان کے بارے میں مارکیٹ میں ان کی ریپوٹیشن کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ کام کے حوالے سے۔“ اس کی بات پر وہ کچھ چونکے تھے۔  
 ”تمہیں کس نے بتایا؟“

”سر! مسٹر بارتھولیک ان کے بزنس پارٹنر رہ چکے ہیں۔ چھ ماہ پہلے سڈنی میں ہی میری ان سے ایک بزنس میٹنگ میں ملاقات ہوئی تھی۔ تب انہوں نے مسٹر جارج کی پارٹنرشپ کے ساتھ جو نقصان اٹھایا تھا اس کے بارے میں سرسری سا ذکر کیا تھا۔“ وہ ان کی فیکٹری میں میجر کی حیثیت پر تھا۔ انہیں اس پر پورا اعتماد تھا۔ سیویم کی وجہ سے وہ اپنے ہر کام کے سلسلے میں اس کی رائے کو لازمی اہمیت دیتے تھے۔ وہ ایک ذہین انسان تھے۔ انہوں نے سیویم کی آنکھوں میں اس کے لیے پسندیدگی دیکھی تھی اور درحقیقت وہ خود بھی یہی خواہش رکھتے تھے۔ انہیں اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے ایسے ہی ایماندار اور ذہین انسان کی خواہش تھی۔ وہ اسے اہمیت دیتے اب بھی اس کی بات پر انہوں نے سنجیدگی سے یقین کیا تھا۔

”ایسا ہے تو پھر میں کبھی بھی اس پارٹنرشپ کے بارے میں نہیں سوچوں گا۔“ انہوں نے اپنے فیصلے پر حتمی مہر لگائی، ان کی بات سے وہ خوش ہوا تھا کہ وہ اس پر اس حد تک اعتبار کرتے ہیں سیویم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی اس کی سماعتوں تک یہ ساری باتیں پہنچ گئی تھیں۔

”اوہو پاپا! آپ کیا بزنس کی باتیں گھر میں لے کر بیٹھ گئے ہیں۔“ وہ ان کے پاس ہی صوفے کی ہتھی پر بیٹھتے ہی گویا ہوئی، اسے دیکھ کر ان کے چہرے پر گہری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔  
 ”بھئی اب میں اور کیا باتیں کر سکتا ہوں۔“

”کچھ بھی کریں، بس یہ ٹاپک بند کریں۔“ وہ ان کے گرد بازو جھائل کرتے ہوئے بولی۔  
 ”اچھا آپ ان باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ ڈنر کی کیا صورت حال ہے نونج چکے ہیں۔“ انہوں نے اس کی توجہ گھڑی کی سمت کرواتے ہوئے، وہ وقت کے بے حد پابند تھے اٹھنے جاگئے، کھانے پینے ہر چیز میں ڈسپلن ہوتا۔  
 ”ڈنر بالکل ریڈی ہے بس لگانا باقی ہے۔“

”تو پھر جلدی لگائیے۔“ ان کے کہنے پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی کھانا لگ گیا تھا۔ وہ شیٹ کو مخاطب کرتے ڈائننگ ہال کی جانب بڑھے تھے وہ بھی ان کی تقلید میں کھڑا ہو گیا تھا۔ ڈنر کافی خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ کھانے کے دوران بھی اس کی نگاہیں شیٹ کی طرف اٹھ رہی تھیں جو ہمیشہ کی طرح سپاٹ چہرہ لیے چپ چاپ کھا رہا تھا۔ اس کی خاموشی دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی چہرے پر چھائی آسودگی اس کے ہر تاثر کو چھپا دیتی تھی۔ اس کا تاریکیوں میں ڈوبا چہرہ مزید تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ یوں گلتا تھا وہ آج پھر گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ جانے انجانے طور پر ہی سہی پر کچھ غلط ہو جانے کا احساس جاگ رہا تھا۔ وہ بے ضمیر نہیں تھی۔ نہ ہی بے حس اس کا نا آسودہ چہرہ اسے بھی اندر تک مر جھادیتا تھا۔ ڈنر کا اختتام ہوا اس کے بعد گرین نی کے ساتھ ان تینوں کی ہلکی پھلکی گپ شپ چلتی رہی۔ تقریباً گیارہ بجے تک اس نے واپسی کی راہ لی۔ وہ اسے باہر تک چھوڑنے آئی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔  
 ”ٹھینکس۔“

”کس بات کے لیے۔“



”ڈنر کے لیے۔“

”اوپلیز! اس فارمیٹی کی کیا ضرورت ہے۔“ اسے اچھا نہ لگا۔

”یہ فارمیٹی نہیں ہے اچھا لگا تو کہہ رہا ہوں۔“ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا جواباً وہ پھیکا سا مسکرا دی۔

حالانکہ اس نے صاف محسوس کیا تھا وہ ان کے بیچ میں ہو کر بھی نہیں تھا۔

”اچھا سنو! پرسوں تیار رہنا، جیکسن اور لیزا کی شادی میں جانا ہے، ہمیں اس نے تمہارا انویٹیشن کارڈ

مجھے ہی دے دیا تھا۔“ اچانک یاد آنے پر وہ بولی۔

”میرا بالکل موڈ نہیں ہے پلیز۔“ بے زار کن لہجے میں وہ بولا۔

”موڈ تو تمہیں لازمی بنانا پڑے گا جیکسن میرے بچپن کا دوست ہے، شیٹ! میری خاطر تمہیں چلنا ہو

گا۔“ وہ بضد ہوئی۔

”اچھا دیکھیں گے۔“ اس نے گاڑی اشارٹ کرتے ہوئے جیسے جان چھڑائی۔

”جی نہیں کچھ دیکھنا دکھانا نہیں ہے تم بس آؤ گے۔“ اس نے تنبیہ کیا، آگے سے اس نے سر جھٹک کر

گاڑی کو ریورس کرتے ہوئے روڈ پر ڈالا اور اڑاتا ہوا لے گیا۔

☆.....☆

جس وقت وہ چرچ میں داخل ہوا تھا، کافی مہمان آچکے تھے۔ تقریب بھی شروع ہو چکی تھی۔ سیویم کی

نگاہیں اسی کی منتظر تھیں۔ بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس آنکھوں پر نظر کے آئی گلاسز لگائے بالوں کو نفاست

سے جیل کی مدد سے پیچھے کی جانب سیٹ کیا ہوا تھا۔ وہ کافی ہینڈسم اور فریش لگ رہا تھا۔ وہ اس کی جانب

بڑھی تھی۔ اپنی پیچ کھر کی نیٹ کی گھیر دار فرائ کو سنبھالتی ہوئی چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ اس کی

جانب بڑھی تھی ہلکے سے میک اپ میں اس کا قدرتی حسن جگمگا رہا تھا۔ بالوں کو اس نے ڈھیلا سا جوڑا بنا کر

اس میں پیچ کھر کا سائیڈ پر مصنوعی پھول لگایا ہوا تھا۔ ہلکی سی جیولری نے اس کی تیاری کو مکمل کر دیا تھا۔

”کیسی لگ رہی ہوں؟“ وہ خوش مزاجی سے اس کے روبرو کھڑی ہوئی۔

”اچھی لگ رہی ہو۔“ جب کہ اس کا لہجہ سہمی ہوئی تھا۔

”چلو آؤ بیٹھتے ہیں تقریب تقریباً شروع ہو گئی ہے۔“ وہ بے تکلفی سے اس کے بازو میں اپنے ہاتھ حائل

کرتے ہوئے بولی۔

”دونوں ساتھ کتنے اچھے لگ رہے ہیں ناں۔“ وہ پر شوق نگاہوں سے جیکسن اور لیزا کو دیکھ کر بولی۔

”ہوں۔“ وہ مختصر بولا۔

شادی کی رسومات شروع ہو گئی تھیں، اس کی نگاہیں بھی ان دونوں پر تھیں، خوشی کی الوہی چمک ان کے

چہروں پر نمایاں تھی۔ جیکسن لیزا کو رنگ پہنارہا تھا۔ اس کی نگاہ ان کے ہاتھوں پر جم سی گئی تھی اور ایک منظر

تھا جو دماغ کے پردے پر لہرایا تھا اس کی زندگی کا خوب صورت ترین لمحہ جو اس کے دماغ پر نقش تھا۔ برقی

قلموں سے بھی محفل خوش نما چہرے، گونجتے قہقہے گویا اس محفل کو خوب صورت رنگوں سے سجایا گیا تھا۔

گلابی شیفون کی کام دار فرائ کے ساتھ چوڑی دار یا جامہ اور سر پر سلیقے سے دوپٹا سجائے نفیس میک

اپ اور لائٹ سی جیولری میں وہ کسی دلہن سے کم نہ لگ رہی تھی۔ خوشی کے اترے رنگ نے اسے روپ سے

نہلا دیا تھا۔ جب اسے اس کے پہلو میں لا کر بٹھایا گیا تو اس کی چوڑیوں کی کھٹکناہٹ نے جیسے اس کے دل



کو مشتعل کر دیا ہو، اس نے اس پر ایک بھرپور نگاہ ڈالنا جیسے اپنے اوپر فرض سمجھا ساتھ ہی ایک دلفریب سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔ اس کی پرشوق نگاہوں کی تپش کو وہ بخوبی محسوس کر رہی تھی۔

”بس کریں ماموں! آپ کو تو لوگوں سے بھی شرم نہیں آرہی۔“ زارا نے اس کے کان میں شرارتی لہجے میں سرگوشی کی تھی جو نمل کی سماعتوں سے بھی نکرانی تو بے اختیار اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری تھی۔ جب کہ وہ پورے ڈھیٹ پن سے زارا کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔

”کیا کروں تمہاری سہیلی لگ ہی اتنی خوب صورت رہی ہے۔“ آگے سے اس کا منہ ہی کھلا رہ گیا اس قدر بے باکی پر۔

”ماموں! بھانجی ہوں میں آپ کی کچھ تو شرم کریں بولتے ہوئے۔“

”ہاں تو میں نے ایسی بھی کیا ہے ہودہ بات کر دی۔“ وہ بے دریغ بولا۔ نمل کی سماعتوں تک بہ آسانی ان کی گفتگو پہنچ رہی تھی۔

”تو بہ ہے آپ تو بالکل بے شرم ہو گئے ہیں۔“ اس نے شرارت سے اسے چھیڑا آگے سے وہ ہنس دیا۔

منگنی کی رسم شروع ہو گئی۔ نگہت اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالتی فرحت کے ساتھ اسٹیج کی طرف بڑھیں، زارا فوراً سیدھی ہو بیٹھی رسم شروع ہوتے ہی کیمرا مین نے بھی فوراً کیمرا سنبھالا اور خوب صورت مناظر کو کھینچتا چلا گیا۔ رسم خیر اسلوبی سے انجام پائی۔ ہر ایک چہرے پر خوشی کی طمانیت تھی۔ آج دونوں کی ایک نئے خوب صورت رشتے کی شروعات ہو گئی تھیں۔ رسم کے ختم ہوتے ہی کھانے کا دور چلا۔ نگہت اور فرحت دونوں ہی خیر اسلوبی سے مہمانوں کو نمٹانے میں مصروف تھیں۔ آج ان کی دوستی کے رشتے کو ایک مضبوط مہر لگ گئی تھی۔

دونوں کے لبوں پر ایک مسکراہٹ سج گئی تھی۔

زارا، نمل کو لیے اوپر ٹیرس کی طرف بڑھی تھی۔

”زارا! کیا بات ہے کیوں لے کر جا رہی ہو اوپر؟“

”تم بس چلو ناں کیا کیوں کے سوال کا کیا مطلب۔“ وہ سختی سے بولی۔ آگے سے وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

ٹیرس کا دروازہ کھول کر وہ اندر کی طرف بڑھیں جہاں سامنے شیٹ اسی کا منتظر تھا اسے صرف ایک لمحہ لگا ساری صورت حال جاننے میں اس نے گھور کر زارا کو دیکھا تھا جو آگے سے ڈھیٹ بنی مسکرا رہی تھی۔

”لیں بھئی ماموں! لے آئی آپ کی امانت کو۔“

”زارا!“ اس نے دانت چبا کر بولا۔

”سوری ڈیر! پر ماموں کی التجا کو میں رد نہ کر سکی۔“ معافی مانگتے ہوئے شرارت سے اس نے کان پکڑ لیے۔

وہ اب کیا بولتی سارے راستے اب مسدود تھے۔

”اور ہاں ماموں آپ کو پراس یاد ہے ناں مجھے میری پسند کی نیو برینڈ گھڑی چاہیے۔“ وہ وارن کرنا نہ بھولی تھی۔

”ہاں میری ماں یاد ہے اب جاؤ بھی۔“

”جا رہی ہوں آپ میں تو بالکل صبر نہیں ہے۔“ وہ منہ چڑاتی چلی گئی تھی اور وہ حیرت سے ماموں بھانجی کی سودے بازی سن رہی تھی۔ ساتھ ہی شیٹ کو گھورا۔



”کیا! ایسا بھی کیا غلط کر دیا میں نے۔“ وہ خجالت سے بولا۔ آگے سے وہ دھیمسا مسکرا دی۔ وہ قدم بڑھا کر اس کے روبرو آن کھڑا ہوا اور گہری سنہری آنکھوں نے اس کا طواف کیا اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ حزیں آنکھیں جھک گئی تھیں اور دھڑکنوں نے یکدم جیسے شور مچایا اس نے اس کے نرم گداز ہاتھ کو تھاما۔ اس کی مخروطی انگلی میں ایک نازک انگٹھی جگمگا رہی تھی۔ اس نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔

”تم خوش ہو؟“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”منگنی کے بعد یہ سوال پوچھ رہے ہو۔“ اس نے لا جواب کر دیا اسے آگے سے وہ ہنس دیا۔

”بس ویسے ہی دل کی تسلی کے لیے پوچھ لیا ورنہ مجھے معلوم ہے تم خوش ہوگی۔ آخر اتنے خوب صورت انسان کا ساتھ مل گیا۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”اف..... اتنی خوش فہمی۔“ وہ اس پر نظر جما کر بولی۔

”نہیں۔ یہ قطعی خوش فہمی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔“ وہ سنجیدہ سامنہ بنائے بولا۔

”تو بہ ہے اپنی خوش فہمی دور کر لو، کوئی خاص خوشی نہیں ہے مجھے۔“ اس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا آگے سے اس نے دفعتاً اسے اپنی جانب کھینچا۔

”شیٹ! کیا ہو گیا چھوڑو مجھے۔“ وہ اس کے تنک حصار میں پھل سی گئی۔

”اور اگر نہ چھوڑو تو۔“ اس کا لہجہ گھمبیر ہو گیا اور اس کی حالت غیر ہو گئی۔

”پلیز شیٹ!“ وہ التجائیہ بولی۔

”ابھی تو میں نے تمہیں جی بھر کر بھی نہیں دیکھا۔“ اس کی نگاہ اس پر جم سی گئی۔

”بہت چھچھورے لگ رہے ہو ایسی باتیں کرتے ہوئے۔“ وہ چبا کر بولی جس پر اس کا قہقہہ گونجا تھا۔

”اچھا اب ایسی بھی کیا چھچھوری بات کر دی منگیتر ہو میری کہہ سکتا ہوں ایسا۔“

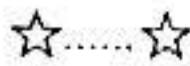
”اچھا بس تم چھوڑو مجھے جانا ہے۔“ وہ پزل سی ہو گئی۔

”ٹھیک ہے جاؤ پر ایک بات غور سے سن لو، آج کے بعد یہ چھوڑنے کا لفظ مت استعمال کرنا، عمر بھر اپنانے کا وعدہ کیا ہے چھوڑنے کا نہیں۔“ وہ متانت سے بولا۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ زندگی میں اس نے ایک اصول تو بنالیا تھا کہ انسان پر اعتبار کم از کم اس کے اصولوں میں شامل نہیں تھا لیکن آج نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اعتبار کر بیٹھی تھی۔ اس کی چمکتی روشن پراعتماد آنکھیں اس کے ذہن میں نقش تھیں، کسی سے کیا وعدہ بہت آسانی سے توڑ دیا تھا اور جب وعدے توڑے جائیں تو ملال کا کیا فائدہ، جب کوئی تعلق نہ رہا تو پھر ملال کیسا، وہ پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھتا تھا اس منزل کو تلاشتا تھا جس کے نشان وہ خود ہی مٹا آیا تھا۔ اس کا ضمیر بے چین تھا۔ اس کی روح ضمیر سے جڑ گئی تھی۔ وہ اس کے جسم میں بے چینی سے یوں پھڑپھڑاتی تھی جیسے بند پنجرے میں کسی اڑتے چھپی کو قید کر دیا ہو۔ اس کے سینے میں دھواں سا اٹھنے لگا ذہن میں نقش مسکراتے چہرے خوشنما قہقہے اس کے گرد جیسے طواف کر رہے تھے جو یکدم بند ہو گئے اور سامنے آسودہ چہرے اور نرم آنکھیں آٹھہریں تھیں وہ ان کی تاب نہیں لاسکتا تھا۔ ایک گہری دھند میں سب چھپتے چلے گئے۔ اس کے اندر نا آسودگی کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اضطرابی اس پر ایسی طاری ہونے لگی کہ اس کا چہرہ عرق آلود ہو گیا اسے لگا شاید وہ اب سب کے بیچ بیٹھ نہ پائے گا اور صرف دو لمحے لگے تھے وہ جھٹکے سے اٹھا اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔ سیویم چونکی تھی وہ فوراً اس کے پیچھے لپکی جب تک وہ باہر پہنچی وہ گاڑی اشارت کر رہا تھا۔ آج وہ



پریشانی سے اس کی جانب لپکی نہیں تھی، بس چپ چاپ اسے دیکھتی رہ گئی، اس کی نظر سیویم پر پڑی تو وہ رک سا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی گاڑی کے پاس آکھڑی ہوئی۔  
 ”شیٹ.....!“ اس کی آنکھیں ہر تاثر سے پاک ہو گئیں تھیں۔ اسے اپنی آواز خود بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

”سوری!“ وہ سپاٹ سا بولا تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں کی تپش اس کے اندر کا حال بیان کر رہی تھیں۔ وہ کچھ نہ بولی مزید وہ وہاں ٹھہرا نہیں جب کہ وہ وہاں جمی گئی۔ کیا وہ اب تک سراب کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ یعنی اس کی محبت خاک تھی، جسے گرم ہوائیں اڑانی چلی جا رہی تھیں۔ وہ صرف ایک خواب تھا جسے وہ حقیقت بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ آج اس کے دل نے ایک الارم بجادیا تھا۔ آنے والے بل کیا کچھ دکھانے والے ہیں اسے اندازہ ہو رہا تھا۔ اسے لگا شاید وہ اب کھڑی نہ رہ پائے گی۔ اس کے قدم سست ہوتے جا رہے تھے اور جس کے پیچھے وہ بھاگ رہی تھی وہ اس سے دور نکل چکا تھا۔



اس نے ٹھنڈے پانی کی بوتل کو فریج میں سے تیزی سے نکال کر سارے پانی کو ایک ہی سانس میں حلق کے اندر انڈیل دیا تھا۔ اندر لگی آگ سلگتی رہی۔ جسے وہ ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ پانی کی خالی بوتل کو بے دردی سے زمین پر پھینکا تھا۔ اس کے اعصاب شل ہونے لگے تھے کنپٹیاں مسلسل سلگ رہی تھیں کنپٹیوں پر ابھرتی رگیں اس کے اندر اٹھتے طوفان کا پیش خیمہ تھیں۔ وہ کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ الماری سے سلپنگ سوٹ نکالنے کے بعد وہ شاوور لینے چلا گیا تھا۔ شاوور لے کر وہ سیدھا بستر پر آگرا تھا۔ تکیے کے اندر منہ چھپا کر اس نے آنکھیں موندھ لیں اور پھر ایک ناکام کوشش کی تھی۔ ذہنی اذیت سے چھٹکارے کے لیے بند آنکھوں کے پیچھے ہمیشہ اس کا عکس جھلکاتا تھا، ہنستا ہوا کبھی سنجیدہ سا تو کبھی غم آنکھوں میں نا آسودگی چھائی ہوتی، وہ ہر روپ میں اس کے ذہن پر نقش تھی اس کی جھنجھلاہٹ میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کا دل چاہا وہ سب توڑ پھوڑ دے۔ چیخے چلائے پر کسی طور اپنے اندر کی اضطرابی کونوچ کر پھینک دے۔ وہ کب تک یہ ماتم گری کرتا ہر رات ماتم کرتے ہوئے ہی تو گزرتی تھی۔ یہ ماتم گری اس نے خود ہی تو تجویز کی تھی پھر ملال کیسا، ایسا کوئی جرح نہیں تھا جو اس کے زخموں کا علاج ہی کر دیتا یہ سب اسی کے منتخب کردہ تھے پر اب سرد ہواؤں کا زور بڑھ رہا تھا۔ اس کی خواہشوں کے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ لڑکھڑانے لگے تھے۔ تاروں کا غبار بکھرنے لگا تھا۔ ہر چیز کالج کی طرح ٹوٹ کر چکنا چور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ کچھ تو ایسا تھا جس کی وجہ سے سب بکھرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ سوچوں کے اثر دھام میں غرق تھا۔ جب کمرے میں گونجتی فون بیل پر اس کا مشعل ذہن جیسے ہوش میں آیا تھا۔ تکیے سے سر اٹھا کر اس نے بیزاریت سے فون کی طرف دیکھا تھا جو مسلسل بجے جا رہا تھا۔ تنگ آ کر اس نے اٹھالیا۔

”ہیلو!“ وہ سرد سا بولا۔ جب کہ دوسری جانب مکمل خاموشی ہو گئی۔

”ہیلو!“ کوئی جواب نہ پا کر وہ پھر بولا تھا۔ پر ہنوز خاموشی تھی۔ وہ کچھ ٹھٹھکا تھا دیار غیر میں بیٹھے کسی بہت اپنے کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔

”آپا! آپ ہیں ناں۔“ اس نے یقین سے پوچھا جب کہ دوسری جانب کسی کے سکھنے کی آواز آئی تھی۔  
 ”شیٹ!“ ان کے پکارنے پر وہ ہوش میں آگیا تھا۔ اس کے اندر خوشی کی ایسی لہر دوڑی کہ یوں لگا جیسے



تھکن زدہ سانسوں کو آزادی مل گئی ہو۔

”کیسی ہیں آپ؟“ ان کی آواز سن کر وہ جیسے دوبارہ جی اٹھا تھا۔ لہجہ خود بخود خوشگوار ہو گیا تھا جب کہ وہ چپ سی ہو گئیں۔

”زندہ ہوں اور جی رہی ہوں۔“ تھکن سے چور لہجے نے اس کے منہ پر طمانچہ مارا تھا، جیسے وہ چپ سا ہو گیا اور پھر کچھ دیر کے لیے دونوں ہی جانب خاموشی چھا گئی جیسے دونوں ہی اپنے اپنے طور پر گفتگو کے لیے لفظ تلاش کر رہے ہوں۔

”سوچا تھا تم سے کبھی بات نہیں کروں گی پر تمہیں اپنے بیٹے کی طرح پالا ہے پیار کیا ہے شاید جیسا یہ ماں جالی چاہ کر بھی تمہیں بھول نہ پائی۔“ جہاں ان کی آنکھوں میں کمی تھی۔ وہیں اس کی خوابیدہ آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ یہ سچ تھا اگر انہوں نے اسے ماں بن کر پالا تھا۔ تو وہ بھی انہیں اپنی ماں ہی سمجھتا تھا۔ پھر بھلا ان کی ممتا سے بھرالس بھول سکتا تھا۔

”آپا!“ اس نے بڑی تکلیف سے انہیں پکارا تھا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا پر یوں لگتا تھا زبان گنگ ہو گئی ہو۔

”آپا! میں تو آپ سے معافی مانگنے کے قابل بھی نہ رہا۔“ وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح بولا اس کی بات پر وہ چپ سی ہو گئیں۔

”چھوڑو اس بات کو تم بتاؤ تم ٹھیک ہو۔“ اس موضوع سے انہوں نے پہلو تہی کرنا ہی مناسب سمجھا اور خود کو سنبھالتے ہوئے بولیں آگے سے وہ تو جیسے سوچ میں پڑ گیا تھا کس حال کی خبر سنائے۔

”میں ٹھیک ہوں آپا! آپ سنائیں بھائی جان اور زارا کیسے ہیں۔“ وہ بھی خود کو کیپوز کرتے ہوئے بولا تھا۔

”سب ٹھیک ہیں زارا کی بات سچی کر دی ہے میں نے، دو ماہ بعد شادی ہے اس کی۔“ زارا کی اس خبر نے جہاں اسے خوش کیا تھا وہیں نہ چاہتے ہوئے بھی دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ اس کی زندگی کا اتنا خوشی بھرا لمحہ تھا اور وہ ان سب سے دور تھا بے حد دور۔

”بہت مبارک ہو آپا۔“ وہ پر خلوص سا بولا۔

”خیر مبارک۔“

”یقیناً شادی میں آنے کا تو نہیں کہیں گی۔“ نہ جانے کس امید کے تحت اس نے کہا اسے لگا شاید وہ کبھی اس کی بات پر اتفاق نہیں کریں گی۔

”میں کوشش کروں گی پر تمہارے لیے میں زارا کے آگے حق کھوچکی ہوں شیٹ۔“ انہوں نے دو ٹوک کہا۔ ان کی بات پر وہ کرب سے مسکرایا تھا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، میں واقعی اس رویے کا حق دار ہوں۔“ اس نے صاف گوئی سے اتفاق کیا تھا۔

”جانے دو اب یہ سوچ کر خود کو تکلیف دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ابھی وہ غصے میں ہے۔ پروہ بھی زیادہ عرصہ تم سے ناراض نہیں رہے گی۔“ اپنے طور پر انہوں نے تسلی دی تھی۔ پروہ کوئی بچہ نہ تھا جو بہل جاتا، کچھ دیر ادھر ادھر کی بات کرنے کے بعد فون بند کر کے وہ واپس اوندھا منہ ہو کر لیٹ گیا جہاں اتنے وقت بعد



اسے خوشی ملی تھی وہیں وہ ایک گہری پستی میں چلا گیا تھا اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے مکان کو توڑنا پھر اس کے بلے کو دیکھنا چپ چاپ اور پھر اس ہی بلے سے دوبارہ مکان تعمیر کرنا کیسا ہوتا ہے؟ اسے آج محسوس ہو رہا تھا اسے ساحل کا کنارہ تو مل گیا تھا۔ پر لہریں ان کے نیچے سے ریت کھینچتی ہوئی لے جا رہی تھیں۔ اس کا وجود اتنا بے ڈول ہو گیا تھا کہ صرف اب ایک لہر کا گزر ہونا تھا اور اس کا سارا وجود بہہ جانا تھا۔

☆.....☆

اگلے دن آفس میں شیٹ کے روم کے پاس سے گزرتے ہوئے بے ساختہ وہ اس کے روم میں داخل ہوئی تھی۔ سامنے ہی وہ بیٹھالیپ ٹاپ پر کام کرنے میں منہمک تھا۔ اس کی آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ ”مجھے تو لگا تھا شاید تم اب آؤ گے ہی نہیں۔“ وہ اس کے ٹیبل کی جانب بڑھی چیئر کو کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بڑے عام سے لہجے میں بولی۔

”کیوں ایسا کیوں لگا تمہیں؟“ وہ دوبارہ کام کی طرف متوجہ ہو گیا بول وہ ایسے رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، وہ اسے دیکھ کر رہ گئی عجیب انسان تھا، کبھی ایسا ہو جاتا کہ وہ سب میں موجود ہی نہ ہو اور کبھی اتنا مطمئن نظر آتا اس کے بدلتے رنگوں سے وہ جیسے خود بھی عاجز آگئی تھی۔

”شیٹ! تم کیوں اتنے عجیب ہو۔“ وہ تیکھے چتون کر کے بولی۔ اس کی بات پر وہ پھیکا سا مسکرا دیا تھا جیسے اپنی ذات پر اس نے ہنسی اڑائی تھی۔

”تم اگر یہاں خوش نہیں ہو تو بتا سکتے ہو مجھے۔“ وہ صاف بولی۔

”ایسا کیوں لگا تمہیں؟“ اس نے اچھتی ہوئی نگاہ اٹھائی۔

”تمہارا رویہ مجھے سب باور کروا رہا ہے۔“

”غلط فہمی ہے تمہاری۔“

”میں کسی بھی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں بس تم حقیقت سے نظریں چرا رہے ہو۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔“ اس کا لہجہ دھیمہ پڑ گیا تھا اس کی آنکھیں اس کے کمزور سے لفظوں کا ساتھ نہیں دے

رہی تھیں اور یہ سب کم از کم اس سے تو مخفی نہ رہ سکا۔ وہ بہت خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”جس مٹی کی تم پیداوار ہو تمہاری روح آج بھی وہیں کہیں بھٹکتی ہے شیٹ۔“ وہ بہت گہرائی سے بولی تھی

اور وہ اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔ بہت سی باتیں بنا کہے ہی سمجھ آ جاتی ہیں۔ دونوں کے بیچ اتنا تو رشتہ تھا کہ وہ ایک

دوسرے کے احساسات سے واقف تھے۔

”چلتی ہوں تم اپنا کام کرو۔“ ایک سرد خاموشی چھا جانے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور وہ چپ چاپ

اسے جاتا بے تاثر آنکھوں سے تکتا رہا۔ یوں لگتا تھا زندگی کو سرد ہواؤں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا جیسے

برقاب شبوں کی مانند گزرتی زندگی ہر ایک لمحے ہر ایک وجود کو برقاب کرتی چلی جا رہی تھی۔ خاموشی اور سرد

مہری کا طوفان نہ جانے کب نکلتا تھا، اس بات کا پیش خیمہ کوئی نہیں کر پا رہا تھا۔

☆.....☆

چمپاتی صبح کا آغاز ہو گیا۔ ادھر سے ادھر سرگرداں پرندے دانہ پانی کے لیے پھدکتے پھر رہے تھے جو صبح

ہونے کا پیغام دے رہے تھے۔ وہ معمول کے مطابق اپنے کام کے لیے روانہ ہو گیا۔ دن چڑھتے ہی وہ خود کو

دنیا کے کاموں میں مصروف کر لیتا تھا اور رات کسی اماؤں کی طرح اس پر طاری ہو جاتی اس کا وجود ذہنی کرب



کے بھوت پریت کے قبضے میں چلا جاتا تھا۔ جس کا اثر روشنی کے طلوع ہونے پر کم ہو جاتا تھا مگر زائل نہ ہوتا، وہ مسلسل تکلیف میں تھا اس تکلیف سے اکیلے دو چار ہو کر وہ جیسے خود ہی کو سزا دے رہا تھا۔ بے چینی کے سلاخوں والے جالے نے اسے اپنے اندر قید کر لیا تھا، اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس کی خوابیدہ سرخ آنکھیں راتوں کے رت جگنو کی داستان سناتی تھیں۔ بہر حال پھر بھی روز خود کو سمجھاتا۔ سیویم کے لیے خود کو تیار کرتا تھا۔ جیسا بھی تھا اب وہی اس کا حال تھی۔ آج اس کی برتھ ڈے تھی شیٹ نے اسے ڈنر کے لیے انوائٹ کیا تھا۔ اس کے احساسات اس کی کیفیت کیا تھی اس نے سب کو ایک طرف رکھا اور جو تعلق بنایا تھا اسے نبھانا تھا۔ انٹر کوٹینٹل ریسٹورنٹ سیویم کو یہاں کا کھانا کافی پسند تھا۔ اس نے اسے وہیں انوائٹ کیا، خوشگوار ماحول میں کھانا کھاتے ہوئے بھی وہ دونوں چپ تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بس یہی کام انجام دینے آئے ہوں کھانے کے دوران وہ اس کی سنہری آنکھوں میں جھانکتی رہی تھی، جہاں ہمیشہ کی طرح گہری خاموشی کا راج تھا، اس کے رویے سے اس کے اندر بھی ایک سرد کیفیت اتر گئی تھی۔ اب لگتا تھا مسکراہٹ نے اس کے لبوں سے بھی منہ موڑ لیا تھا۔ وہ جو اس کے خاموش رہنے کے باوجود مسکراتی رہتی تھی۔ بولتی رہتی اب جیسے اس کا بھی دل اچاٹ ہو گیا تھا اسی ماحول میں ڈنر کا اختتام ہوا تھا۔

”جیکسن اور لیزا نے بیچ پارٹی پر سب کو انوائٹ کیا ہے۔ سوچا تمہیں بتا دوں اب تمہاری مرضی تم آؤ یا نہ آؤ۔“ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے اطلاع دی تھی۔ بنا کسی اصرار کے۔

”کب ہے؟“ اس نے گاڑی اشارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

”پرسوں۔“ اس نے نگاہیں کھڑکی سے باہر جمالی تھیں۔ وہ مخاطب اس سے تھی مگر بیگانگی کے ساتھ دل میں انجانی خواہش بھی شاید وہ اس کے روٹھے رویے کو محسوس کر کے ریکونسٹ کرے، پر یہ اس کی سوچ تھی وہ پتھر کا ہی بنا رہا۔

”ٹھیک ہے آجاؤں گا۔“ وہ بھی عام سے لہجے میں بولا۔ اس کے انداز پر وہ مزید اندر سے سرد ہوتی چلی گئی۔

☆.....☆

گریٹ اوٹمین کے صاف و شفاف سیاہ روڈ پر ان کی گاڑیاں گاڑن تھیں۔ روڈ کے دائیں طرف خوب صورت بنرے سے زمین مزین تھی اور بائیں طرف ٹھانیں مارتے نیلے سمندر نے خوب صورتی کے ساتھ ماحول کو بھی تروتازہ کیا ہوا تھا۔ صبح کا وقت تھا ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی، چمکتی نرم گرم دھوپ نے موسم کو خوشگوار کر دیا تھا۔ وہاں کی تروتازہ آب و ہوا نے انہیں بھی تروتازہ کر دیا تھا، گاڑیاں پارک کر کے سب اپنا اپنا ضروری سامان لیے سمندر کی جانب بڑھے تھے۔ جب کہ وہ چمکیلی ریت پر ہی بیٹھ گیا تھا۔ اس کا کوئی موڈ نہیں تھا پانی میں جانے کا، وہ وہیں بیٹھا طائرانہ نگاہ ارد گرد پر ڈال رہا تھا۔ سمندر کے وسط اور کناروں پر چٹان جیسے پتھر سینہ تان کر کھڑے تھے جو پتھر کناروں پر تھے ان پر اوپر جانے کا راستہ بنایا ہوا تھا جہاں لوگ بڑے شوق سے کھڑے گہرے سمندر کے نظاروں کو اپنی آنکھوں میں اتار رہے تھے۔ سیویم نے اسے کئی بار پکارا تھا پانی میں آنے کے لیے پر اس نے اشارے سے منع کر دیا تھا۔ سمندر کو دیکھتے ہی اس کے دماغ میں خواب کا منظر گردش کرنے لگا تھا۔ خواب تھا یا حقیقت وہ اس کے سحر سے نکل نہیں پایا تھا۔ اب سمندر کو دیکھ کر ویسی ہی وحشت اندر اترنے لگی تھی۔ شوریدہ اونچی لہریں اسے کسی دیو کی مانند لگ رہی تھیں جو اپنے اندر کسی



کو بھی بھسم کرنے کی طاقت رکھتی تھیں۔ نہ جانے وہ کون لوگ ہیں جو اس کے پاس آ کر اپنے غموں کو اس میں بہا دیتے ہیں بھلا وہ کیسے کسی کا دوست ہو سکتا ہے۔ اسے لگا اس سے زیادہ تو کوئی بھی بے وفا نہیں وہ انسان کے نیچے سے ریت کو یوں کھینچتا ہے کہ اسے خبر بھی نہیں ہوتی۔ جاندار وجود کا دوست بنتا ہے تو بے جان وجود کو کناروں پر کیوں پھینک جاتا ہے۔ پھر کہاں کا غمگسار تو کیسا دوست، وہ وہاں بیٹھا عجیب ہی سوچوں میں الجھ بیٹھا تھا۔ بے معنی خیالات شاید اس کی کیفیت کا ہی نتیجہ تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ قدم اٹھاتا یونکی ادھر ادھر ٹہلنے نکل گیا تھا، اونچے نیچے پتھروں کو کراس کر کے وہ ایک سبزے والی جگہ پر چلنے لگا جہاں ہرے بھرے درخت قطاروں سے لگے ہوئے تھے۔ ساتھ وقفے وقفے سے مختلف ریسٹورنٹ کلب بنے ہوئے تھے۔ صبح کا وقت تھا اس لیے لوگوں کا رش نہیں تھا مگر لنچ تک کافی رش ہو جاتا تھا اور شام میں اس سے زیادہ وہ کتنی ہی دیر خالی والذہن ادھر ادھر ٹہلتا رہا تھا۔ آخر تھک ہار کر وہ جب ٹہلنے سے بھی بیزار ہو گیا تو وہ ایک ہٹ کی جانب بڑھ گیا۔ جو ایک پبلک پلس تھا۔ پتھر کی سیڑھیاں چڑھ کر ایک برج کراس کرنا پڑتا، پھر ہٹ تک پہنچا جاتا، وہ آہستہ قدموں کے ساتھ چلتا چلتا ہٹ تک پہنچ گیا گول دائرے کی شکل میں بنا ہٹ جس کے اطراف میں کھلی روشن کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں سمندری ہواؤں کے گزر سے وہاں آ کر لوگ بہت محفوظ ہوتے تھے۔ کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر نیلے سمندر کا خوب صورت صاف نظارہ نظر آتا وہ ایک بہت ہی سادے طرز کا ہٹ تھا، لوگوں کا ہجوم بھی نہ ہونے کے برابر تھا، وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے یونکی کھڑا رہا اونچی نیچی لہروں کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کتنا ہی وقت گزر گیا۔ یہاں تک کہ اسے سیویم کی آمد کی خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ ڈھونڈتی ڈھونڈتی یہاں تک پہنچی تھی اور جب آئی تو اسے بے حس و حرکت کھڑا دیکھا، چند بل وہ اسے دیکھتی رہی پھر آ کر اس کے پاس ٹھہر گئی۔

”بہت ہی بے مروت انسان ہو۔“ اس کے ہیمے سے لہجے پر اس نے گردن گھما کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ نارنجی رنگ کی پلین سیولیس لانگ فرائیڈ میں اس کی دو دھیا رنگت کھل رہی تھی لیکن وہ ہنوز خاموش رہا۔

”ویسے کافی خوب صورت جگہ ہے ناں۔“ وہ بھی دیوار سے ٹیک لگا کر بولی۔

”ہوں۔“ وہ مختصر بولا اور وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس کا رویہ کوئی انوکھی بات نہیں تھا جو ایسا تھا لیکن محبت تو کر لی تھی اور اب دکھ بھی اٹھانا پڑ رہا تھا۔ پر سمجھ سے باہر یہ بات تھی کہ نہ جانے اس محبت کی جنگ کا کب اختتام ہونا تھا اس کے جذبات سرد پڑ گئے تھے۔ دکھ اس بات کا تھا کہ وہ عبادت سر لوح دل کسی بھی ربط سے آشنا نہیں تھا۔ اس کے چاروں گرد و حشت نے اپنا دائرہ تنگ کر دیا تھا، دہکتے جذبات منجمد ہو گئے تھے۔ بے کار کی مشقتیں بے کار کی مسافتیں بے کار کا ہجر تھا۔ ایسے میں وصل کی تمنا اس سے بھی زیادہ بے کار خواہش تھی۔ اس نے ممکن ہوتی آنکھوں کو بھینچ لیا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ سوچوں کے اثر دھام میں مقید رہی تھی۔ یہاں تک کہ کھڑے کھڑے اس کے پاؤں شل ہونے لگے تھے ہار کر وہ پلٹ آئی۔ بڑا مشکل سفر تھا اور اس نے جتنا طویل ہونا تھا، اتنا ہی مزید مشکل ہو جاتا تھا۔ کوئی بہت بڑی غلطی تھی جو سرزد ہو گئی تھی۔ جس کی تباہیوں کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ چلتی چلی گئی سمندر کی لہروں میں جیسے اس کا وجود بہتا چلا گیا۔ ایک بڑی لہر کے زد میں اس کا وجود آ گیا تھا۔ دوست اگر اسے نہ دیکھتے تو شاید واقعی اس نے بہہ جانا تھا۔ جب وہ لویا تھا تب اس کے گرد جمکھا دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔ تیز قدموں کے ساتھ چلتا ہوا اس تک پہنچا تھا وہ پور پور بھگی ہوئی تھی اس کے لب برف کی طرح سرد پڑ گئے تھے۔



”سیویم!“ اسے دیکھ کر فکر خود بخود اس کے لبوں پر آگئی تھی۔ اس نے سرخ بھیگی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا جن میں اشکوں کا جہاں آباد تھا اس نے ہاتھ کے اشارے سے بھی روکنے کا کہہ دیا تھا اور وہ جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

”جاؤ شیٹ! پلیر یہاں سے چلے جاؤ۔“ ہمیشہ اس کی محبت میں پنپتا لہجہ خود بخود دوسرا ہو گیا تھا، آج اور اسے لگا آج وہ واقعی ڈوب گیا ہے۔

☆.....☆

وہ پورے ایک ہفتے بعد آفس آیا تھا اور اس پورے ایک ہفتے تک دونوں نے ہی ایک دوسرے سے رابطہ نہ کیا تھا۔ اس کے آفس آتے ہی سیویم نے اسے اپنے روم میں بلایا تھا۔ روم کا دروازہ کھولتے ہی سامنے ہی اس کی نظر اس پر پڑی تھی جو گلاس ونڈو کے پار بھاگتے دوڑتے مناظر پر خالی ذہن نظر جمائے ہوئے تھی۔ اس کی آہٹ پر وہ پلٹی تھی۔ شیٹ کی نگاہ اس کے چہرے پر ٹھہر گئی تھی ہمیشہ ٹھکھلاتا چہرہ پڑا مردہ ہو گیا تھا۔ آج اپنے ساتھ اس نے ایک اور زندگی برباد کر دی تھی۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ سب کچھ یوں ہو جاتا تھا تو شاید وہ یہاں کبھی آتا ہی نہ۔ لمحے بھر کو وہ دونوں ساکت ہو گئے تھے۔ ایک کی آنکھوں میں پشیمانی تھی تو دوسرے کے دکھ اپنے اپنے احساسات میں گرفتار وہ دونوں میلوں دور جا چکے تھے۔ اس نے ٹیبل کی جانب قدم بڑھائے تھے۔ اس پر سے وائٹ لفافہ اٹھا کر اس کی جانب بڑھایا تھا۔

”تمہارا ریزائن لیٹر۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا جسے اس نے بنا کچھ پوچھے تھا مایا تھا۔ کچھ دیر وہ اسے دیکھتی رہی گہری خاموشی اس کی آنکھوں میں آنکھیں تھیں۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ اس پر ترس کھائے جو بربادی کا سامان سمیٹے ہوئے تھا۔ یا خود پر اسے سب کچھ دے کر بھی خالی تھی۔

”تم جا سکتے ہو۔“ ایک گہری خاموشی کے بعد اس نے حکم دیا تھا۔ وہ جس کا وجود کسی روبوٹ کی طرح ہو گیا تھا اس کے حکم کی تعمیل کرتا ہوا پلٹ گیا تھا۔ جب تعلق ہی نہ تھا تو وہ کیا کہتا اس کے جاتے ہی اس کے اندر ٹھہرا ہوا طوفان آنسوؤں کی صورت میں رخساروں سے بہہ گیا تھا۔ وہ تھک گئی تھی اس کے مردہ وجود کو ٹھہرتے ٹھہرتے اسے معلوم تھا اس نے کبھی بھی خود سے کوئی فیصلہ نہیں لینا تھا۔ درد کی بھٹی میں خود کو یونہی جلاتے رہنا تھا۔ اس لیے کسی ایک کو فیصلہ لینا تھا جو مشکل تھا مگر کسی ایک کی زندگی کے لیے بہتر ہونا تھا اب نہ جانے نقصان کس کا کتنا ہوا تھا۔ اس کو تو لے کے لیے کوئی ترازو نہ تھا۔

☆.....☆

بلیک پینٹ شرٹ کے اوپر اس نے اسکن لائنگ کورٹ پہنا ہوا تھا۔ ساتھ ہی بلیک اور اسکن امیترج کے مفلر کو گلے پر اچھی طرح لپیٹا ہوا تھا۔ شدید ٹھنڈ سے بچنے کے لیے اس نے مکمل تیاری کی ہوئی تھی۔ بلیک ہائی ہیل کی کوٹ شوز پہنے وہ بھاری قدموں کے ساتھ اس کی جانب بڑھی تھی جو اس کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ اس کے سامنے آنکھڑی ہوئی۔ آنکھوں پر گہرے براؤن رنگ کے گلاس جڑھا کر اس نے آنکھوں کی نمی اور تاثرات کو چھپا لیا تھا۔ وہ دونوں آج آخری بار مل رہے تھے۔ اس وعدے کے ساتھ کہ اب کبھی ایک دوسرے کے سامنے نہیں آئیں گے۔ یہ شرط بھی سیویم نے ہی رکھی تھی۔ دونوں کے بیچ ایک ایسی خاموشی آٹھری جو منتظر تھی کہ بات کی ابتداء کون کرے گا۔ اسے تو کبھی نہیں کرنی تھی پشیمانیوں کے سوا کچھ نہ تھا اس کے پاس۔



”فلائٹ کب کی ہے؟“ اپنے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”ایک گھنٹے بعد۔“ جب کہ اس کا لہجہ خاموش تھا۔

”یقیناً میلبرن تو اب کبھی نہیں آوے گا۔“ وہ پھیکا سا مسکرا کر بولی تھی ایک طنز کے ساتھ۔

”ایسا کیوں سوچا تم نے؟“

”میں نے سوچا نہیں ہے مجھے معلوم ہے اور شاید یہی سچ ہے۔“ وہ بے دردی سے بولی تھی۔ پھر وہ کچھ نہ

بولا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے پر وہ روئی نہ مضبوطی کا ایک خول تھا جو خود پر چڑھا لیا تھا۔

”شیٹ! مجھے نہیں معلوم کہ ہم دوبارہ کبھی ملیں گے کہ نہیں۔ پر سچ پوچھو تو میری دعا ہے ہم ایک دوسرے

کے سامنے کبھی نہ آئیں، تم میں شاید حوصلہ ہو پر مجھ میں حوصلہ نہیں ہے کہ اپنی محبت کو کسی اور کے ساتھ

دیکھوں۔“ اس نے سفاک لہجے میں کہا اور وہ چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا۔

”جانتے ہو جب بھی تمہیں اجاڑ دیکھتی تھی تو بڑا رشک آتا تھا اس پر کچھ تو تھا اس میں ایسا کہ تم زندہ نہ

رہے۔ جس ماحول میں، میں پلی بڑھی ہوں وہاں کسی کو چھوڑ کر دوسرے کو اپنا لینا بڑی عام بات ہے۔ مشینی

انداز میں زندگی گزارتے لوگوں کے جذبات بھی جیسے مشین بن گئے ہیں اس لیے کبھی یہ گمان ہی نہ ہوا دل

مشین نہیں ہے کہ جب خراب ہو گیا تو ریپر کروا کر دوبارہ سے نئے جذبات منتقل کر لو، مجھے آج یقین آ گیا

ہے اس کا دل اتنا تو صاف اور معصوم ہو گا جس نے اتنے دور ہونے کے باوجود تمہیں بے چین کر رکھا ہے۔“

وہ متانت سے بولتی اسے حیران کر گئی تھی ایسی حقیقت جس سے وہ منہ چھپاتا پھرتا تھا اور وہ کھلا اظہار کر رہی

تھی۔ بڑا مشکل ہوتا ہے اپنی محبت پر کسی اور کی محبت کو سبقت دینا پر اس نے اعتراف کیا تھا جواب میں اس

کے پاس کوئی لفظ نہ تھا۔ پشیمانی ہی اس کا جواب تھی۔

”میں تم سے کوئی شکوہ شکایت نہیں کروں گی، اس کا ملال ہی کیا جو میرا تھا ہی نہیں۔“ اس نے بڑی صاف

گوئی سے کہا تھا اور لہجہ خود بخود نرم ہو گیا۔

”آئم سوری۔“ اس کی نگاہ اس کے آسودہ چہرے پر جمی ہوئی تھی اور اسے لگا وہ مزید پستی میں چلا گیا ہو۔

معافی کے یہ الفاظ بے اختیار اس کے منہ سے نکلے تھے۔ کیونکہ خود کو تو وہ اس قابل بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔

”اوپلیز۔“ اس نے فوراً ٹوک دیا تھا۔

”چلتی ہوں اپنا خیال رکھنا۔“ اس سے مزید ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ جاتے ہوئے بے اختیار اس کے

گلے سے لگی تھی۔ چند موٹی ٹھہرے ہوئے تھے جو رخساروں سے بہہ گئے تھے جنہیں وہ اس سے چھپائی تیزی

سے الگ ہوئی تھی اور اپنی مخصوص مسکراہٹ اسے دیتی ہوئی واپس پلٹ گئی تھی۔ سانسوں میں اترتی اس کی

خوشبو نے اسے اندر تک جھنجھوڑ دیا تھا۔ وہ خاموش سا اسے جاتا دیکھتا رہا تھا۔

☆.....☆

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے اپنے گلاس اتار پھینکے تھے اور خود پر باندھے ضبط توڑ دیے تھے اب تنہائیوں

کے دشت میں چلنا تھا ریت کی دھوپ نے اس کے وجود کو کھلسا دیا تھا، سیل در داس کے رگ و پے میں اترنے

لگا تھا، اتنا آسان نہ تھا جتنا اس نے سمجھ لیا تھا، اماؤس کی رات اس کی زندگی میں بھی اتر آئی تھی، جسے زندگی سمجھ

رہی تھی وہ تو بس محبت کا گمان تھا۔

☆.....☆



جہاز کی کھڑکی سے باہر اس کی نگاہیں چھوٹی ڈبیوں کی صورت اختیار کرتی دنیا پر جم سی گئی تھیں۔ ایک نئی پرواز آج پھر اڑنے جا رہا تھا وہ نجانے اب کامیابی نے مقدر بننا تھا یا ناکامی نے وہ کتنی ہی دیر تو پچھلے گزرے ماہ و سال کا سیاق و سباق ہی کرتا رہا تھا۔ زندگی میں کیا پاتا تھا اور کیا پایا اور کیا پا کر کیا کچھ کھو دیا تھا۔ سوالوں کی اب بھی گتھیوں نے اسے بھی الجھا دیا تھا۔ انسان بڑا عجیب ہوتا ہے۔ انسان بے لگام مادی خواہشوں کے پیچھے بھاگتا ہے کامیاب ہوتا ہے تو فخر سے خود کو سراہتا ہے اور جب ناکامی مقدر بن جائے تو سب مورد الزام قسمت کو ٹھہراتا ہے۔ تو کیا اس نے بھی اس بات کی تیاری کر لی تھی۔ اپنی ناکامیوں کے الزام قسمت کی جھولی میں ڈالنے تھے۔ ضمیر نے اسے جھنجھوڑا تھا اور خود کو جھٹکے سے اس نے نفی کی تھی۔ وہ تسلیم کرتا تھا کہ وہ کسی کے صاف دل سے وہ کھیل گیا تھا۔ ایسا نہ تھا کہ اس نے کبھی محبت کی ہی نہ تھی۔ محبت تو بلکہ کی ہی اس سے تھی لیکن محبت اس کی مادی خواہشوں کے آگے دب سی گئی تھی۔ سیویم نے اسے دیکھا نہ تھا پر اس نے اس کے لیے رائے بہت ٹھوس دی تھی اس کا دل صاف تھا معصوم تھا پاک تھا۔ مادی چیزوں سے پاک تھی وہ نہیں جانتا تھا اس کی زندگی کے کیا قصے تھے۔ پراتنا جانتا تھا خوشی اور مسکراہٹیں اس کی دوست نہ بنتی تھیں، کبھی غلطی سے مسکرا دینے والی یوں لگتا تھا کوئی بڑا احسان کرتی ہو وہ اپنے آپ کو راز میں رکھتی تھی۔ اس کی ذات اتنی ہی راز تھی جیسے سمندر میں چھپا خزانہ، ہاں شاید وہ اس راز کو جان لیتا تو اس مقام پر آج کھڑا بھی نہ ہوتا اور اس کا وجود بھی ایک مرد کی محبت کے آگے ڈھیر ہو گیا تھا۔ پھر وہ کیسے پر باد نہ ہوتا دلوں سے کھیلنا اتنا آسان ہوتا تو شاید محبت کی کبھی تاریخ نہ لکھی جاتی، محبت کبھی اپنا وجود نہ بنا پاتی، اس نے تھکے ہوئے مسافر کی طرح بیک سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندھ لی تھیں۔

☆.....☆

جس وقت وہ نگہت کے گھر پہنچا گھر میں سے ڈھولک اور تالیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ بل بھر میں سمجھ گیا تھا یقیناً یہ زارا کی شادی کے ہنگامے تھے۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ یعنی آپانے اسے نہیں بلایا تھا۔ وہ بلا تیں بھی کیسے زارا کی ضد کے آگے اسے لگا زمین نے اس کے قدم جکڑ لیے ہوں۔ سب کا سامنا کرنا اتنا آسان بھی نہ تھا، جوں جوں اس کے قدم اندر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہر ایک کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آرہا تھا۔ اسے کسی چیز کا اتنا خوف نہ تھا۔ جتنا خوف اس بات کا تھا کہ وہ اگر وہاں ہوئی تو وہ کیسے آنکھ ملا پائے گا وہ الجھے ہوئے احساسات میں گھرا اندر داخل ہو گیا تھا۔ ہال لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے سب کو بغور دیکھا تھا مگر وہ نہیں تھی وہاں، اس کی آمد پر کئی گردنیں اس کی جانب اٹھی تھیں اور پھر سب ساکت ہو گیا جیسے تالیوں اور ڈھول کی آواز سے گونجتا گھر یکدم سنائے میں تبدیل ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں مہمان رخصت ہو گئے اور وہ مجرم بنا گھر کے تین افراد کے بیچ میں بیٹھا تھا۔

”یہ کس منہ کے ساتھ آئے ہیں اور کیا لینے آئیں ہیں اب۔“ زارا نفرت سے بولی تھی اپنے ماں باپ سے۔

”زارا! آپ چپ رہیے۔“ امجد صاحب نے بیٹی کو تنبیہ کیا۔

”پاپا.....!“ وہ حیرت سے بولی تھی۔

”میں نے کہا ناں۔“ اب کے وہ سختی سے بولے اور وہ نفرت سے سر جھٹک گئی۔ نگہت کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ وہ شیٹ کی طرف متوجہ ہوئے۔



”دیکھو شیٹ! یہ تمہاری بہن کا گھر ہے میں تمہیں کبھی بھی یہاں آنے سے نہیں روکوں گا مگر ایک بات اچھی طرح سمجھ لو، میں اب مزید کوئی بد مزگی نہیں چاہوں گا۔“ امجد صاحب نے دو ٹوک کہا وہ کافی صلح جو انسان تھے۔ انہوں نے سختی سے کہا تھا مگر اپنی عادت کے خلاف وہ اسے دو ٹوک کہہ کر اٹھ گئے تھے۔ زارا بھی نہ رکی۔ وہ سر جھیکائے بیٹھا رہا خود کو اس رویے کا وہ حق دار سمجھتا تھا پر بہن تو ماں جانی تھی۔ اسے یوں بکھرا ہوا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھتا تھا۔

”شیٹ! کیوں آئے ہو واپس تمہارے لیے اب کچھ بھی نہیں بچا جس کے لیے آئے ہو، وہ تو اب یہاں ہے بھی نہیں۔“ وہ نم آنکھوں سے اسے بغور دیکھ رہی تھیں جس کے چہرے پر خاموشی تھی۔ وہ چپ رہا وہ اسے دیکھتی رہیں۔ پھر اس نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

”میں صرف اس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔“ اس کا چہرہ بے تاثر تھا اور لہجہ ٹھوس مگر انہوں نے بہت کچھ اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ سنہری چمکتی آنکھیں سرد پڑ چکی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر چپ سی ہو گئیں۔

☆.....☆

”نہ جانے کہاں سے آپ میں اتنی ہمت آگئی۔“ وہ رات کے پہر لان میں کھڑا تھا جب عقب سے زارا کی تیز آواز ابھری، وہ پلٹا تھا اس کی طرف اس کی نگاہ زارا کے اداس چہرے پر پڑی تھی۔ وہ بظاہر جتنی بھی کٹھور بن جاتی پر شیٹ میں اس کی جان تھی اس نے بہت اس کے لاڈ اٹھائے تھے۔ محبت کے معاملے میں جب وہ شدت پسند تھی تو ناراضی بھی اتنی ہی شدت سے کی تھی۔

”آپ کو کیا لگتا ہے ماموں! کیا غلطیوں کا مداوا اتنا آسان ہوتا ہے کہ معافی مانگو اور سب پہلے جیسا ہو جائے ہو سکتا ہے کہ کفارے تکلیف پر کچھ مرہم کا کام کر دیں مگر میں سمجھتی ہوں طوفان کے گزرنے کے بعد اس کے اثرات ضرور رہ جاتے ہیں۔“ وہ ہر لفظ چبا کر ادا کر رہی تھی اور وہ چپ چاپ اسے سن رہا تھا۔

”کتنی عجیب بات ہے ماموں! آپ کو ہمیشہ ہر چیز مکمل اچھی لگتی تھی، عمل کے ساتھ تعلق بھی اس لیے توڑا کہ شاید وہ آپ کی نظر کے ترازو میں مکمل نہ تھی۔ ظاہر ہے ایک غریب عام سی لڑکی آپ کو کیا دے سکتی تھی۔ پر کل جب آپ اس سے ملیں گے تو غور ضرور کیجیے گا کہ اب وہ مکمل ہے یا نہیں۔“ اس کا طنز میں ڈوبا لہجہ بالکل سچ تھا مگر ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ اس نے کبھی بھی سیویم اور نمل کا مقابلہ نہیں کیا تھا، سیویم دوست تھی اور نمل محبت اگر وہ میلو رن گیا تھا تو صرف اپنے لیے اپنے آپ کو مکمل بنانے کے لیے دولت، عزت، تعلیم وہ خود کو ہر طرح سے مکمل دیکھنا چاہتا تھا، خود کو مکمل کرتے کرتے اس نے اتنا ادھر وارہ جانا تھا اس کا تصور نہیں کیا تھا اس نے۔

”ماموں! کیا کھیلا ہے آپ نے زندگی سے بہت کچھ پانے کے چکر میں سب کچھ گنوا تے ہی چلے گئے۔“ اب کے اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور ایک کھوکھلی ہنسی کے ساتھ وہ بولی تھی۔ یہ کمی اس کے دیئے ہوئے دکھ کی نہ تھی بلکہ اسے یوں اجاڑ دیکھ کر دکھ خود بخود اس کے اندر اتر گیا تھا۔ وہ اندر کی طرف پلٹ گئی اور وہ خاموش اسے جانا دیکھ کر رہ گیا تھا۔

☆.....☆

وہ گھٹ کے ساتھ کے گاؤں بھٹ شاہ روانہ ہوا تھا۔ وہ اب یہاں نہیں رہتی تھی۔ کیوں؟ یہ جاننے کی کم از کم اس میں جرات نہ تھی۔ دوران سفر آپا نے خود ہی اسے بتا دیا تھا فرحت کی جس سے شادی ہوئی تھی انہوں



نے خاندانی مسائل کی وجہ سے اسے شہر میں ہی رکھا تھا پر کچھ ہی عرصہ قبل وہ نمل اور فرحت کو لے گئے تھے۔ آپا اسے کافی تفصیلات بتاتی رہی تھیں۔ پر اس کا دماغ ایک ہی نقطے پر اٹک گیا تھا۔ وہ بس اتنا جانتا تھا نمل باپ کی شفقت سے محروم تھی۔ وہ زندہ تھے یا نہیں اس بات کو اس نے کبھی جاننا چاہا ہی نہیں، اس کی پرورش نانا نانی اور ماں کے سائے تلے ہوئی تھی اس کے باپ کا تعلق کہاں سے تھا۔ کون تھا؟ نہ اس نے جاننا چاہا اور نہ اس نے بتایا پر اب اچانک یہ انکشاف حیرت زدہ تھا۔ اس کی محبت صرف لفظوں تک تھی۔ کسی نے اسے جھنجھوڑا تھا۔ اس کی زندگی کے کیا مصائب تھے کبھی اس نے جاننا ہی نہ چاہا وہ سوچتا سوچتا مزید پستی میں چلا گیا تھا۔

پر پیچ سفر کا اختتام قریب تھا۔ بھٹ شاہ کے گاؤں کی حدود میں جب داخل ہوئے تھے شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔

”شیٹ! شاہ جی کے مزار پر روکنا فاتحہ پڑھ کر جائیں گے۔“ ان کے کہنے پر شیٹ نے اثبات میں گردن ہلائی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ لوگ مزار کے سامنے تھے۔ نیلے روغنی ٹائیلز سے بنا مزار ڈھلتی شام کے وقت روشنیوں سے جگمگا اٹھا تھا۔ اس نے گاڑی سے نکلنے پر طائرانہ نگاہ ڈالی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی مزار پر آیا تھا وہ اس مشہور ہستی کے بارے میں پڑھ اور سن چکا تھا اور آج حقیقی طور پر وہ اس پاک ہستی کے در پر تھا۔ وہ لوگ اندر کی جانب بڑھ گئے تھے۔ لوگوں کے ہجوم کو گراں کرتے ہوئے وہ لوگ پہنچے تھے۔ وہ فاتحہ پڑھنے کے بعد باہر آ گیا تھا۔ جب کہ نگہت ابھی دعا مانگ رہی تھیں۔ شام کے ملگجے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ مزار کے کشادہ سخن میں لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ شاہ کا کلام سننے کے لیے تین عمر رسیدہ آدمی جو سیاہ چوغے میں ملبوس، رنگ برنگی موتیوں کی مالا پہنے فقیری حلیے میں تھے سر اور داڑھی کے بال بڑھے ہونے کی وجہ سے وہ کوئی ملنگ معلوم ہوتے تھے۔ وہ ان سب پر بغور نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا اور ایک گھنے درخت سے ٹیک لگا کر نگہت کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں ان تین ملنگوں کی آواز ہوا میں رقص کرنے لگی تھی۔ وہ ایک ہی آواز میں پڑھتے کوئی سحر پھونک رہے تھے۔ اس کی بھی توجہ ان کی جانب خود بخود مبذول ہو گئی تھی۔ کلام کی تاثیر بھی کہ ماحول میں ایک روحانیت سی اتر رہی تھی۔ لوگ مدہوش ہو گئے تھے۔ ہوا میں رقص کرتی ان کی آواز خوب صورت کلام کے ساتھ پر سوز معلوم ہوتی تھی۔

وہی ایک شایانِ جود و سخا ہے

ہر اک آدمی اس کے در کا گدا ہے

وہ شاہ کا کلام پڑھ رہے تھے۔ وہ سنتے ہی سمجھ گیا تھا اس نے اس کا ترجمہ پڑھا ہوا تھا پر ایسا لگ رہا تھا وہ پہلی بار سن رہا ہونہ جانے ان کے پڑھنے کا ہنر اتنا کمال کا تھا کہ وہ خود بھی اس ماحول میں گم ہو گیا تھا۔

وہ کلام کے ہر لفظ کو بغور سن اور سمجھ رہا تھا۔ ہر ایک لفظ حقیقت میں ڈوبا تھا۔ وہ روحانیت سے واقف نہ تھا۔ خدا اور بندے کی محبت کا تعلق کیا ہے، اس نے کبھی اس بات پر غور نہ کیا تھا مگر یہاں کھڑے وہ اس حقیقت کو آج محسوس کر رہا تھا۔ شاید اس جگہ کی مٹی بھی اس بزرگ کی محبت کی گواہی دے رہی تھی کہ یہاں کی ہوا میں بھی ایک سکون سا محسوس ہوتا تھا۔

کلام ایک بل کے لیے قہم سا گیا تھا۔ اسے لگا جیسے کسی نے اسے آئینہ دکھا دیا ہو، جس میں اس کا چہرہ سیاہ نظر آ رہا تھا۔ ہاں وہ پشیمان تھا بے چین تھا، مضطرب تھا، اس نے خود سے سب اعتراف بھی کر لیے تھے اور



جس کے پاس آج وہ جا رہا تھا اپنی اسی ندامت کے تحت پران سب میں وہ ایک ہستی سے غافل تھا اس نے ایک مرتبہ بھی اس کے بارے میں نہیں سوچا تھا جس نے اسے پیدا کیا اس کی قسمت لکھی اس نے آزمائش میں ڈالا، اس کے گناہ پر اس کے دل کو مضطرب کر دیا تھا کیوں کس لیے وہ کیا سمجھنا چاہ رہا تھا۔ وہ بھٹکتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ تھک گیا پھر بھی اس کے آگے سجدہ کیا وہ تو ہر چیز کو پرفیکٹ دیکھنا پسند کرتا تھا، اس بات سے غافل ہر چیز نامکمل ہے خدا کے علاوہ کیا وہ صرف اس بات کی وجہ سے پکڑ میں آ گیا تھا؟ ضمیر نے جھنجھوڑ کر اس سے پوچھا وہ پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ سوچوں کا اثر دھام تھا یا خدا کا خوف طاری ہو گیا تھا۔ وہ اپنی کیفیت سے انجان تھا۔ دماغ کی ایک گرہ کھلی تھی اور وہ چند لمحے میں سمجھ گیا تھا۔ ماضی کا ایک ایک منظر آنکھوں کے آگے لہرا رہا تھا۔ وہ جو ڈیڑھ سال سے خوار ہو رہا تھا۔ سب کچھ پا کر بھی وہ مضطرب تھا۔ اس کی وجہ شب و روز ڈھونڈتا تھا اور آج صرف چند لمحے لگے تھے۔

وہ سمجھتا رہا تھا اسے بد دعا ہے اس بات سے بے خبر ایک بد دعا تو خود اس نے اپنے لیے تیار کر لی تھی اس کی سوچ اسی کے لیے بد دعا بن گئی تھی، اپنی بربادی کا سامان وہ خود اپنے ہاتھوں سے جمع کرتا رہا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں تھیں مضطرب سی پشیمان سی ایک غفلت بھری زندگی گزارتا آیا تھا وہ، اب تک یہ سوچ کر اس کے اعصاب منجمد ہو گئے تھے۔ وہ بے بہرہ تھا صرف بے بہرہ۔

”چلو شیٹ۔“ نگہت کے پکارنے پر وہ چونکا تھا سوچیں یکدم معدوم ہو گئی تھیں مگر اس کا وجود پتھر کا سا ہو گیا تھا۔ اسے لگا شاید اب اس کے قدم بھی اٹھ نہ پائیں گے۔

☆.....☆

ایک بڑی حویلی کے آگے اس نے گاڑی روکی تھی۔ نگہت یہاں آتی جاتی رہتی تھیں انہیں یہ راستہ اچھی طرح از بر تھا۔ نگہت نے اسے گاڑی سے اترنے کا کہا تھا اور وہ بھی کسی روبوٹ کی طرح ان کے پیچھے چل دیا تھا۔ لوہے کے بڑے سے آہنی گیٹ کے باہر دو گارڈز اسلحے سے لیس کھڑے تھے۔ نگہت کو پہچاننا ان کے لیے مشکل نہ تھا۔ انہوں نے سلام کر کے ان کے لیے گیٹ کھول دیا تھا۔ وہ گھر کے بیرونی احاطے میں داخل ہوئے جو وسیع ترین تراشیدہ گھاس پر مشتمل تھا۔ بڑے بڑے آم، ناریل، برگد اور مختلف قسم کے پیڑ ہوا کے زوروں پر جھوم رہے تھے۔ دائیں جانب سفید ماربل کا آبشار بنا ہوا تھا جس کا تیز بہتا پانی خاموشی میں رقص پیدا کر رہا تھا۔ دیواروں سے لپٹی بوگن ویلیا کی بیلوں نے دیوار کو چھپا دیا تھا۔ بائیں جانب بیٹھنے کے لیے لکڑی کی کرسیاں اور ٹیبل کرسیاں ٹیبل رکھے ہوئے تھے جس کے اطراف میں خوب صورت پودوں کو تراش خراش سے سجایا ہوا تھا۔ گھر کے احاطے کو لان کی شکل دے دی تھی۔ احاطے کے وسط میں لال اینٹوں سے راستہ بنایا ہوا تھا جو گھر کے اندرونی دروازے کی طرف جاتا تھا۔ لان کے بعد پورچ کا حصہ شروع ہو جاتا تھا چکنے ماربل پر قطار سے چمچاتی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں، اس نے کسی بھی چیز کو بغور نہیں دیکھا تھا۔ وہ واقعی کسی روبوٹ کی طرح چل رہا تھا۔ اس کا دماغ کسی اور ہی کشمکش میں گرفتار تھا۔ وہ لوگ جب اندر داخل ہوئے تو پورا ہال لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ لوگوں کی جج دھج پھولوں اور برقی قمیصوں سے سجاوٹ وہاں کسی تقریب کا ہٹا دے رہی تھی۔ فرحت کی نظر معاً ان پر پڑی وہ فوراً ان کی جانب بڑھی تھیں مسکراتے ہوئے انہوں نے جھٹ نگہت کو گلے لگا لیا تھا نگہت بھی دل سے مسکرائیں تھیں فرحت کی نگاہ شیٹ پر پڑی تھی اسے دیکھ کر وہ کھل اٹھی تھیں۔



”تم نے بتایا نہیں شیث آیا ہوا ہے۔“ انہوں نے اس کے سر پر پیار دیا تھا پر مخاطب نگہت سے تھیں۔ اسے ایک جھٹکا لگا تھا۔ فرحت کے اس رویے کی کم از کم وہ امید رکھ کر نہیں آیا تھا۔ نگہت بس جواباً مسکرا دی تھیں۔

”اچھا چلو اندر بیٹھتے ہیں یہاں بہت رش ہے۔“ وہ انہیں ڈرائنگ روم کی طرف لے کر بڑھ گئی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں ملازم نے انہیں ٹھنڈا مشروب پیش کیا۔

”اصل میں آج میری جھٹانی کے بڑے بیٹے کی مہندی ہے، سب ابھی لڑکی والوں کی طرف جارہے ہیں۔ اس لیے افراتفری کا عالم ہے۔“ انہوں نے وضاحت دی۔ شیث ابھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کئی سوال اسے الجھا گئے تھے۔ ان کا محبت بھرا انداز اسے چونکا رہا تھا۔ کیا وہ انجان تھیں حقیقت سے یا اپنا اندر چھپا رہی تھیں۔ پروہ کس مشکل سے ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ وہی جانتا تھا۔

”تم کب واپس آئے ہو شیث؟“ وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

”جی پچھلے ہفتے۔“ وہ بڑی مشکل سے بولا۔

”ویسے تو نگہت سے میں تمہاری خیریت پوچھتی رہتی تھی پر جب تک آنکھوں سے نہ دیکھو کہاں تسلی ملتی ہے۔“ وہ اپنے مخصوص محبت بھرے انداز سے بول رہی تھیں اور ان کے اس انداز پر وہ شرمندگی سے زمین میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔

”بی بی! صاحب بلا رہے ہیں۔“ ملازمہ اندر آئی تھی اور بڑی عجلت میں فرحت کو پیغام دے کر گئی تھی۔

”میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ باہر کی جانب بڑھ گئیں۔

”آپا! کیا آپ نے انہیں سب بتا دیا تھا۔“ وہ نگہت کی طرف متوجہ ہوا تھا اور وہ ایک پل کو اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

”تمہیں معلوم ہے وہ دل کی مریضہ ہیں اور نمل کے لیے بے حد حساس، ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے تھے اور تمہارے لیے بھی بہتر ہوگا اسے اس خوش فہمی میں رہنے دو۔“ ان کا لہجہ خود بخود سرد ہو گیا تھا اور آگے وہ مزید کچھ نہ بول پایا تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ ڈھلتی سیاہ رات کے اندھیرے میں وہ اپنا آشیانہ تلاش کرتا رہا ہو اور جب دھوپ ملی تو سائبان ہی کھودیا۔ وہ زندگی کو خواب کی طرح گزارتا رہا اور جب آنکھ کھل ہی گئی تو وہ آشیاں سے بھی محروم ہو گیا تھا اسے لگا جیسے اس پر کنکروں کی بارش ہو رہی ہو۔ اس سے وہاں بیٹھنا اب مشکل ہو رہا تھا۔ اتنے میں فرحت اندر داخل ہوئی تھیں۔

”نگہت! تم لوگ فریش ہو جاؤ، میں کھانا لگوا دیتی ہوں۔“

”ارے نہیں بالکل بھوک نہیں ہے۔ تم اس تکلف میں مت پڑو۔“ انہوں نے صاف کہا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہواتنے لمبے سفر سے آئی ہو۔ شیث کو بھی بھوک لگی ہوگی۔“

”نہیں آنٹی پلیز! آپا ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولا تھا ساتھ ہی ایک فون کال کا بہانا کر کے وہ نکل گیا۔ اندر اس کا سانس گھٹنے لگا تھا۔ اسے اپنا آپ انتہائی چھوٹا لگ رہا تھا۔ وہ اپنے عمل سے بے خبر رہتا تو شاید اتنی تکلیف نہ ہوتی مگر اب تو عمل کسی آئینے کی طرح اس کا اصل بتا چکا تھا۔ وہ ہال سے گزرتا، باہر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ہال مکمل طور پر خالی ہو چکا تھا۔ سب ہی لوگ مہندی لے کر روانہ ہو گئے تھے۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج قائم ہو گیا تھا۔ اس نے ابھی دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ ملازم کی پکار



پر تھم سا گیا تھا۔

”صاحب!“ اس کی آواز پر وہ پلٹا۔

”بی بی کہہ رہی ہیں آپ آرام کر لیجیے آپ کا کمرہ تیار کر دیا ہے، آئیے میں دکھا دوں۔“ وہ ادب سے بولا۔ وہ بے بس سا ہو گیا۔

”آئیے صاحب!“ ملازم نے اسے ہنوز کھڑا دیکھ کر کہا۔

ہار کر وہ ملازم کے پیچھے چل دیا۔ ہر اٹھتے قدم پر اس کا دل بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بہت ہمت کر کے آتو گیا تھا مگر اب لگ رہا تھا وہ شاید سب ہمتیں گنوا چکا ہے۔

شاید وہ کبھی اتنا نادم نہ ہوتا اگر اسے یہ احساس نہ ہوتا کہ جن کی زندگیوں کے ساتھ اس نے کھیلا ہے وہ کوئی عام سے نہیں تھے۔ ان کی سادگی اس کے لیے سب سے بڑی سزا بن گئی تھی۔ ہال کے دائیں جانب کے آخری سرے پر سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو اوپری منزل کی جانب جاتی تھیں۔ ملازم اسے اسی طرف لے کر بڑھا تھا بلاشبہ وہ ایک خوب صورت حویلی تھی۔ جس کی سجاوٹ سے دولت کی ریل پیل کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ اوپر کے حصے میں وہ داخل ہوا اور ایک نگاہ اطراف میں ڈالی جہاں وہ کھڑا تھا وہ بڑا سا ہال تھا۔ ہال کی چھت پر کینچ کا بنا فینسی فانوس لٹکا دو دھیار وشنیاں بکھیر رہا تھا۔ ہال کے دائیں اور بائیں جانب قطار سے چار پانچ کمرے بنے ہوئے تھے۔ دیواروں پر ہلکے اسکن پینٹ پر خوب صورت پینٹنگز اور تصویریں آویزاں تھیں اور ہال کے وسط میں سنگ ایر یا بنایا ہوا تھا۔ ہر چیز خوب صورت اور نفاست سے سجائی گئی تھی۔ ملازم اسے اس کا کمرہ دکھا کر چلا گیا تھا۔ وہ ہال پر نظر ڈالتا ہوا زارا کی بات سوچ رہا تھا۔ اس کے طنز کا مطلب وہ اب سمجھ گیا تھا لیکن یہ کبھی ایک حقیقت تھی اس نے نمل سے محبت بنا کسی حرص کے کی تھی، جب وہ مال و دولت کی حیثیت میں کم تھی، تب بھی اور آج بھی وہ اس کے لیے ایک ہی جذبہ رکھتا تھا، اس نے اسے کسی کے لیے نہیں چھوڑا تھا بلکہ اپنی خواہشوں کی عوض وہ بھٹکا تھا اور بھٹکے ہوئے مسافر کو کس مشکل سے منزل ملتی ہے اس کا اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جب بے اختیار اس کی نظر ہال کے آخری سرے پر پڑی تھی۔ وہ سینکڑوں روم تھا جس کے دروازے پر کرشل کی لڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ جس کی اوٹ میں اسے کسی شناسا کی جھلک نظر آئی تھی۔ وہ بے آواز قدموں سے آہستہ آہستہ اس جانب بڑھا ہر قدم پر اس کی دھڑکن کی رفتار تیز ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے وجود سے اٹھتی خوشبو کو تو وہ کسی بھی ہجوم میں بھی پہچان سکتا تھا۔ تو اب کیسے فراموش کر دیتا، وہ چوکھٹ پر آکھڑا ہوا تھا اور زمین نے جیسے اس کے قدم جکڑ لیے تھے اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے لگا تھا۔ وہ اسے کیسے محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس کی سلگتی آنکھوں میں ایک سمندر کی طرح ہر لحظہ اترتی تھی جس کی یاد مٹانے کے لیے جام اٹھا کر وہ میخانوں کا رخ کرتا تھا۔ پر یادوں کی پیاس تب بھی نہ بجھتی تھی۔ اس کی حزن غم آنکھیں اس کی ذات میں خم ڈالتی ہر پل ابر تانے رکھتی تھیں۔ اپنے سلگتے جذبات کو بھانے کے لیے اپنے مکان کو پانی میں رکھ دیا تھا پر بجھنے کے بجائے سب ڈوب گیا تھا۔ ہر گزرتا لمحہ اس کے دماغ کے پردے پر لہرا رہا تھا اس کی اذیتیں اس کی بے چیریاں، بے تابیاں بے حساب تھیں، وہ مٹی کے ڈھیر کی طرح بکھر گیا تھا۔ ہجر کی پیاس بھانے کے لیے وہ اس کے ایک دید کے قطرے کے لیے بھی ترستار ہا تھا، پر آج دید کا یہ لمحہ بھی کم لگتا تھا۔ وہ اسے یک ٹک دیکھتا رہا جس کی آنکھیں بند تھیں اور لب ہلتے تھے اور سر بارگاہ الہی کے آگے جھکا ہوا تھا اس کے چہرے پر الوہی چمک تھی۔ اس کا محور



عبادت میں گم تھا۔ وہ ارد گرد سے بالکل غافل تھی جب کہ وہ گزرتے وقت سے بے نیاز کھڑا تھا۔ نہ جانے انسان کیوں ٹھوکر کھا کر ہی سنبھلتا ہے، اس کے دل نے گلہ کیا تھا۔ وہ آج جتنی قیمتی لگ رہی تھی آج سے پہلے اس کی ویسی قدر و قیمت نہ تھی۔ وہ اگر اسے پانے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا تو اسے کھونے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتا تھا انسان کسی ڈوری کی طرح ایک دوسرے سے بندھ جاتا ہے۔ اس کے احساسات جذبات کسی ایسے انسان سے بندھ جاتا جس سے کوئی رشتہ نہ ہو یہ قدرت کا ایک کرشمہ ہی ہے۔

اس نے دعائے ننگے کے بعد منہ پر ہاتھ پھیر کر جائے نماز لپیٹ دیا تھا پر نگاہیں باہر کھڑے وجود پر نہیں ڈالی تھیں۔ حالانکہ اس کی آمد کو اس نے محسوس کر لیا تھا۔ اس کے وجود میں جنبش نہ ہوئی۔

”تم اندر آ سکتے ہو شیٹ۔“ وہ اس کی جانب بنا پلٹے بے حد عام سے لہجے میں بولی۔ اس کی آواز پر وہ ہوش میں آ گیا تھا جیسے..... لیکن قدم اندر کی جانب نہ بڑھ سکے۔ یوں لگتا تھا قدموں پر کوئی پہاڑ آگرا ہوا اس کے ہنوز کھڑے رہنے پر وہ پلٹی تھی۔ ایک طویل یاہ و سال کے بعد وہ روبرو کھڑے تھے اس کی آنکھوں میں وہ دیکھ نہ پایا تھا جب کہ وہ منجند سی اسے دیکھ رہی تھی اس کا دل ہر احساس سے عاری تھا مگر اس کی چوکھٹ پر یوں اسے اجاڑ دیکھ کر دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس سے اس نے بے پناہ محبت تو کر لی تھی مگر نفرت نہ کر سکی تھی۔ اسے کوئی بددعا نہ دی تھی۔ کوئی آنسو نہ بہایا تھا مگر پھر بھی وہ اجاڑ کھڑا تھا۔ زیست کی طویل راتوں میں کوئی پہر ایسا نہ گزرا تھا جب اس کے خیال کا جھماکا نہ ہوا ہو مگر پھر بھی وہ جذبات کی تعمیر اینٹوں سے کرتی رہی تا آنکہ دل کبھی بھی اسے دیکھ کر ملال میں نہ دھڑکے۔ وہ اپنے احساسات پر قابو پانے میں کامیاب تو ہو گئی تھی مگر اسے یوں دیکھ کر بے چین ضرور ہوئی تھی۔

”جب یہاں تک آ گئے ہو تو یوں منجند کھڑے رہنے سے وقت تھم نہیں جائے گا۔“ اس کے سپاٹ لہجے پر چونک کر اس نے دیکھا تھا جو اسے بے آب و رنگ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے چہرے سے کچھ بھی بھانپ نہ پایا تھا اس کا چہرہ ہر تاثر سے پاک تھا۔

”بیٹھو۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے صوفے کی جانب اشارہ کیا تھا اور وہ بھاری قدموں کے ساتھ اندر بڑھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور چپ نے اس کے گرد احاطہ کیا ہوا تھا۔ وہ بھی خاموشی سی اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے اوپر اس کی نگاہوں کی پیش محسوس ہو رہی تھی مگر اس نے نگاہ اٹھائی نہیں تھی وہ ایسے چپ تھا جیسے لفظوں کو ترتیب دے رہا ہو اسے نہیں سمجھ آ رہا تھا کیا کہے کہے کہے اسے نہیں لگتا تھا کوئی لفظ بھی ایسے ہوں گے جو اس کے عمل کا مداوا کر سکیں۔ کتنا ہی وقت ان کا خاموشی کی نظر میں گزر گیا تھا۔ زندگی کی حقیقتوں سے یوں واقف ہونا تھا اور ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا تھا، یہ عمل اتنا تکلیف دہ ہوتا تھا اس کا گمان بھی نہ کیا وہ بھٹکتے بھٹکتے تاریک راتوں کی سیاہی میں آشیانے تک پہنچ گیا تھا حالانکہ اسے یقین نہیں تھا پر کوئی غیر معمولی طاقت تھی جو اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ زیست کی چوکھٹ تو پار کر لی تھی مگر تلافی کا مرحلہ مشکل تھا۔

اس کی آنکھوں کی تپش نے اس کی خاموشی کو توڑ دیا تھا اس کے لبوں میں جنبش پیدا ہوئی تھی۔ سلگتی آنکھوں میں ملاحظہ تھی جس میں گزرے ماہ و سال کی داستان رقم تھی۔ وہ بولتا رہا اور وہ سنتی رہی چپ چاپ یہاں تک کہ وہ تھک گیا۔ معافی کا چھوٹا سا لفظ جو کسی بھی تکلیف کا مداوا نہیں کر سکتا تھا لیکن پھر بھی اس نے اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ فیصلہ بھی اسی کے سپرد کر دیا تھا۔ لمبی مسافت کے بعد دونوں کے بیچ خاموشی پھر آشوبی تھی۔ وہ منتظر تھا اس کے بولنے کا اس نے ہر بات بغور سنی تھی وہ حیران نہ ہوئی تھی یہ تو



اسے تب ہی معلوم ہو گیا تھا۔ جس دن وہ چلا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر نا کوئی دکھ تھا نہ اچنبھا لیکن آنکھوں میں سناٹا ضرور تھا سب کچھ ختم ہو جانے کا۔

”میں نے تمہیں معاف اسی دن کر دیا تھا جس دن تم چلے گئے تھے۔“ وہ بہت ٹھہرے اور خاموش لہجے میں بولی تھی اور اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا جہاں گہرا سناٹا تھا۔

”تم مجھے اتنی آسانی سے کیسے معاف کر سکتی ہو۔“ اس کے لہجے میں خود کے لیے بے رحمی تھی جب کہ وہ اس کی بات پر پھیکا سا مسکرائی تھی۔

”جب خواہشات ہی مر جائیں تو درد نہیں ہوتا اور جب درد ہی نہ ہو تو معاف کرنا مشکل نہیں ہوتا۔“ اس کا لہجہ برف کی طرح منجمد تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا تھا کسی کو زندہ رکھ کر مردہ کر دینا کیسا ہوتا ہے اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ اس کا دل چاہا خود کو تہس نہس کر لے، اپنا وجود کسی دلدل میں دھنستا ہوا محسوس ہو رہا تھا اگر وہ کسی کے مسکرانے کی وجہ بنا تھا تو آنسوؤں کی وجہ بھی وہی تھا۔

”میں شاید ماضی کا کسی بھی طرح مددوا نہیں کر سکتا اگر مجھے سکون حاصل نہیں ہوتا تو یہ کچھ غلط نہیں ہے۔“ میں واقعی حق دار ہوں اس چیز کا۔“ وہ بار گیا تھا۔ اسے لگا اب وہ واقعی سانس نہیں لے پائے گا اس نے خدا کو بھی ناراض کیا تھا اور اس کے بندے کو بھی اسے اپنے تمام راستے مسدود نظر آ رہے تھے۔ وہ اس کے چہرے کو پڑھ رہی تھی اسے لگا اگر وہ اب نہ بولی تو اس نے سچ مچ تہس نہس ہو جانا تھا۔ وہ دکھ اور کرب میں تھا ندامت کے ساتھ اور وہ واحد بچی تھی جو ندامت کے خول کو مٹا سکتی تھی۔

”کیسے سوچ لیا تم نے ایسا تمہاری ندامت ہی تمہارا مددوا ہے۔“ اس کے جواب پر وہ درد سے مسکرایا تھا۔ ”لفظوں میں کہنا شاید آسان ہے پر جب نگاہ تمہارے چہرے کی طرف اٹھتی ہے تو مجھے اپنے آپ سے مزید نفرت ہونے لگتی ہے۔“ وہ ایک درد سے بولا۔ اس کی بات پر کچھ آنسو قطرے کی طرح دل پر گرے تھے۔ وہ اس کی ایسی ہی شدت زدہ محبت کے آگے ڈھیر ہوئی تھی اور اسی شدت سے بکھری بھی اور آج وہی شدت اس کے خود کے لیے تھی اپنے آپ سے نفرت کی تفسیر اس کی آنکھوں میں نمایاں تھی۔ اس کی اس شدتوں نے اسے برباد کیا تھا۔ بے شک وہ نادام تھا مگر شدتوں کا مقام آج بھی وہی تھا۔

”انسان مٹی ہے اور اس کا گمان خوشبو جس میں وہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ خواب خواہشیں آرزوئیں پینتا رہتا ہے اس بات سے بے خبر خوشبو جتنی تیزی سے مدھر ہو کر سانسوں میں اترتی ہے اتنی ہی تیزی سے وہ اپنا قیام بھی مٹا دیتی ہے۔ پھر انسان متوحش سا اس کو تھا مانا جاتا ہے۔ اس بات سے بے خبر وہ خوشبوؤں کے گماں کی صورت جس کا نہ تن ہے نہ من، وہ تو بس پھیلتی ہے مدھوش کرتی ہے اور روپوش ہو جاتی ہے پھر وہ تا عمر اسی کا پاپگل بن جاتا ہے۔ تم اپنے ہی بنائے گماں کے ساتھ خود کو خاکستر کرتے جا رہے ہو۔“ اس کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

”جسے تم میرا گمان کہہ رہی ہو وہ حقیقت ہے۔“

”صرف تمہاری سوچ تک اور سوچ کا کوئی وجود کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔“

”تمہارے لیے کہنا آسان ہو گا پر میرے لیے مشکل ہے کیونکہ عمل سے میں گزرا ہوں خود سے بچھلے گئے کانٹوں کا درد بھی میں نے سہا ہے۔“ وہ اپنی ندامت کے خول سے کسی طور نکلنے کو تیار نہ تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی اس کی بے چینی نشانی نے اسے بہت کچھ یاد دلایا تھا۔ ماضی کا وہ حصہ جو تلخ تھا اور اسی کی طرح مضطرب



تھا۔

”نہیں لگتا مشکل جب اس بات کا یقین آجائے کہ جن محبتوں کے لیے ہم ترپٹے ہیں وہ صرف ایک گمان ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں نے اپنی زندگی باپ کی شفقت سے محروم گزاری ہے۔ بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک اس کمی نے میری ذات کو چھلنی کیا پہلے میں مضطرب سی اپنے باپ کی محبت کے لیے ترپتی تھی پھر رفتہ رفتہ اس سے نفرت کرنے لگی جوں جوں ان کی کمی محسوس ہوتی یہ سوچ کر نفرت ہوتی کہ وہ زندہ ہونے کے باوجود ہمارا سایا بان نہیں ہیں پھر ایک وقت آیا مجھے ان سے اتنی نفرت ہو گئی کہ میں ان کا مرا ہوا چہرہ تک نہیں دیکھنا چاہتی تھی لیکن پھر ایک مقام ایسا آنا۔ جب آپ کی سوچ کا وہ پردہ اٹھتا ہے جو آپ کو احساس دلاتا ہے آپ کتنے ہی تنہا ہوں رسوا ہوں پر ایک ذات آپ کو ہمیشہ تھامے رکھتی ہے۔ آپ کسی بھی حال میں ہوں وہ آپ کا ساتھ نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ اللہ ہے مگر جب اسے محسوس کیا جائے تو آپ کی تمام محبتوں پر صرف اس کی محبت غالب ہو جاتی ہے۔ پھر کوئی تشنگی کوئی اضطراب نہیں رہتا۔ جن کے پیچھے ہم بھاگتے ہیں وہ صرف خاک لگتے ہیں جب میں نے اس حقیقت کو سمجھا تھا تب اگر میرے دل میں اپنے باپ کے لیے محبت پیدا نہ ہوئی تھی تو نفرت بھی نہ ہوئی کیونکہ جب اس سے ہم محبت کرتے ہیں تو ہر اس عمل سے بھی باز رہتے ہیں جو اسے پسند نہ ہو۔“ وہ ایک ایک لفظ کو موتیوں کے دانے کی طرح ادا کر رہی تھی ایسا نہ تھا کہ وہ کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا۔ اس کی ذات کا ایسا پہلو جو اس نے کبھی بھی نہ ظاہر کیا تھا اور آج وہ اسے کس جانب لے جانا چاہ رہی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا مگر خود کو وہ اس قابل سمجھتا ہی کہاں تھا۔

”تم خوش نصیب ہو کہ تم بے عیب ہو خدا کے آگے جب تم سر جھکاتی ہو گی تو کم از کم گناہوں کا بوجھ محسوس نہیں ہوتا ہو گا۔ میں کس منہ سے اس کے آگے سر جھکاؤں میرا عمل اس قابل ہی نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں جو شرمساری تھی اب کی بار وہ حیران ہوئی تھی اس نے بڑے لوگوں کو غفلت کی زندگی گزارتے دیکھا تھا۔ اس نے غلطی کی تھی یہ حقیقت تھی مگر اتنی ندامت یہ اس کی اصلاح نہیں تھی تو کیا تھا۔

”تم نے کسے سوچ لیا میں بے عیب ہوں، بے عیب صرف خدا کی ذات ہے اور جس ذات کے آگے تم سر جھکانے سے جھجکتے ہونا اگر اسے تم سے محبت نہ ہوتی تو شاید تم کبھی اتنے مضطرب اتنے نادم نہ ہوتے تمہارے اور میرے بیچ میں کیا ہوا اسے بھول جاؤ وہ ہماری ایک آزمائش تھی جس طرح میں نے اسے اپنی زندگی کی گرد سمجھ کر جھاڑ دیا ہے تم بھی خود کو ان الجھنوں میں مت الجھاؤ کیونکہ میں نے تمہیں واقعی دل سے معاف کر دیا تھا۔“ اس کی بات اس کے دل میں اترتی چلی گئی تھی۔ وہ ایسی تھی یہ وہ جانتا تھا لیکن کیوں بھی یہ جاننے کی کبھی دلچسپی نہ ہوئی لیکن آج اس نے بھی خود کو کھولا تھا۔ شاید اس کی جگہ کوئی اور ہوتا کم از کم ایسا رویہ اختیار نہ کرتا لیکن اس کا سکون، صبر اطمینان آنکھوں میں لمحہ بہ لمحہ اترتا تھا اور شاید ٹھیک بھی تھا۔ دنیا کی محبت وہ دل میں پال لیتی تو آج اتنے سکون میں نہ ہوتی اور وہ جس کے بارے میں اس نے ابھی ابھی کہا تھا خدا اس سے بہت کرنا ہے وہ سچ میں حیران ہوا تھا کیوں کہ آج سے پہلے اس نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ عبادت گزار نہیں تھا وہ کوئی متغیر نہیں تھا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے خدا کو دل سے یاد کیا ہو۔ وہ تو لوگوں کو عبادت کرتے دیکھتا تو یہی خیال کوندنا وہ اپنی ضرورتوں کے لیے اسے یاد کرتے ہیں شاید اور اسے تو کبھی کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوئی ہی نہ تھی۔ سب کچھ بن مانگے ملا تھا۔ پھر بھی وہ کہہ رہی تھی خدا اس سے محبت کرتا ہے آزمائش کے ذریعے اپنے قریب بلا رہا ہے۔ اسے نہیں یاد پڑ رہا تھا اس نے کون سی ایسی نیکی کی جو وہ آج



یہاں تھا۔ پچھلے گزرے لمحے جیسے تشریح کرتے چلے جا رہے تھے۔ وہ اس کی جھولی میں قیمتی موتی ڈالتا رہا اور وہ خاک چھانتا رہا۔ سب کچھ آنکھوں کے سامنے تھا لیکن پھر بھی کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا ایک مقام ایسا آتا ہے جب سب سمجھ آنے لگتا ہے۔ وہ اس مقام تک پہنچ ہی گیا تھا اور آج لگتا تھا جیسے تشنگی کی پیاس بجھ گئی ہو لمحہ لمحہ دہکتی آگ پر اوس بڑ کر ٹھنڈی ہو گئی ہو۔ یوں لگتا تھا اندر ایک طوفان کے بعد گہری خاموشی چھا گئی ہو، گراہیں کھل گئی تھیں جن گتھیوں کو وہ سلجھاتے سلجھاتے تھک گیا تھا وہ یوں سلجھتی تھیں ساتھ ہی سوچ کا وہ پردہ بھی وا ہوا تھا جہاں اس کا گمان بھی نہ تھا۔ زندگی کیا تھی اور وہ کیا گزارتا آیا تھا آج جیسے سمجھ آ گئی تھی۔ ایک طویل خاموشی کے بعد وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی جاتے ہوئے اس پر ایک نظر ڈالی تھی جو کسی گہری سوچ میں گم تھا اس کے چہرے کا ٹھہراؤ اس بات کا پتا دے رہا تھا کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا ہے۔ الجھنوں کے گرداب سے نکلتی وہ دروازے کی جانب بڑھی تھی تب اس کی آواز پر چوکھٹ نے جیسے قدم پکڑ لیے تھے اس کے۔

”ٹھیک کہا تم نے جو کچھ ہمارے بیچ ہوا وہ ایک آزمائش تھی۔“ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا نگاہیں اس کی پشت پر جمی تھیں ایک گہری سوچ کے ساتھ۔ ”تم خوش نصیب ہو کہ زندگی میں کچھ سمجھنے کے لیے بھٹکنا نہیں پڑا۔ آج ہم دونوں ایک ہی مقام پر کھڑے ہیں۔ بس فرق اتنا ہے ہمارے راستوں کی گزرا لگ تھی۔ ان سب میں پھر بھی ایک چیز عجیب ہے آخر ہم آج پھر کیوں ایک ہی مقام پر آ کھڑے ہوئے۔ مجھ میں ہمت نہ تھی پلٹنے کی مگر پھر بھی تمہارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ کیوں اور کس لیے؟ خدا نے ہمیں ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ جانتی ہو کیوں؟“ وہ ہر لفظ ٹھہر کر ادا کر رہا تھا اور اس کی دھڑکن ٹھم سی گئی تھی اس کے خاموش ہونے پر اس نے بے اختیار گردن گھما لی تھی اور اس کی نظر اس کی پرسوج سنہری آنکھوں پر ٹھہر گئی تھی جو بغور اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

”تمہیں یاد ہے نا تم نے کہا تھا زندگی کے اچھے اور برے راستے میں سے کسی ایک کا انتخاب ہم خود کرتے ہیں اور اگر صحیح راستہ چن لیں تو پھر کسی بھی چیز کے لیے تردد ہمیں خود نہیں کرنا پڑتا کیونکہ اس کی ہر راہ ہمیں خدا ہی دکھاتا ہے تو پھر آج ہم اپنے اپنے راستے چن کر واپس ایک دوسرے کے روبرو کیوں آ کھڑے ہوئے ہیں۔“ وہ خاموش ہو گیا اور سوچ کا پہلو اس کی طرف اچھالا تھا۔ وہ خاموش صرف اسے دیکھتی رہی تھی وہ ہر بات کو بغور سوچتی اور پرکھتی تھی مگر یہاں وہ غافل ہو گئی تھی جس روپ میں وہ آج کھڑا تھا اس کی کیا وجہ تھی۔

☆.....☆

نکاح کی تقریب اختتام پذیر ہو گئی تھی۔ مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی گہما گہمی والے ماحول میں ایک دم سنائے چھا گئے تھے۔ گو کہ نکاح بہت سادگی سے ہوا تھا لیکن مہمانوں کی وجہ سے ماحول میں گہما گہمی چھائی ہوئی تھی۔ رات گہری ہونا شروع ہو گئی تھی ہوا میں خنکی کا احساس بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ گلاس ونڈو کے پٹ سے ٹیک لگائے سیاہ آسمان پر نظر جمائے ہوئے تھی۔ آسمان پر چمکتے ستارے روشنیوں کی بہاریں بکھیر رہے تھے۔ گھر کے لان سے اٹھتی رات کی رانی کی خوشبو ہوا کو مسحور کر گئی تھی ساتھ ہی پودوں میں چھپے جھینگروں کی آوازوں نے شور برپا کیا ہوا تھا۔ زندگی گمان کی صورت اور انسان اس کی حقیقت اور گمان کا ملاپ یوں تھا جیسے سمندر میں ڈوبتا سورج، جو ڈوبتا تو ہے پر اس حقیقت کے ساتھ کہ اسے کہیں اور ابھرنا ہے۔ زندگیوں میں اجالے بکھیرنے کے لیے۔ یہ اس کی زندگی کا اجلا پن تو تھا جس کا ساتھ خدا نے اسے عطا کیا تھا۔ آج وہ..... وہ تھا جسے خدا نے اس کے قابل بنایا تھا نہ کہ اس وقت دیا جب وہ زندگی کے اندھیروں میں گم تھا۔ اس



نے تو ملال اس وقت بھی نہ کیا تھا جب وہ گیا اور شاید یہی صبر تھا جس سے اس کی زندگی خوشیوں کی قیمتی موتیوں کی مالا میں پرو گئی تھی۔ شیٹ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا اور وہ اپنے خیالوں میں اتنی محو تھی کہ اس کی آہٹ کو بھی محسوس نہ کر سکی۔ وہ قدموں کی آہستہ چاپ کے ساتھ اس پر نظر ڈالتے ہوئے بڑھا، سفید رنگ کے شرارے میں جس پر سچے موتیوں اور نگوں کا نفیس کام ہوا تھا اس کے وجود پر چاند نیاں نکھیر رہا تھا۔ وہ اس کی ہو گئی تھی۔ وہ اب تک بے یقین تھا۔ زیست کی تلخ راتوں کے بعد وصل کی رات نصیب ہو گئی تھی۔ وہ اس کے قریب آکھڑا ہوا تھا اور گہری نگاہیں اس پر مرکوز کر دی تھیں۔ اس کی نگاہوں کی تپش تھی کہ اس نے چونک کر دیکھا تھا۔ اس کی سنہری آنکھوں میں محبت کی چمک ابھر رہی تھی۔ اس کے لیے اس کی نظروں کی تپش سے نگاہیں خود بخود جھک گئی تھیں۔ وہ کتنے ہی پل اسے خاموشی سے دیکھتا رہا تھا۔ دل نے بے اختیار وقت کھنم جانے کی خواہش کی تھی۔ اس نے نرمی سے اس کے نرم گداز ہاتھ کو تھاما تھا جس میں ہیروں کا نفیس سا بریسلٹ پہنا دیا تھا اور پھر اس کی جانب دیکھا تھا۔

”میں تم سے کوئی وعدہ نہیں کروں گا۔ نہ جانے زندگی کب تک وفا کرے اور میرے وعدے ادھورے رہ جائیں ہاں پر جب تک تمہارے ساتھ جیوں گا اپنے عمل سے اپنے ماضی کا مداوا ضرور کروں گا۔“ وہ متانت سے بولا۔ پشیمانی آج بھی اس کے چہرے پر تھی۔ وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی جو مکمل طور پر بدل چکا تھا۔ ”تم ماضی کا بار بار تیز کر رہ مت کیا کرو۔ جب میرے دل میں کوئی ملال نہیں ہے تو تم کیوں نادام ہوتے ہو۔“ وہ نرمی سے بولی تھی اور وہ دھیمسا مسکرا دیا تھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”ایک پل کے لیے جب اپنی غفلت بھری زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے آج وہ خواہشیں خاک سے زیادہ کچھ نہیں لگتیں۔“ وہ کہتے کہتے رکا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یہ یقین تھا تم ضرور سمجھو گی۔ جس حقیقت سے انسان ہمیشہ نظر چراتا ہے درحقیقت وہی اس کی قسمت ہوتی ہے۔“ اس کے لہجے میں گہرائی سموی ہوئی تھی۔ اس کی بات پر وہ سوچ میں ڈوب سی گئی تھی۔

”شاید ٹھیک کہتے ہو تم خدا نے ہمیں تب ملایا جب ہم ایک دوسرے کے لیے بہتر تھے۔ اگر ہم اس آزمائش سے نہ گزرتے تو شاید ہم خود کو آج سمجھ بھی نہ پاتے۔“ اس کے لفظوں میں خاموشی سی اتر گئی تھی اور اس نے بھی دل سے تسلیم کیا تھا اس کی بات کو ایک معطر سی خوشبو تھی جو چاروں گرد پھیل گئی تھی۔

”رات کی سیاہ تاریک کے بعد دن کے اجالوں کو دیکھنا کیسا لگتا ہے میں آج محسوس کر سکتا ہوں۔“ وہ جذب سا بولا تھا۔ اس کی بات پر اس کے عنابی لبوں پر مسکراہٹ نے احاطہ کر لیا تھا۔

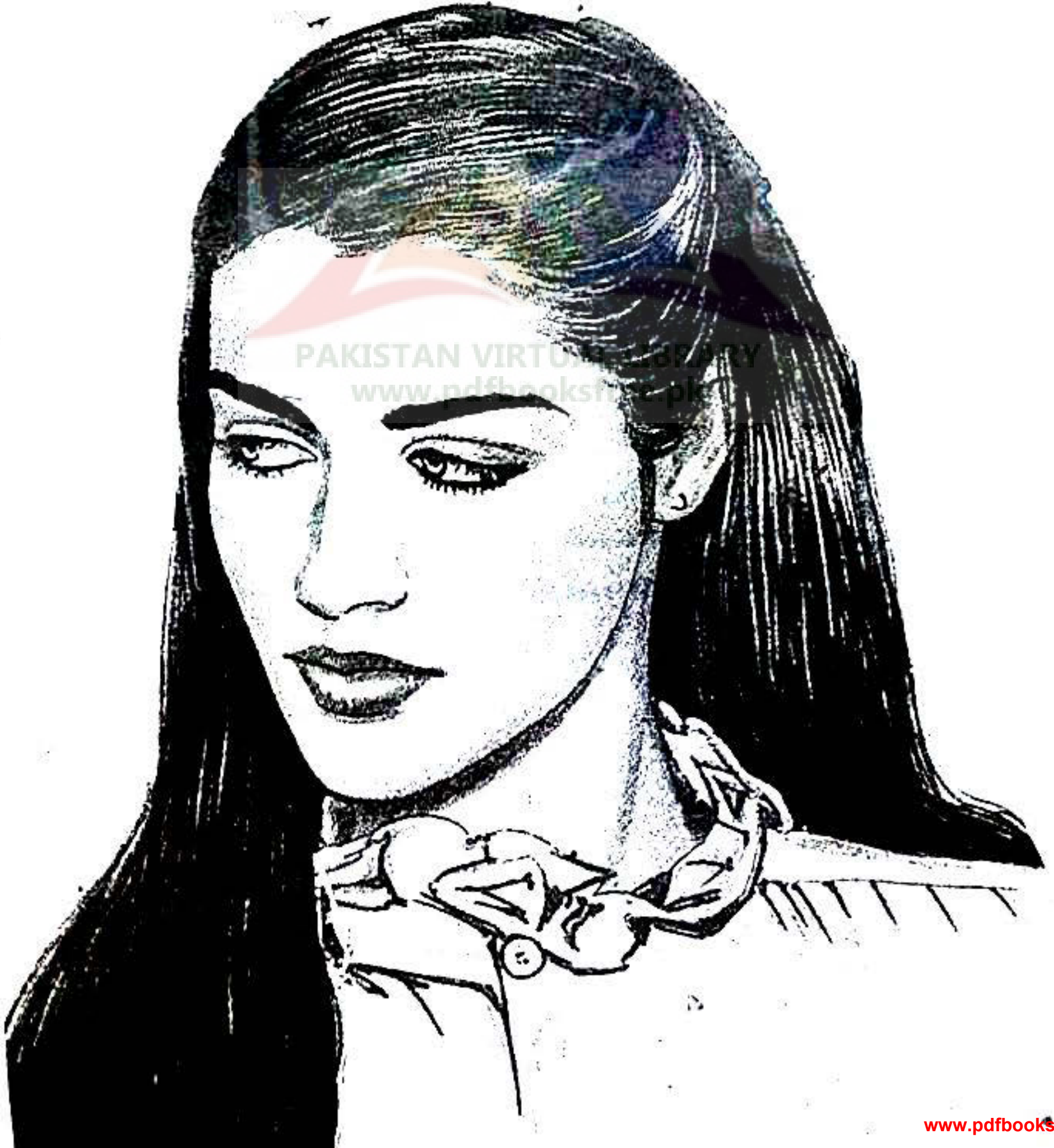
لمحوں کی ہوائیں یادوں کی خشکی کو اڑاتی چلی گئی تھیں۔ اندر کی گھٹن آج جیسے ختم ہو گئی تھی۔ دلوں پر گرتے شبنم کے قطرے محبت کو سرسبز ایک بار پھر کر گئے تھے۔ وصل میں برسی بارش رحمت کی صدا تھی جس کے ہر قطرے میں خدا کی عطا کردہ نعمتیں تھیں۔ دونوں نے نعمتوں کو جھولی میں بھرتے ہوئے عشق حقیقی کا سفر طے کر لیا تھا آج۔

یہ دنیا مٹی ہے اور انسان اس کی پیداوار وہ ہمیشہ خلاء میں اونچی پرواز کرنا چاہتا ہے۔ اس بات سے بے خبر وہ جتنا بھی اونچا اڑ لے اس نے گرنا نیچے ہی ہے اور خلط ہو جانا ہے اس میں جس کی وہ پیداوار ہے۔



# حسرت نامہ

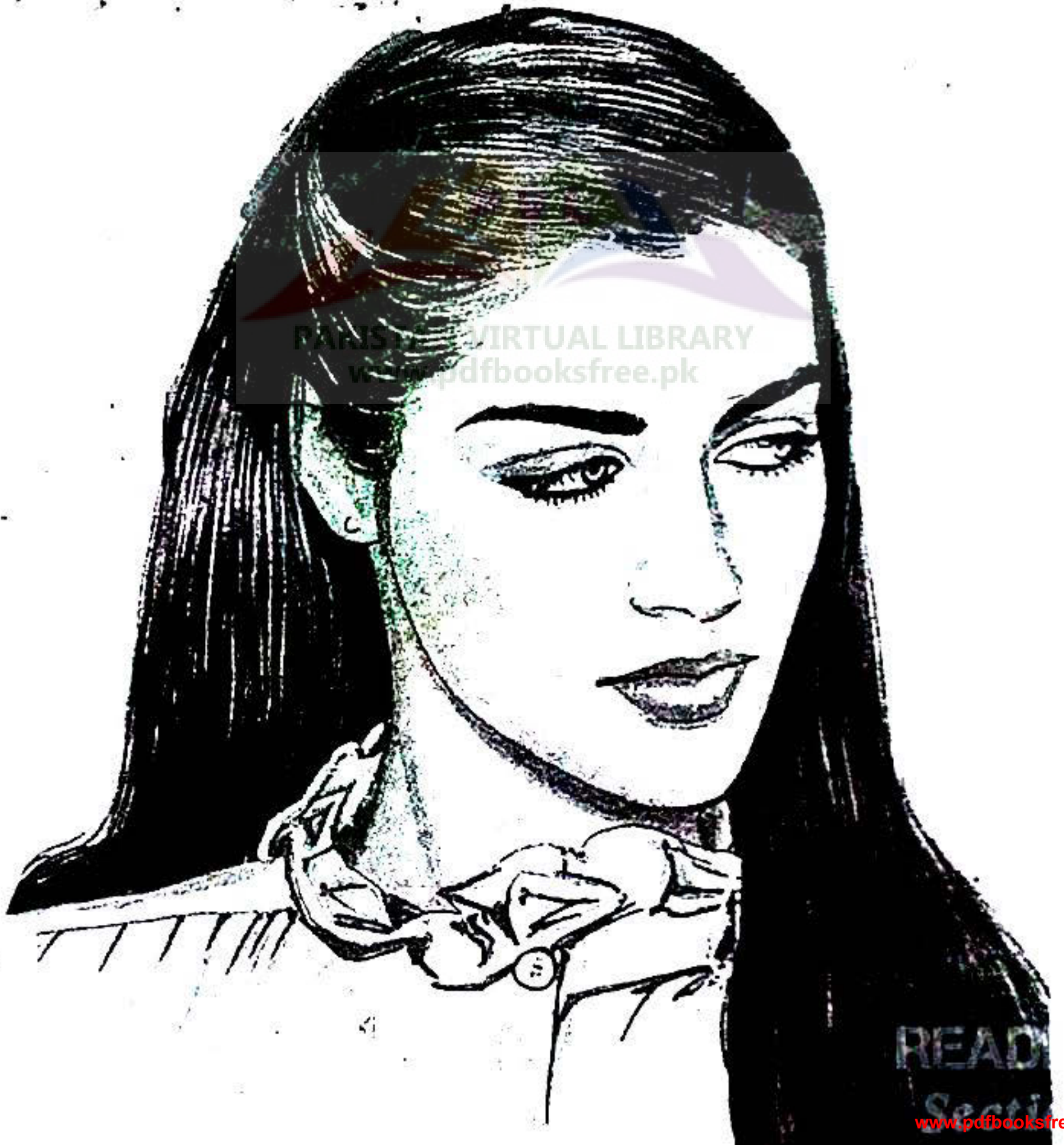
نورالعین نے صفائی ستھرائی کے بعد پورے گھر پر نظریں دوڑائیں۔ دو کمرے، ان کے آگے برآمدہ، برآمدے کے باہر چھوٹا سا کچن اور صحن، صحن کے بائیں کونے میں بنا ہوا واش روم اور بائیں





ہاتھ دھویا اور کنگھی کر کے بالوں کو سمیٹا۔  
 اماں روٹین کے مطابق اس کی دونوں چھوٹی  
 بہنوں کو اسکول چھوڑنے گنی ہوئی تھیں۔ وہ ہر روز  
 واپسی پر سبزی اور دیگر ضروری چیزیں خریدتی تھیں  
 اس لئے تقریباً نو بجے تک گھر واپس آتی تھیں۔ ابا  
 میاں اپنی نوکری پر جا چکے تھے۔ وہ ایک سرکاری  
 محکمے میں کلرک تھے۔ مہنگائی کے اس دور میں ان  
 کی قلیل تنخواہ ان پانچ نفوس کی ضروریات کو پورا  
 کرنے سے قاصر تھی۔ لیکن اماں کی دوراندیشی  
 اور محنت نے ان کا بھرم رکھا ہوا تھا۔ اماں اپنے

کے ساتھ اوپر جاتی سیڑھیاں پورا گھر شیشے کی طرح  
 چمک رہا تھا۔ سچن کی آنکھیں ہر روز گیلیے کپڑے کا  
 پونچھا گئے سے تنی صاف اور سرخ ہو گئی تھیں جیسے  
 ان پر سرخ رنگ نہ پڑا ہو، ڈسٹونڈ نے سے  
 بھی ان پر مٹی نہیں مٹی تھی۔ سچن کے دوسرے کوٹے  
 میں شہبوت کا ایک بڑا سا درخت تھا جس کا سایہ  
 اس چھوٹے سے سچن کو گرمیوں میں دستوپ کی  
 تمازت سے بچاتا تھا۔ صاف ستھرے سچن میں  
 شہبوت کا سایہ ٹھنڈک اور تازگی کا احساس دلاتا  
 تھا۔ بھائی ستمرائی سے مطمئن ہو کر اس نے منہ





فارغ وقت میں لیڈیز کپڑوں کی سلائی کیا کرتی تھیں اور آج کل خواتین جس طرح کپڑے بنوانے کے خطبہ میں مبتلا تھیں ان کو اس کام سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ وہ اپنی اس آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کرتی رہتی تھیں۔ اب تو نور بھی اس کام میں ان کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ یوں ان سب کی محنت سے گھر کی گاڑی رواں دواں تھی۔

☆.....☆.....☆

ابا میاں اور اماں کے تعلقات عجیب سی سرد مہری لئے ہوئے تھے بلکہ ابا میاں تو ان تینوں بہنوں کے ساتھ بھی بس ایسے تعلق رکھتے تھے جیسے وہ ان کی سگی بیٹیاں نہ ہوں۔ ”شاید نہیں بلکہ یقیناً ابا میاں کو یہ تینوں اس لئے بری لگتی ہیں کہ ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ اگر بیٹیوں کی جگہ ان کے تین تین بیٹے ہوتے تو پھر ابا میاں ایسے سرد مہر سے نہ ہوتے۔“ یہ نور العین کا خیال تھا جو سو فیصد درست تھا۔ البتہ اماں ان تینوں کے مقدور بھرا ڈاٹھاتی تھیں لیکن یہ لاڈ ایسے تھے جو ان کی تربیت پر کبھی اثر انداز نہ ہوئے تھے۔ ابا میاں ان کے کالج میں پڑھنے کے خلاف تھے سو نور العین پرائیویٹ ایف اے پاس کرنے کے بعد گھر پر ہی بی اے کی تیاری کر رہی تھی تاکہ وہ پرائیویٹ ہی سہی مگر اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے۔

☆.....☆.....☆

نور العین نے صاف ستھرے صحن میں قدرے سائے والی جانب چٹائی بچھا کر اس پر سلائی مشین رکھی اور ان سوئوں کے ٹراؤزر سینے لگی جن کی قمیضیں آج اماں نے مکمل کر لی تھیں۔ دروازے پر دستک ہوئی تو وہ سلائی مشین روک کر دروازے کی طرف بڑھی اور بغیر پوچھے ہی دروازہ کھول دیا کہ وہ اپنی اماں کی دستک کو خوب پہچانتی تھی۔ اس

نے اماں کے ہاتھ سے سبزی والا شاپر پکڑ لیا اور کچن میں چلی گئی۔ اس نے سبزی ٹوکری میں نکالی اور دوبارہ صحن میں چلی آئی۔ اماں دروازہ بند کر کے صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹ کر سستانے لگی تھیں۔ وہ دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر ادھورا کام مکمل کرنے لگی۔

”نور! تمہارا کتنا کام رہ گیا ہے؟“ تھوڑی دیر بعد اماں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بس اماں یہ آخری سلائی ہے اس کے بعد آپ قمیضیں سی لینا، میں سبزی کاٹ کر ہانڈی بنا لوں گی، پھر اس کے بعد مجھے پڑھانی بھی کرنی ہے۔“ نور نے تفصیلاً جواب دیا تو اماں سر ہلا کر کمرے میں چلی گئیں۔

☆.....☆.....☆

ابا میاں کی سرد مہری کے باوجود نور العین کو وہ بہت عزیز تھے۔ وہ ان کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ وہ یا اس کی بہنیں کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے ان کو تکلیف ہو یا جو انہیں ناگوار گزرے۔

”ابا میاں! چائے لے لیں۔“ اس نے چائے کا کپ ان کے سامنے کیا۔ انہوں نے کپ پکڑ لیا۔ وہ پھر بھی وہیں کھڑی رہی۔

”ابا میاں! آپ کو کوئی پریشانی ہے؟“ انہوں نے اس غیر متوقع سوال پر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا مطلب؟“ انہوں نے نا سمجھی سے پوچھا۔

”ابا میاں! آپ اتنے خاموش کیوں رہتے ہیں۔ آپ بھی دوسروں کے والد کی طرح ہنسا بولا کریں۔“ نور نے جلدی سے بات مکمل کی۔

”اب اس عمر میں ہنسی ٹھنھول کرتے ہوئے اچھا لگوں گا۔ جاؤ جا کر اپنا کام کرو اور ایسی فضول باتوں پر مت الجھا کر دو۔“ انہوں نے رکھائی سے کہہ کر اسے



باہر کا راستہ دکھایا۔

”اماں! ابا میاں ایسے کیوں ہیں؟“ صبح ان کے دفتر جانے کے بعد نور نے ناشتہ بنائی اماں سے سوال کیا۔

”کیا ایسے ہیں؟“ انہوں نے مصروف سے انداز میں کہہ کر پراٹھے کے لئے بلی ہوئی روٹی توے پر ڈالی۔

”وہ ہم سے بات چیت کیوں نہیں کرتے۔ اماں! میرا دل چاہتا ہے کہ ہمارے ابا میاں بھی صبا کے ابو جیسے ہو جائیں۔ سچ کتنا خیال رکھتے ہیں وہ ان سب کا۔“ اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

اماں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیسی حسرتیں پنپنے لگی ہیں میری بیٹیوں کے اندر۔“ وہ سوچ کر رہ گئیں۔

”بیٹا! ہر کسی کا اپنا اپنا الگ مزاج ہوتا ہے۔ تمہارے ابا میاں بھی تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔“ انہیں اپنی ہی آواز اجنبی سی لگی۔

”پتہ نہیں یہ کیسا پیار ہے جو نہ تو ہمیں نظر آتا ہے نہ ہی کبھی ہمیں محسوس ہوا ہے۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

”باجی! اس لفظ کا مطلب بتائیں۔“ سب سے چھوٹی معصومہ نے کتاب نور کے سامنے کی۔ نور، حرا اور معصومہ برآمدے میں بچھی چارپائی پر بیٹھ کر پڑھائی کر رہی تھیں اور اماں نیچے چٹائی پر بیٹھ کر میض کی ترپائی کر رہی تھیں۔ نور معصومہ کو مطلب سمجھانے کے بعد اٹھی۔

”اماں! میں پہلے چائے کا پانی رکھ دوں۔ ابا میاں آتے ہوں گے۔“ وہ برآمدے سے باہر آئی۔ اتنے میں باہر کا دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔

”کون ہے بھی؟ کیا ہو گیا؟ آ رہی ہوں۔“ وہ

کچن میں جانے کی بجائے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”دروازہ کھولو گی تو بتاؤں گی ناں کہ کون ہے۔ تمہاری طرح چیخنے سے تو رہی۔“ دروازے کھلتے ہی اس کی بڑی پھپھو بولتے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔

”اب ہٹو سامنے سے۔“ انہوں نے اسے بازو سے پکڑ کر سائیڈ پر دھکیلا اور اسے سلام دعا کا موقع دیے بغیر آگے بڑھ گئیں۔ وہ جی بھر کر کوفت زدہ ہوئی۔

وہ سیدھی برآمدے میں پہنچیں اور دعا سلام کے بجائے اماں پر اعتراضات کی بھرمار کر دی۔

”یہ تم کیا ہر وقت مشین پر جھکی رہتی ہو۔ ناں تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو کہ میرا بھائی نکما اور نکٹھو ہے جو تم ماں بیٹیوں کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا۔“ وہ بڑے کڑوے لہجے میں بولی تھیں۔

”آپا! میں ایسا کچھ نہیں سمجھتی۔ بس اپنا فارغ وقت ادھر ادھر ضائع کرنے کے بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ ایسا کر کے نہ تو میں کسی پر کوئی احسان کرتی ہوں اور نہ ہی کسی کو کچھ جتنا مقصود ہے۔“ اماں نے رسان سے کہا۔

نجانے ان میں اتنا ضبط کہاں سے آ جاتا تھا کہ وہ پھپھو کی کڑوی سیلی باتوں پر بھڑکنے کی بجائے ٹھنڈا ٹھار جواب دے کر خاموش ہو جاتی تھیں جس کے نتیجے میں پھپھو ننھوت سے سر ہلا کر خاموش ہو جاتیں اور کبھی بھڑک اٹھتیں جیسے کہ ابھی ہوا تھا۔

”یہ وقت ضائع کرنے والی بات تم نے مجھے لگائی ہے؟“ انہوں نے خود ہی فرض کر لیا تھا۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔“ اماں اپنا کام سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”میں آپ کے لئے چائے لاتی ہوں۔“ وہ کچن کی طرف بڑھیں۔



”رہنے دو تم یہ چالوسیاں بی بی! سب جانتی ہوں۔“ انہوں نے ایک اور تیر پھینکا۔  
اماں خاموشی سے پن میں غائب ہو گئیں۔ جانتی تھیں کہ اگر چائے پانی نہ پوچھا تو اماں کے آتے ہی ان کا شکایت نامہ کھل جاتا اور خواجواہ گھر کا ماحول خراب ہوتا۔ تینوں بہنوں کے چہروں پر بے چینی کے تاثرات بہت نمایاں تھے۔

☆.....☆.....☆

”اماں! پھپھو اماں کے پاس بیٹھی رو رہی ہیں۔“ نور جو انہیں کھانے کے لئے بلائے گئی تھی اپنے قدموں واپس آئی۔

”یقیناً اپنی کوئی بات منوائی ہوگی ہمیشہ اسی طرح تو ہوتا ہے۔“ انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔  
پھپھو کھانا کھا کر واپس چلی گئیں۔ ہمیشہ پھپھو کے جانے کے بعد کسی بات کو بنیاد بنا کر اماں کی کلاس لگتی تھی۔ آج بھی جب اماں نے اماں کو جلد فارغ ہو کر کمرے میں آنے کا کہا تو تینوں بہنوں نے بیک وقت اماں کے چہرے کی طرف دیکھا مگر آج ان کے چہرے پر غصے کی بجائے کسی سوچ کے سائے لہرا رہے تھے۔

”جنت خاتون! آپ نے اپنے سب سے بڑے بیٹے کے لئے نور کا ہاتھ مانگا ہے۔“ اماں نے بغیر کسی تمہید کے اماں کے سر پر بم پھوڑ دیا۔ وہ پھٹی ہوئی بے یقین آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگیں جیسے انہیں ان کی بات سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔

”پھر آپ نے کیا کہا؟“ اماں نے چند لمحوں بعد سپاٹ سے انداز میں پوچھا۔

”کہنا کیا تھا، وہ میری بڑی بہن ہیں، میں ان کا کہاٹل تو نہیں سکتا اس لئے میں نے اپنی رضامندی دے دی ہے۔ اب وہ کسی روز خاندان کے بڑوں کو لے کر باقاعدہ منگنی کرنے آئیں گی۔“ وہ بہت پرسکون تھے۔

ان کی بات سن کر اماں کو سمجھ آیا کہ پھپھو آج واپسی پر اتنی خوش کیوں تھیں۔  
”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ اماں کے اتنا بڑا فیصلہ اکیلے لے لینے پر اماں جیسے ہکا کر رہ گئیں۔

”کیا مطلب؟“ اماں نے تیوری چڑھائی۔  
ان کے اس انداز پر اماں کا دل ڈوب کر ابھرا لیکن انہوں نے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔  
ساری زندگی وہ اپنے ہر حق سے دستبردار ہوتی آئی تھیں لیکن یہ ان کی لاڈلی کی زندگی کا معاملہ تھا، وہ کیسے خاموش رہتیں۔

”آپ حامد کے بارے میں سب کچھ تفصیل سے جانتے ہیں پھر بھی اپنی بیٹی کو قربان کرنا چاہتے ہیں؟“ اماں نے مبہم سے انداز میں پوچھا۔  
”ہاں پھر بھی، تمہیں کیا تکلیف ہے؟“ وہ ہلکے سے غرائے۔ انہیں اس معاملے میں اماں کا بولنا ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔

”مجھے تکلیف کیوں نہیں ہوگی؟ نور میری بیٹی ہے اور میں اس کے ساتھ کچھ بھی غلط نہیں ہونے دوں گی۔“ اماں نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہا حالانکہ اس بات نے ان کے اندر آگ سی لگا دی تھی۔

”کیا کر لوگی تم بد بخت عورت؟ تم سب کو میرا فیصلہ ماننا پڑے گا ورنہ میں تمہیں طلاق دے کر تمہاری لاڈلیوں سمیت نکال باہر کروں گی۔ پھر تم ان کو لے کر جہاں چاہے دفنان ہو جانا۔“ وہ اماں کی اس کمزوری کو اچھی طرح جانتے تھے اور بوقت ضرورت اس کا خوب استعمال کرتے تھے۔

ان کی اس دھمکی پر وہ خاموش ہو گئیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ انہوں نے بائیس تیس سال اس شخص کی سنگت میں گزارے تھے اور ان کے ساتھ گزارا ہوا ہر لمحہ انہیں ایک آزمائش لگا تھا۔ وہ وقتی طور پر خاموش ہو گئیں۔ اماں ان



پر ایک فاتحانہ سی نظر ڈال کر کھل جھاڑ نے نگے اور ان کے کمرے کے باہر دروازے سے لگ کر کھڑی نور جیسے سن ہو گئی۔ وہ اپنی کتاب لینے برآمدے میں آئی تھی کہ اماں اور ابا میاں کے کمرے سے آئی آوازوں پر وہیں ٹھہر گئی۔ پھر اپنا نام سن کر دروازے کے قریب آ گئی۔ وہ خاموشی سے کمرے میں آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ جب کسی کڑوٹ چین نہ آیا تو وہ اپنی موٹی سی کاپی اور قلم اٹھا کر کچھ لکھنے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

اگلی صبح اماں اٹھ کر باہر آئیں تو ان کی آنکھیں رونے اور رت جگے کی وجہ سے سو جی ہوئی تھیں۔ نور العین نے ان کی طرف دیکھا۔

”اماں! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“ وہ آگے بڑھی۔

”ہوں۔“ انہوں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”اماں! آپ رو کیوں رہی ہیں؟“ اس نے رندھے ہوئے گلے سے پوچھا۔

”بیٹا! تم ناشتہ بنا لو، میری طبیعت اچھی نہیں ہے میں تھوڑی دیر اور لیٹوں گی۔“ اماں یہ کہہ کر وہیں سے کمرے کی طرف مڑ گئیں۔

حرا اور معصومہ ابا میاں کے ساتھ اسکول گئی تھیں۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کہ ابا میاں ان بہنوں کی کہیں آنے جانے کی ذمہ داری اٹھائیں۔

سب کے جانے کے بعد نور نے اماں کے لئے چائے بنائی، پھر چائے کی پیالی، دو سلاکس اور سردرد کی گولی ٹرے میں رکھ کر کمرے میں چلی آئی۔

”اماں! انھیں یہ چائے اور سلاکس کھا کر سردرد کی گولی لے لیں، طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔“ اس کے آواز دینے پر وہ دھیرے سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”اماں! ہٹائیں نا پھپھو اس دفعہ ایسا کون سا شوٹا

چھوڑ کر گئی ہیں جو آپ اتنی پریشان ہو رہی ہیں۔“ وہ اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے چائے سے اٹھتی بھاپ پر نظریں جمائے رہیں۔

”آپ نہیں بتانا چاہتیں تو کوئی بات نہیں، میں بتا دوں کہ آپ کیوں پریشان ہیں؟“ اس کی بات پر انہوں نے چونک کر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”اماں! پلیز ابا کو ایسا کرنے سے روکیں، دوسری صورت میں تو میں گھٹ کر مرجاؤں گی۔“ وہ جو رات سے خود کو سنبھالے ہوئے تھی ان کے سامنے بکھر گئی۔

”نا میری بچی! میرے جیتے جی کوئی تم لوگوں کا بال بھی برکا نہیں کر سکتا۔ چاہے اس عمر میں مجھے بے گھر ہونے کا دکھ ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔“ اماں نے اسے خود میں سمیٹ کر تسلی دی۔

☆.....☆.....☆

”آپ میری بات سمجھ کیوں نہیں رہے؟ اپنی اتنی پیاری بچی کو کیوں ایک بدکردار کے پلے باندھ رہے ہیں؟ ایک بات اپنے ذہن میں بٹھالیں کہ اگر وہ لڑکا صرف نکما ہوتا تو پھر بھی شاید میں مان جاتی لیکن میں اپنی پاکباز بچی کو اس بدکردار کے پلے ہرگز نہیں باندھنے دوں گی۔“ اماں نے اپنی عادت کے برعکس غصے سے کہا۔

”کون سی بدکرداری؟ جوانی میں لڑکے بالے ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتے ہیں۔“ ابا میاں کے کان پر جوں تک نہ رہنمائی۔

”آپ اپنی بچی کی فطرت سے واقف ہیں، وہ اس ماحول میں گھٹ کر مرجائے گی۔“ اماں منت پر اتر آئیں۔

”ارے ہٹو! مرتی ہے تو مرجائے اور تم نے بھی جتنا سوگ منانا ہے منالو، شادی تو میں اس کی حامد سے



ہی کروں گا۔ میں اس کا ولی ہوں اس کے بارے میں جو فیصلہ چاہے کر سکتا ہوں۔“ ان کے اس لہجے پر اماں کا کلیجہ دہل گیا اور برآمدے میں کھڑی نور کا چہرہ بالکل زرد ہو گیا۔

”باجی! ایسے کیوں کھڑی ہیں؟“ حرا نے اسے یوں کھڑے دیکھا تو اس کے قریب چلی آئی۔

”کچھ نہیں تم چل کر لیٹو میں رات کے برتن دھو کر آتی ہوں۔“ وہ بچن کی طرف بڑھ گئی اور حرا کندھے اچکا کر کمرے میں چلی آئی۔

رات کو سب کے سونے کے بعد نور آہستگی سے اٹھی اور کاپی قلم اٹھا کر کچھ لکھنے لگی۔ یہ ایک عام سی رجسٹر نما کاپی تھی جسے اس نے پرسنل ڈائری کی شکل دے رکھی تھی اور پچھلے چند سالوں سے یہ اس کی رازدار تھی کہ وہ اپنی ان تمام فیملنگز اور باتوں کو جو وہ کسی سے شیئر نہ کر سکتی تھی حتیٰ کہ اپنی ماں سے بھی نہیں، اس ڈائری کے سینے پر رقم کر دیتی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس دوران پچھو دو تین بار ان کے ہاں آئیں اور ان کا رویہ اماں اور ان تینوں بہنوں کے ساتھ پہلے سے بڑھ کر توہین آمیز تھا۔ پھر اماں نے پندرہ روز بعد باقاعدہ منگنی کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔ اماں ان کے اس سنگدلانہ فیصلے پر گھنٹوں روتی رہیں۔ وہ کیا کرتیں۔ اپنی بچیوں کو لے کر کہاں جائیں کہ ان کے میکے میں کوئی ان کو خوش آمدید کہنے والا نہیں تھا۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی بچی کو اس ظلم سے کیسے بچائیں۔ اس فیصلے کے بعد نور کو جیسے بالکل چپ لگ گئی اور اس کی دونوں چھوٹی بہنیں ہر وقت تنہی رہتیں۔ اسی پریشانی میں دس روز گزر گئے اور منگنی ہونے میں صرف پانچ دن رہ گئے۔ شدید ذہنی دباؤ اور پریشانی کی وجہ سے نور کو شدید بخار نے آیا۔ شام تک یہ حالت ہو گئی کہ وہ تقریباً بے ہوش تھی۔ اماں پریشانی سے ادھ موٹی

ہوئی جا رہی تھیں۔

”اٹھ میری بچی! یہ دوا کھا لو۔“ انہوں نے اسے سہارے سے اٹھایا۔

☆.....☆.....☆

تیسرا دن تھا نور کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ بخار نے جیسے اسے نچوڑ لیا تھا۔ اماں محلے کے ڈاکٹر سے دوا دارو کر رہی تھیں۔

”آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں۔ تین دن سے میری بچی بخار میں پھنک رہی ہے۔“ اماں نے ابا میاں کے سامنے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”جاؤ تم جا کر کوئی کام کرو، میرا سر نہ کھاؤ۔“ موہی بخار ہے اتر جائے گا۔“ انہوں نے لا پرواہی سے جواب دیا۔

”آپ کو شاید ان بچیوں کے جینے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن میری تو ان میں جان ہے۔ آپ ایک دفعہ چل کر اس کی حالت تو دیکھیں۔“ اماں ان کے سامنے گڑگڑانے لگیں۔

ابا میاں نے کبھی اپنی بچیوں کو اپنے سے قریب نہیں ہونے دیا تھا لیکن آج نہ جانے اماں کے لہجے میں ایسا کیا تھا کہ وہ بھی بل بھر کو پریشان ہو گئے، اس سے پہلے کہ وہ اپنی اس کیفیت سے باہر نکلتے، حرا دوڑی چلی آئی۔

”اماں اماں! دیکھیں باجی کو کیا ہو گیا؟“ وہ دروازے سے ہی واپس پلٹ گئی۔

”الہی خیر۔“ اماں سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کے پیچھے لپکیں۔

نہ جانے کون سی طاقت تھی جس نے اس وقت ابا میاں کو اماں کے پیچھے نور کے پاس جانے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے ہوش و خرد سے بے گانہ نور کو دیکھا جس کے منہ سے بخار کی شدت سے جھاگ بہہ رہی تھی۔ وہ بے ساختہ اس کی چار پائی کے قریب آئے۔ اس کی حالت دیکھ کر یکدم انہیں



ایسا لگا جیسے کسی نے ان کے دل کو مٹھی میں لے کر  
مسل ڈالا ہو۔

”نور العین! آنکھیں کھولو“۔ انہوں نے اس کے  
گال تھپتھپانے کے لئے اس کے گال کو چھوا لیکن بخار  
کی شدت انہیں اپنا ہاتھ واپس کھینچنے پر مجبور کر گئی۔

”تم ٹھہرو میں کسی سواری کا بندوبست کرتا ہوں  
پھر اسے اسپتال لے کر چلتے ہیں۔“

نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جو ابا میاں سے یہ  
سب کروا رہا تھا۔ اسپتال جانا بے کار ثابت ہوا۔  
شدید ذہنی دباؤ زروس بریک ڈاؤن کی صورت میں  
اس کی جان لے گیا۔ ڈاکٹر نے ایمر جنسی میں اس کا  
چیک اپ کرنے کے بعد اس کا چہرہ سفید چادر سے  
ڈھانپ دیا۔

”آپ لوگوں نے بہت دیر کر دی۔ آپ کی بچی  
اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی“۔ ڈاکٹر نے ابا  
میاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اماں کی چیخوں  
نے آسمان ہلا دیا۔

☆.....☆.....☆

ان کا سارا صحن لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ابا میاں  
وہاں آئے تو اماں انھیں اور ان کا گریبان پکڑ لیا۔  
”لے لی ناں میری بچی کی جان، کتنے ظالم  
انسان ہو تم۔ اب بتاؤ میں اسے کہاں سے لاؤں،  
کیسے واپس لاؤں اسے، بتاؤ اب“۔ وہ سسک انھیں  
پھر یکدم ہنسنے لگیں۔

”دیکھا ہار گئے ناں تم۔ میری بچی نے ہرا دیا  
تمہیں۔ اب کرو تم اس کی شادی اپنے بدکردار بھانجے  
سے۔ ہا ہا ہا۔“

اور ہمیشہ اپنی بیوی اور بچیوں سے دور رہنے  
والے ابا میاں ان کو سنبھالتے سنبھالتے خود بھی رونے  
لگے۔ نور العین ان کے دل میں یہ کیسا درد جگا گئی تھی  
جو انہیں کسی بل چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ ان کی  
ساری سختی ساری اکثر مزاحی جیسے نور کے ساتھ ہی مر

گئی تھی۔

پھر نور کو دفنانے کے بعد جو ابا میاں واپس آئے  
وہ اُس ابا میاں سے بالکل مختلف تھے جو اپنی بچیوں  
سے بے نیاز تھے۔ واپس آ کر وہ حرا اور معصومہ کو سینے  
سے لگائے کھڑے رہے۔ اماں نے دیکھا تو لپک کر  
آئیں۔

”چھوڑو میری بچیوں کو، انہیں بھی چھیننا چاہتے  
ہو“۔ اماں نے ان دونوں کو اپنی طرف کھینچا۔

☆.....☆.....☆

”یہ کیا ہو گیا میری بچی میرے غلط فیصلے کی  
بھینٹ چڑھ گئی۔ میں کتنا بد نصیب باپ ہوں جو  
جیتے جی اپنی بچیوں کو اپنے سائے سے محروم رکھا۔  
میری نور العین! اس کے چلے جانے کے بعد یہ اس  
کی کیسی محبت جاگی ہے میرے دل میں یا شاید پہلے  
سے ہی تھی مجھے محسوس اس کے جانے کے بعد  
ہونے لگی ہے۔“ وہ دل ہی دل میں سوچتے اور  
ان کے آنسو بے ساختہ بہنے لگتے۔ ان کو نور اپنے  
آس پاس محسوس ہوتی تھی جیسے وہ اسے ایک آواز  
دیں گے تو وہ سارے کام چھوڑ کر بھاگتی ہوئی  
آئے گی۔ مگر وہ تو ان سے اتنی دور جا چکی تھی کہ  
کوئی آواز اس تک پہنچ سکتی تھی نہ کوئی بلاوا اسے  
واپس بلا سکتا تھا۔

اماں کی حالت اب پہلے سے بہتر تھی پھر بھی وہ  
اچانک نور کو پکار کر رونے لگتی تھیں۔ ابا میاں نے  
اس دوران اُن کا پورا پورا خیال رکھا، مگر انہیں جیسے  
اب کسی بھی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ نور  
نے خود مٹ کر ابا میاں کے دل میں اپنی محبت کی  
ایسی شمع روشن کی تھی جو اُن کے دل میں روشنی کرنے  
کے بجائے پچھتاوے کا دھواں بھرتی تھی اور اس  
گھٹن سے پریشان ہو کر وہ ادھر ادھر پناہ  
ڈھونڈنے لگتے۔

آج بھی ان کی بے چینی حد سے بڑھی تو وہ صحن



سے اٹھ کر بچیوں کے کمرے میں آ گئے۔ حرا اور معصومہ اماں کے ساتھ صحن میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اُس کرسی پر بیٹھ گئے جہاں بیٹھ کر نور پڑھا کرتی تھی اور ساتھ ہی میز پر رکھی ہوئی اس کی کتابوں پر بے ساختہ ہاتھ پھیرنے لگے۔ اُن کی نظر اس موٹی سی کاپی پر پڑی جو دو تین کتابوں کے نیچے دبی ہوئی تھی اور اس کے اندر پین رکھ کر اسے بند کیا گیا تھا۔ انہوں نے پین والی جگہ سے اس کاپی کو کھول لیا، یہ ایک عام سی کاپی تھی جسے نور نے ڈائری کی شکل دے رکھی تھی۔ وہ اس کاپی نما ڈائری کو پکڑ کر سیدھے ہو بیٹھے اور اس کے صفحے الٹ پلٹ کرنے لگے۔

(20 اگست 2007ء)

”آج میرا میٹرک کا رزلٹ آیا ہے۔ میں اے گریڈ میں پاس ہوئی ہوں۔ میں ابا میاں کو یہ خوش خبری سناؤں گی تو مجھے امید ہے وہ ضرور مسکرا دیں گے اور میں ان سے کالج میں ایڈمیشن کی فرمائش کر دوں گی۔“

انہوں نے اگلی تاریخ پر نظر دوڑائی۔

☆.....☆.....☆

(21 اگست 2007ء)

”آج میں نے ابا میاں کو اپنے پاس ہونے کی خبر سنائی تو انہیں بالکل خوشی نہ ہوئی۔ بس ’ہوں‘ کر کے خاموش ہو گئے۔ پھر اماں سے کہنے لگے اب اسے گھر بٹھاؤ اور کچھ کام کاج سکھاؤ اور میں جو اُن سے کالج جانے کی بات کرنے والی تھی چپ کی چپ رہ گئی۔ بھلا میری چپ سے ابا میاں کو کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے سامنے رکھے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اُن کو تو یہ بھی یاد نہیں ہو گا کہ میں نے ان سے آخری بار فرمائش کب کی تھی۔ مگر مجھے یاد ہے۔ جب میں پانچویں میں تھی تو میں نے ان سے گڑیا لانے کی فرمائش کی تھی۔ وہ میری فرمائش تو کیا پوری کرتے الٹا مجھے

ڈانٹ دیا۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے ان سے فرمائش کرنا بالکل چھوڑ دیا۔ ابا میاں کو تو شاید یہ بات محسوس بھی نہیں ہوتی ہوگی کہ ہم بہنیں ان سے کوئی فرمائش نہیں کرتیں۔“

ابا میاں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوئیں تو الفاظ گڈمڈ ہو گئے۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے باری باری دونوں آنکھیں صاف کیں اور صفحہ پلٹ دیا۔

☆.....☆.....☆

(10 ستمبر 2007ء)

”آج میری دوست صبا کا کالج کا پہلا دن تھا۔ قسمت کی بات ہے اس کے نمبر مجھ سے کم تھے لیکن پھر بھی اس نے ایڈمیشن لے لیا اور ایک میں ہوں شاید بد قسمتی اسی کو کہتے ہیں۔ اماں سے بات کر دو تو وہ حوصلہ بڑھانے کو نہ جانے کون کون سی نعتیں گوانا شروع کر دیتی ہیں۔ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس گھر کی بجائے صبا کے گھر میں پیدا ہوئی ہوتی تو میرے بھی اس کی طرح بہت عیش ہوتے۔ صبا کے ابو اس سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ مجھے تو وہ دنیا کی خوش قسمت ترین بیٹی لگتی ہے۔ کاش ہمارے ابا میاں بھی اس کے ابو کی طرح ہو جائیں۔ ہم بہنوں سے پیار کرنے والے اور ہماری چھوٹی چھوٹی فرمائشیں پوری کرنے والے۔ میں صبا کو اپنے ابو سے کسی بات پر بحث کرتے ہوئے دیکھتی ہوں تو مجھے اس پر رشک آتا ہے کہ کیسے وہ اپنی ہر بات ان سے منوالیتی ہے اور ایک میں ہوں اپنے ابا میاں سے اپنی جائز بات بھی نہیں منوا سکتی۔ منوانا تو دور کی بات میں تو ان کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار تک نہیں کر سکتی۔“

ابا میاں کے منہ سے سسکی سی نکلی۔ ہائے میری بچی کتنی حسرتیں لئے چلی گئی۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ کس زعم میں اپنی بچیوں کے نازک احساسات کو زخمی کرتا رہا ہوں۔ آنسو ان کی آنکھوں سے بہہ کر



رخساروں پر لڑھکنے لگے۔ انہوں نے بے چین ہو کر کتنے ہی صفحے ایک ساتھ پلٹ دیئے۔

☆.....☆.....☆

(15 مئی 2008ء)

”آج شام سے ہمارے گھر کا ماحول بہت نیس ہے۔ اس کی وجہ فریدہ پھپھو ہیں۔ وہ جب بھی ہمارے ہاں آتی ہیں کچھ نہ کچھ ایسا کر جاتی ہیں کہ دنوں ہم ماں بیٹیوں کی شامت آئی رہتی ہے۔ اب نہ جانے کتنے دن تک ابا میاں کا موڈ خراب رہے گا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ہمارے گھریلو معاملات میں پھپھو کا اتنا عمل دخل کیوں ہے۔ یہ سب ابا میاں کی کمزوری ہے۔ اماں ان کی بیوی ہیں، ہم ان کی بیٹیاں ہیں، ہمیں زمانے کے سرد و گرم سے بچانا ان کا فرض ہے۔ لیکن یہی تو میری غلطی ہے کہ ابا میاں نے ہمیں اپنا فرض سمجھا ہی کب ہے۔ ہم تو ان کے لئے نرا بوجھ ہیں جسے وہ نجانے کس مجبوری کے تحت اٹھائے ہوئے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کسی دن پھپھو کے حکم پر وہ ہمیں گھر سے بھی نکال باہر کریں گے۔ مجھے اپنی اماں پر بہت ترس آتا ہے۔ کیسے گھٹ گھٹ کر جی رہی ہیں۔ اگر مجھے ایسے حالات میں جینا پڑے تو..... نہ، نہ میں تو اس ٹھٹھن کے تصور سے ہی مر جاؤں گی۔“

اور میں نے ایسی ہی ٹھٹھن کو تمہارا مقدر بنانے کی کوشش کی تو تم واقعی جان ہار گئی میری نورالعین۔ ہائے تم اپنے ساتھ میرا چین بھی لے گئی ہو۔ حقیقت کے آئینے میں مجھے اپنا چہرہ بہت ہی بھیاںک دکھ رہا ہے۔ ابا میاں دل ہی دل میں نور سے مخاطب تھے۔ پھر انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ رگڑا۔

☆.....☆.....☆

(10 مارچ 2009ء)

”آن ابا میاں کو نہ جانے کس بات پر غصہ

تھا۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چائے کی پیالی زمین پر دے ماری اور اماں کو صلو اتیں سنانے لگے کہ اگر بیٹیوں کی بجائے ان کے بھی پھپھو کی طرح صرف بیٹے ہوتے تو ان کی زندگی بھی ان کی بہن کی طرح جنت ہوتی۔ یہ جانے ابا میاں کو پھپھو کی زندگی کیوں جنت لگتی تھی حالانکہ ان کے تینوں بیٹے ایک سے بڑھ کر ایک آوارہ اور بگڑے ہوئے تھے۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ ہمارے ابا میاں آخر کس جنت کی تلاش میں ہیں۔ اگر وہ غور کریں تو اپنی بیٹیوں کی اچھی پرورش کر کے وہ حقیقی جنت کما سکتے ہیں۔ انہیں ہمارے ساتھ سختی اور بے حسی کا رویہ اختیار کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ بشارت کیوں یاد نہیں آتی کہ جس نے اپنی دو پائین بیٹیوں کی اچھی پرورش کی وہ جنت میں آپ کے ساتھ یوں ہوگا جیسے ایک ہاتھ کی دو انگلیاں۔ مجھے یہ بھی سمجھ نہیں آتا کہ ابا میاں بیٹا پیدا نہ کرنے پر اماں کو کیوں دوش دیتے ہیں جبکہ اللہ خود اس بات کا اقرار کر رہا ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے بیٹا عطا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے بیٹیاں اور جسے چاہتا ہے بیٹے اور بیٹیاں دونوں اور جسے چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے۔ تو پھر بیٹا پیدا نہ کرنا اماں کا جرم کیوں ٹھہرایا جاتا ہے؟ نہ جانے ہم انسان اللہ کی اس تقسیم پر راضی کیوں نہیں ہوتے؟ ہم بیٹیوں کو زحمت اور بوجھ کیوں سمجھتے ہیں جبکہ اللہ نے انہیں رحمت قرار دیا ہے۔“

ابا میاں کے سینے کا بوجھ اتنا بڑھا کہ انہیں سانس لینا دو بھر ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

(12 اکتوبر 2009ء)

”آج میں بہت خوش ہوں۔ میرا ایف اے کا رزلٹ آیا ہے۔ اگرچہ میں نے پرائیویٹ ہی پیپر دیئے تھے پھر بھی میری فرسٹ ڈویژن آئی



سپوت نے کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا ہوگا جس کے نتائج سے بچنے کے لئے پیسوں کی ضرورت آن پڑی ہوگی۔“

اماں میاں کی آنکھوں کے سامنے اس واقعے کی فلم سی چلنے لگی اور انہیں نور کے اس قدر درست اندازے پر حیرت ہوئی۔

☆.....☆.....☆

(7 نومبر 2011ء)

”ابھی تھوڑی دیر پہلے میں برآمدے سے اپنی کتاب اٹھانے گئی تو ابا میاں کا ارادہ سن کر میری روح کانپ گئی۔ ابا میاں کو یہ کیا ہو گیا؟ میں اتنی بے مایا تو نہیں کہ وہ مجھے اپنے بھانجے پر قربان کر دیں۔ اگر جو ابا میاں یہ فیصلہ میری بھلائی کے لئے کرتے تو مجھے ان کا یہ فیصلہ دل و جان سے قبول ہوتا۔ مگر وہ تو اپنی بہن کے مسائل حل کرنے کے لئے اپنی بیٹی کو قربان کرنے چلے ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کو اُس بھانجے سے پیارنے چلے ہیں جس کی بدکرداری کے چار نہیں کم از کم بھی چار سو گواہ تو ضرور ہوں گے۔ آج کل وہ اپنے محلے کی ایک بیاہتا عورت کے ساتھ رنگ رلیاں منانے میں مصروف ہے اور محلے والوں کی لعن طعن سے تنگ آ کر پھپھو نے اس مسئلے کا یہ حل نکالا ہے کہ اپنے اس آوارہ فطرت بیٹے کی شادی کر دیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ انہیں اپنے سپوت کے لئے لڑکی کہاں سے ملے گی۔ پتہ نہیں ابا میاں کا دل اتنا سخت کیوں ہے؟ یہ فیصلہ کرتے وقت ان کا دل بھی نہیں کانپا۔ میں ابا میاں کے اس فیصلے کو ہرگز تسلیم نہیں کروں گی چاہے مجھے جان سے گزرنا پڑے۔“

اور تم اپنے سخت دل باپ کی وجہ سے واقعی جان سے گزر گئیں۔ ابا میاں نے لمحے بھر کو آنکھیں بند کر لیں۔

☆.....☆.....☆

ہے۔ میں نے اس خوشی کو اپنی اماں اور بہنوں کے ساتھ مل کر منایا ہے۔ اسی خوشی میں آج اماں نے میوؤں والا زردہ بنایا ہے جو اباسمیت ہم سب کو بہت پسند ہے۔ ابا میاں کو میں نے اپنے رزلٹ کے بارے میں بالکل نہیں بتایا۔ انہیں کون سا خوش ہونا تھا۔ انہیں تو شاید خوش ہونا آتا ہی نہیں ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود مجھے اپنے ابا میاں بہت پیارے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد بی اے کر لوں اور کوئی معقول سی نوکری کر کے اپنے ابا میاں کا سہارا بن جاؤں اور یہ ثابت کر سکوں کہ بیٹیاں بھی بیٹوں کی طرح اپنے باپ کا بازو بن سکتی ہیں۔“

اور میں کتنا بد نصیب باپ ہوں جسے اپنی بیٹی سے محبت بھی ہوئی تو کب؟ جب وہ چلی گئی جہاں سے واپسی کسی طور ممکن نہیں ہو سکتی۔ ابا میاں یہ سوچ کر سک اٹھے۔ نور العین کی یہ ڈائری پڑھ کر ان کا دل پھٹا جا رہا تھا لیکن انہوں نے پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

☆.....☆.....☆

(5 جنوری 2010ء)

”آج پھپھو آئیں تو بہت سنجیدہ نہیں بلکہ پریشان تھیں۔ آتے ہی ابا میاں کو لے کر کمرے میں چلی گئیں۔ آدھے گھنٹے بعد ابا میاں نے اماں کو بھی اندر بلا لیا۔ اماں حیران تھیں کہ آج تک ان بہن بھائیوں نے انہیں کسی بات میں شریک نہیں کیا تھا تو پھر آج یہ انقلاب کیسے؟ مجھے بھی حیرت ہوئی لیکن جب اماں نے میرے پاس رکھوائے ہوئے وہ چالیس ہزار روپے مانگے جو ان کی کمیٹی نکلنے پر اُن کو ملے تھے تو مجھے ساری صورتحال سمجھ آ گئی۔ انہوں نے اماں سے صرف پیسے مانگے تھے۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ پیسے انہیں کیوں چاہئیں۔ اماں کو وجہ معلوم ہو یا نہ مگر مجھے پورا یقین ہے پھپھو کے کسی



(8 نمبر 2011ء)

”آج میں اماں کے سامنے بکھر گئی۔ یہ میں نے کیا کیا؟ وہ تو پہلے ہی بہت پریشان تھیں، میں نے انہیں اور پریشان کر دیا۔ لیکن میں بھی کیا کروں؟ میں کیسے ابا میاں کے فیصلے پر سر جھکاؤں؟ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اماں کچھ نہیں کر سکیں گی۔ کاش میرے ہاتھ میں جادو کی کوئی چھڑی آ جائے تو میں سب ٹھیک کر دوں۔ سب سے پہلے ابا میاں کا دل ان کی بیوی اور بیٹیوں کے لئے نرم کر دوں۔“

ابا میاں نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اپنے آنسو پئے اور اگلا صفحہ پلٹ دیا۔

☆.....☆.....☆

(14 نومبر 2011ء)

”آج اماں پھر ابا میاں کے سامنے گڑ گڑا رہی تھیں کہ وہ اپنا فیصلہ بدل لیں۔ ابا میاں کا لہجہ ”مرتی ہے تو مر جائے“ میرے دل میں انی کی طرح گڑ گیا ہے اور مجھے بہت تکلیف دے رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ کوئی باپ اپنی بیٹی کے لئے ایسے سخت الفاظ استعمال کر سکتا ہے۔ کوئی کرے یا نہ کرے لیکن یہ تو ثابت ہو گیا کہ میرے ابا میاں ایسا کر سکتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ انہیں ہمارے مرنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

آؤ دیکھو میری بچی تمہارے چلے جانے سے مجھے کتنا فرق پڑا ہے۔ ایک بار پلٹ کر تو دیکھو۔ ابا میاں نے آنکھیں بند کر کے اسے دل میں مخاطب کیا اور پھر آنکھیں کھول دیں۔ ان کی نظریں اس صفحے کی اگلی سطروں پر پھسلنے لگیں۔

”ابا میاں نے بڑے زعم سے کہا کہ وہ ہمارے ولی ہیں اور ہمارے بارے میں جو فیصلہ چاہیں کر سکتے ہیں۔ میں مانتی ہوں کہ اللہ نے انہیں ہمارا ولی بنایا ہے لیکن اس سلسلے میں اللہ نے قرآن میں بابجا مختلف ہدایات بھی دی ہیں۔ ابا

میاں نے صرف ولی کا عہدہ قبول کیا ہے اور اللہ کی ان ہدایات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اگر وہ ایک بار ان ہدایات کو پڑھ لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ اللہ نے پاک باز مردوں کے لئے پاک باز عورتوں اور پاک باز عورتوں کے لئے پاک باز مردوں کی بات کی ہے تو شاید وہ اپنی پاک باز بیٹی کے لئے ایک بدکردار مرد کا انتخاب بھی نہ کرتے۔ باپ تو بیٹیوں کے لئے گھنا سا یہ ہوتے ہیں لیکن ہمارے ابا میاں تو ایک ایسے ٹنڈ منڈ درخت کی طرح ہیں جو اپنے نیچے بیٹھنے والوں کو دھوپ کی شدت سے بچانے میں ناکام رہتا ہے۔ یا اللہ! میرے ابا میاں کا دل بدل دے۔ انہیں ہمارے لئے گھنا سا یہ بنا دے۔ مجھے کتنی حسرت ہے کہ ابا میاں کبھی پیار سے مجھے ماتھے پر بوسہ دیں۔ لیکن لگتا ہے کہ مجھے یہ حسرت اپنے دل میں لئے ہی اس دنیا سے رخصت ہونا ہے کیونکہ ہمارے جیتے جی تو وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔“

”ہمیں ماتھے پر بوسہ دو

کہ ہم کو تیلیوں کے، جگنوؤں کے دیں جانا ہے

ہمیں ماتھے پر بوسہ دو

ہمیں رنگوں کے جگنو، روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں

ہمیں ماتھے پر بوسہ دو

کہ ہم کو تیلیوں کے، جگنوؤں کے دیں جانا ہے“

اس کے بعد کے تمام صفحے خالی تھے۔ شاید اسے پھر کچھ اور لکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی اور وہ منوں مٹی تلے جاسوئی۔ اپنی بیٹی کی حسرتیں اور دل کے غم دیکھ کر ابا میاں ہچکیوں سے رونے لگے۔ ان کے رونے کی آواز سن کر اماں، حرا اور معصومہ صحن سے اٹھ کر کمرے میں آئیں اور انہیں پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر خود بھی رونے لگیں۔

☆.....☆.....☆

نور کو گزرے چھ ماہ ہو چکے تھے کہ ایک روز پھپھو



چلی آئیں۔

تصویر کے شیشے پر گر رہے تھے۔

”میری بچی نے میرے دل میں اپنی محبت جگانے کی قیمت اپنی جان دے کر چکاکی ہے۔“ ان کے دل سے یہ پچھتاوا جاتا ہی نہ تھا۔ ان کی حالت اور تڑپ دیکھ کر اماں کو بھی اب ان پر ترس آنے لگا تھا۔

اماں کمرے میں آئیں تو انہیں اس طرح روتے دیکھ کر ان کے قریب چلی آئیں۔

”بس کریں کیوں ہر وقت روتے رہتے ہیں؟“ اماں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”میں بہت برا انسان ہوں۔ میری بچی میری پیار بھری نظر کی حسرت لئے چلی گئی مگر میں سنگدل موم نہ ہوا۔ میں ایسا کیا کروں کہ میری نور العین کو چین آ جائے۔“ انہوں نے پچھتاوے کے احساس سے مغلوب ہو کر کہا۔

”بس کریں اللہ کی امانت تھی وہ ہمارے پاس، اس نے واپس لے لی۔“ اماں نے تسلی دی۔

”اور میں اللہ کی اس امانت کی حفاظت نہ کر سکا۔“ ان کے لہجے میں بہت افسوس تھا۔

”تم دیکھنا میں اب ویسا ہی بن جاؤں گا جیسا میری بیٹی چاہتی تھی۔ میری وجہ سے میرے آنگن کا ایک پھول مرجھا گیا ہے لیکن اپنے باقی دو پھولوں کے لئے میں ایسا گھنا سا یہ بن جاؤں گا جو انہیں زمانے کے ہر سرد گرم سے بچائے گا اور مجھے یقین ہے کہ میرے اس عمل سے خوش ہو کر میری نور العین اپنے اس بدنصیب باپ کو معاف کر دے گی۔ کر دے گی ناں؟“ انہوں نے اماں سے تصدیق چاہی۔

اماں نے نم آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور ان کی اس بات سے دور آسمانوں پر نور العین کی روح مسکرائی تھی۔

☆.....☆.....☆

”نور کو گزرے چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ اب تم اس کا سوگ منانا بند کرو اور اپنی دوسرے نمبر والی بیٹی کی منگنی میرے بیٹے سے کر دو۔“ انہوں نے ابا میاں سے کہا۔

”کون سی بیٹیاں اور کس کی بیٹیاں؟ یہ صرف میری بیٹیاں ہیں۔ میری ایک بیٹی کو تو آپ لوگوں نے مجھ سے چھین لیا ہے مگر اب کسی نے میری بچیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو میں اس کی آنکھیں نکال لوں گی۔“ اماں ہسٹریک ہوئیں۔

حرا اور معصومہ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی جب ابا میاں نے پھپھو کا ساتھ دینے کی بجائے اماں کا دفاع کرتے ہوئے انہیں صاف جواب دے دیا۔

پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ ابا میاں اپنی دونوں بچیوں کے لئے چھپر چھاؤں بننے لگے اور اماں سے ان کا سلوک ہمدردی اور محبت آمیز ہونے لگا۔ حرا اور معصومہ کو ابا میاں کے اس رویے کی عادت نہیں تھی۔ وہ گھبرا جاتیں۔ ابا میاں کی ہر محبت بھری بات پر اماں کو نور یاد آ جاتی اور بھیگی پلکوں سے انہیں یوں دیکھتیں کہ وہ شرمندگی سے کٹ کر رہ جاتے۔ پھر ابا میاں یوں بدلے کہ جو دیکھتا حیران رہ جاتا۔ ہر روز نور کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھتے اور کبھی کبھی گھنٹوں نور کی تصویر کو گود میں رکھے نکا کرتے۔

☆.....☆.....☆

شام کی سیاہی دھیرے دھیرے رات کی تاریکی میں بدل رہی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے لٹکا ہوا پردہ ہوا کے ساتھ اڑ کر اندر کی طرف پھڑپھڑانے لگتا اور کبھی کھڑکی میں اپنے مقام پر جا گرتا۔ ابا میاں نور کی تصویر گود میں رکھے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہ رہے تھے جو قطروں کی صورت میں



# لیبرینڈ فنل یا فخریہ

آج کالج میں مس رابعہ کا اپریل فول کے حوالے سے خصوصی لیکچر تھا۔ جس کا بی ایس سی کی طالبات کو بے چینی سے انتظار تھا کچھ اس دن کے حق میں تھیں اور کچھ طالبات مخالفت میں چنانچہ ان کے پرزور





اصرار پر ہی مس رابعہ جو اسلامیات کی قابل اور تمام طالبات کی ہر دلعزیز پروفیسر تھیں، انہوں نے خصوصی لیکچر دیا کلاس میں ان کے آتے ہی خاموشی چھا گئی تھی۔

”السلام علیکم میری بچیوں!“ مس رابعہ نے اپنے مخصوص اور نرم لہجے میں سلامتی بھیجی جس کا خوب صورت اور پر جوش جواب دیا گیا۔

”جی ڈیر اسٹوڈنٹ! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کل یکم اپریل ہے جسے ہر سال اپریل فول کے دن

کے طور پر منایا جاتا ہے، جو قطعی ہم مسلمانوں کا تہوار نہیں۔ آئیے اس کی اصل حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں کہ اصل میں اس کی حقیقت اور تارتا ہے کیا۔“ مس رابعہ نے ٹرانسپیرنسی لگاتے ہوئے طالبات کی طرف دیکھا۔ ان کی گیمیم اور پراثر آواز پر طالبات ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔ جس میں بالخصوص حرا کی سماعت مس رابعہ کی باتوں کی طرف تھی۔

”اپریل لاطینی زبان کے لفظ Aprilis سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے پھولوں کا کھلنا۔ قدیم





رومی موسم بہار کی آمد پر شراب کے دیوتا کی پرستش کرتی اور اسے خوش کرنے کے لیے شراب پی کر اوٹ پٹا تک حرکتیں کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتے تھے۔ یہ جھوٹ رفتہ رفتہ اپریل فول کا اہم حصہ بلکہ غالب حصہ بن گیا۔ انسائیکلو پیڈیا انٹرنیشنل کے مطابق مغربی ممالک میں یکم اپریل کو کھلی مذاق کا دن قرار دیا گیا ہے مگر افسوس کہ یہ فضول رسم مسلم معاشرے میں آکٹوپس کی طرح ایک اور لازم حصہ بن چکی ہے اور مسلمان اپنے ہی مسلمان بہن بھائیوں کی تباہی و بربادی پر خوشی مناتے ہیں اور اپنے ہی مسلمان بھائیوں کو فول بنا کر ان کو مصیبت و پریشانی میں ڈالتے ہیں۔ ”یہاں تک کہ کرس رابعہ نے طالبات پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی حراجیے جیسے اپریل فول کی دردناک حقیقت سے واقف ہو رہی تھی، اس کی آنکھوں سے ندامت کے اشک بہہ رہے تھے۔ کس رابعہ نے آگے بتانا شروع کیا۔

”جب عیسائی افواج نے اسپین کو فتح کیا تو اس وقت اسپین کی زمین پر مسلمانوں کا بہت خون بہایا گیا جب قابض عیسائی افواج کو یقین ہو گیا کہ اسپین میں اب کوئی مسلمان نہیں بچا تو انہوں نے گرفتار مسلمانوں کو یہ موقع دیا کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ واپس مراکش چلے جائیں، جہاں ان کے آباؤ اجداد تھے۔ بظاہر اب اسپین میں کوئی مسلمان نظر نہیں آ رہا تھا مگر اب بھی عیسائیوں کو یقین تھا کہ سارے مسلمان قتل نہیں ہوئے کچھ اپنی شناخت چھپا کر زندہ ہیں لہذا مسلمانوں کو باہر نکالنے کے لیے ایک منصوبے کے تحت اعلان کیا کہ تمام مسلمان غرناطہ میں جمع ہو جائے، انہیں خیر و عافیت کے ساتھ ان کے ممالک بھیج دیا جائے گا چونکہ امن قائم ہو چکا تھا لہذا مسلمان ان کی جھوٹی باتوں میں آکر غرناطہ میں اکٹھے ہوئے، جہاں ان کی خاطر مدارات کے بعد یکم اپریل کے دن بحری جہاز میں بٹھا دیا گیا۔ مسلمانوں کو اپنا وطن

چھوڑنے کا دکھ تو تھا مگر جان بچنے پر مطمئن بھی تھے، دوسری جانب عیسائی حکمران اپنے محلوں میں جشن منا رہے تھے۔ ان مسلمانوں میں بوڑھے، جوان، بچے، عورتیں، مریض شامل تھے جب جہاز سمندر کے وسط میں پہنچا تو منصوبہ بندی کے تحت پانی میں ڈبو دیا گیا اور یوں تمام مسلمان ابدی نیند سو گئے۔ اس کے بعد عیسائی جرنیلوں اور حکمرانوں نے مسلمانوں کے بے وقوف بن جانے پر خوب جشن منایا اور انگریزوں میں اسے 1st April fool کا نام دیا گیا، آج بھی عیسائی اسے بڑے اہتمام سے مناتے ہیں اور لوگوں کو جھوٹ بول کر بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ ڈیر آپ کو معلوم ہے کہ جھوٹ کی ہمارے مذہب میں ممانعت ہے پھر جب خاص کر اسے دوسروں کی دل آزاری کا ذریعہ بنایا جائے سوچے ہم کس طرف جا رہے ہیں؟ کیا ہمارے نبی پاک کی یہی تعلیمات ہیں جیسا کہ آپ نے جھوٹ کے متعلق فرمایا۔ ”ہلاکت و بربادی ہے اس شخص کے لیے جو دوسروں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولے۔ وہ برباد ہوا، برباد ہوا۔“

ایک اور جگہ فرمایا۔ ”جھوٹ سے بچو، بے شک جھوٹ نفاق کا دروازہ ہے۔“

چنانچہ ہمارے معمولی سے مذاق یا جھوٹ سے آپ کو معلوم ہے کیا کیا نقصانات ہوتے ہیں، سب سے پہلے اس عمل سے ہم دشمنوں کی خوشی میں شرکت کرتے ہیں۔ نفاق میں ڈوب جانا، اللہ کی ناراضی پانا، مسلمان بہن بھائیوں کو تکلیف اور اذیت سے دوچار کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ دنیا و آخرت میں صرف خسارہ ہی خسارہ ہے۔ میں امید کرتی ہوں آپ لوگ نہ صرف خود اس فضول رسم کا بالیکاٹ کریں گے بلکہ اپنے دوستوں کو بھی اس سے باز رکھیں۔“

کس رابعہ کا یہ کچر ختم ہو گیا تھا۔ تمام طالبات اب تک ان کی سحر انگیز گفتگو میں کھوئی ہوئی تھیں اور آپس



میں عہد کر رہی تھیں کہ اس طرح کی غیر اخلاقی و غیر اسلامی فضول رسم کو مٹا کر اپنے پیاروں کو اذیت و تکلیف نہیں پہنچائیں گی۔ نہ ہی ان کی دل آزاری کریں گی، آہستہ آہستہ پوری کلاس خالی ہو گئی۔ حرا بھی حزن و ملال کی کیفیت میں لپٹی اپنا بیک اور چادر سنبھالتے کالج گیٹ کی طرف روانہ ہوئی۔ گھر پہنچ کر اس نے حسب توقع ماما کو اپنا انتظار کرتے پایا۔

”السلام علیکم ماما!“ حرا نے اداسی سے جواب دیا۔

”وعلیکم السلام بیٹا! تھک گئی ہوگی۔ جاؤ فریش ہو جاؤ پھر کھانا کھاتے ہیں۔“ ماما نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا پھر حرا اور ماما نے مل کر کھانا کھایا۔ ماما اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی گئیں جبکہ حرا ظہر کی نماز ادا کرنے لگی۔

”اے میرے رب! اے شرک سے بھی قریب مالک! مجھے معاف کر دے۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھ سے نا سبھی اور بے وقوفی میں ایک غلطی سرزد ہوئی، جس پر میں بہت شرمندہ ہوں اور آج مس کے لیکچر نے مجھے مزید میری حماقت کا احساس دلایا۔ اے پروردگار تو ستر ماؤں سے زیادہ چاہنے والا ہے تو جانتا ہے کہ میرا مقصد کسی کی دل آزاری کرنا نہیں تھا، وہ میری کم عمری اور کم علمی کی ایک بھول تھی جس پر تو مجھے معاف کر کے میرے پیاروں کا اعتبار اور محبت واپس لوٹا دے۔“ حرا کرب و اذیت سے دعا مانگتے عداوت کے اشک بہانے لگی۔

آج کا دن پھر اسے ماضی کے درد ناک جھروکوں میں لے گیا، جس میں جھانکتے اس نے سختی و کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

ارشاد اور عابد صاحب دو بھائی تھے۔ ارشد صاحب کے دو بچے ساحل اور دعا تھے جبکہ عابد صاحب کی صرف ایک ہی بیٹی حرا تھی۔ ساحل نے ایم

بی اے کے بعد اپنے بابا اور چاچو کے ساتھ خاندانی بزنس سنبھال لیا تھا جبکہ حرا اور دعا ہم عمر اور سیکنڈ ایئر کی طلبہ تھیں۔ حرا اپنی چلبلی فطرت کی وجہ سے دونوں گھرانوں کے لیے مرکز نگاہ تھی۔ دونوں کا بچپن شرارتیں کرتے گزرا تھا۔ جس میں زیادہ ہاتھ حرا کا ہوتا مگر بڑے اس کی معصوم اور بے ضرر شرارتوں کو انجوائے کرتے۔ حرا کا رشتہ بچپن ہی سے ساحل سے ملے تھا اور اب ارشد صاحب کے ایک دوست کے توسط سے دعا کا رشتہ بھی ملے ہو گیا تھا۔ دعا کی شادی انٹر کے امتحان کے فوراً بعد کرنے کا ارادہ تھا کیونکہ لڑکے نے شادی کے فوراً بعد دینی شفٹ ہو جانا تھا۔

”دعا یار! تمہاری شادی ہو جائے گی تو میں کیا کروں گی؟ مجھے تو اکیلے سونے اور کھانا کھانے کی عادت بھی نہیں اور پھر شرارتیں کرنے پر ماما سے مجھے کون بچائے گا؟“ حرا نے منہ بسورتے ہوئے معصومیت سے کہا۔

”ارے اس میں اتنا اداس بلبل بننے کی کیا ضرورت ہے۔ مائی ڈیر کزن! ہم روز اسکاٹپ اور موبائل پر ڈھیروں باتیں کریں گے اور پھر اکیلی کب ہو؟ ساحل بھائی ہیں ناں ان سے.....“ اس سے پہلے دعا مزید کچھ گوبر افشانی کرتی ساحل کی آواز پر دونوں گنگو کرتی ہوئی اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”دعا! تمہیں ماما بلار ہی ہیں شاید ڈریس ڈیزائنر کے پاس جانا ہے۔“ ساحل نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔

”اوہ ہاں میں تو بھول ہی گئی تھی۔“ یہ کہہ کر دعا وہاں سے اندر چلی گئی اب ساحل اور حرا اکیلے تھے۔ حرا نے بھی ساحل کی پرشوق ساحر نگاہوں سے گھبرا کر وہاں سے بھاگنا چاہا مگر ساحل نے اس کا ہاتھ اپنی گرفت میں لے کر اسے اس کے ارادوں سے ہار ز رکھا۔

”کہاں چلیں محترمہ! ابھی تو بڑی پٹر پٹر زبان



چل رہی تھی، اب اتنی خاموشی..... اور یہ تم کیا کہہ رہی تھیں کہ اکیلی رہ جاؤ گی، بور ہو جاؤ گی۔“ ساحل نے اس کا ہاتھ تھامے تھامے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے کہا جس پر حرا اتنی نٹ کھٹ اور بولڈ ہونے کے باوجود جھینپ کر رہ گئی اور اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ساحل اس کی ادا پر مسکرا کر رہ گیا۔

”ویسے میرے پاس تمہاری بوریت اور اکیلے بن کو دور کرنے کا حل ہے۔“ ساحل کی بات پر حرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”وہ کیا؟“ ساحل اس کی بے چینی پر ہنس دیا۔

”وہ یہ ڈیزیز کزن پلس سوٹ فیلنسی کہ دعا کے ساتھ ساتھ آپ کو بھی رخصت کروا کر اپنے کمرے میں لے آتے ہیں پھر تمہیں اکیلے سونا نہیں پڑے گا اور ہر وقت میری کہنی حاضر.....“ ساحل نے اس کی طرف تھوڑا جھکتے ہوئے کہا۔

”کیا.....؟“ حرا تو اس کی اتنی بے باکی پر شرم سے سرخ ہو گئی اس نے ہمیشہ ساحل کو سنجیدہ دسویں روپ میں دیکھا تھا اور آج حرا کو اس کی پرشوق بولتی نگاہوں سے مسلسل الجھن ہو رہی تھی۔

”جی نہیں میرے گریجویٹیشن سے پہلے ایسا سوچنے کا بھی مت۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں رکی نہیں بلکہ اپنے کمرے میں آ کر ہی دم لیا مگر اب ساحل کی شوخ باتوں کی گونج اور پرشوق نگاہوں کا ظلم اسے آئندہ زندگی کے خوش نما خواب دکھا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خوب صورت سی مسکان سج گئی۔

☆☆☆

جیسے جیسے دعا کی شادی کے دن قریب آرہے تھے، خوشی کے ساتھ ساتھ ایک اداسی بھی تھی، جس نے اس گھر کے تمام مکینوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب دعا کو خوشی و غم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ پیا کا نام کا پیلا جوڑا پہنا کر

مایوں بٹھا دیا گیا۔ حرا نے اپنی چلبلی فطرت اور شرارتوں سے پوری محفل کو زعفران زار بنایا ہوا تھا، سب اس کی معصومانہ باتوں اور چٹکوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دعا کی ماما نے دل ہی دل میں دونوں بچیوں کی خوشیوں کے قائم رہنے کی دعا مانگی اور ان کی نظر اتاریں۔ ساحل کی آنکھیں بھی اپنی بہن کے وداع ہونے کے خیال سے نم ہو گئی تھیں مگر پھر وہ اس کی خوش آئند زندگی کا سوچ کر اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے حرا کی باتوں کی طرف متوجہ ہوا جو اب بابا سے مزید شاپنگ کے لیے پیسے مانگ رہی تھی۔

☆☆☆

کل دعا کی بارات تھی، آج اسے حرا کے ساتھ پارلر جانا تھا جہاں اس کی اپائنٹمنٹ تھی۔ پارلر میں اتنی دیر تک بیٹھنا حرا جیسی چلبلی اور بے چین روح کے لیے صبر آزما کام تھا ادھر ادھر بے زاری سے دیکھتے ہوئے اس کی نظر دعا پر پڑی وہ کتنی خوب صورت لگ رہی تھی۔ آنکھوں میں آنے والی خوشگوار ازدواجی زندگی کے خوب صورت سپنوں نے اس کے چہرے کو الوہی رنگوں سے سجا دیا تھا۔ حرا نے چٹ پٹ اسے پیار کیا پھر اس کے ساتھ باہر آئی اس کا ارادہ اپنی اور دعا کی مشترکہ دوست شرمین کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا تھا۔

☆☆☆

دعا کی ساس کچھ ضروری معاملات طے کرنے آئی ہوئی تھیں۔ بڑوں کے درمیان بات چیت چل رہی تھی۔ ساحل بھی وہیں موجود تھا کہ ایک دم اس کے موبائل کی رنگ ٹون پر کمرے کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا ہوا ساحل نے بغیر دیکھے کال ریسیو کی۔ غلطی سے اسپیکر کا بٹن آن ہو گیا تھا۔ جس سے آنے والی آواز نے تمام نفوس کو بت بنا دیا۔

”ہیلو..... ہیلو آپ سن رہے ہیں ناں۔ میں حرا



اور دعا کی دوست شرمین بات کر رہی ہوں۔ آج آس کریم کھاتے ہوئے واپسی پر دعا کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ حرا کی حالت بھی تشویش ناک ہے پلیز آپ حوصلہ کریں جیسے ہی حرا کو ہوش آتا ہے میں اسے لے کر آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر لائن ڈس کنکٹ ہو گئی۔ ساحل کے ہاتھ سے سیل فون گر گیا۔ سب سے پہلے دعا کی ساس کو ہی ہوش آیا۔

”اغوا.....“ ان کے منہ سے سنسناتی گولی کی طرح آواز نکلی جس نے تمام نفوس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

”معاف کیجیے گا بھائی صاحب! آپ کی بیٹی اغوا ہوئی ہے۔ اللہ کرے وہ مل جائے مگر اب وہ میرے بیٹے کے قابل نہیں رہے گی کیونکہ لٹیرے صرف مال نہیں بلکہ عزت بھی.....“ مسز زبیر کی سفاکی پر سب سے پہلے ساحل ہوش میں آیا۔

”بس آنٹی! میری بہن کے بارے میں مزید ایک بھی غلط لفظ نہیں یہ ایک اتفاقی حادثہ ہے جو کسی کے ساتھ بھی پیش آ سکتا ہے۔ آپ اسے قبول کریں یا نہ کریں مگر وہ ہمارے لیے ہمیشہ ویسے ہی رہے گی جیسے چند لمحے قبل ملنے والی اس بھیا تک خبر سے پہلے تھی۔ اللہ اس کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔“ ساحل کی بچی اور کھری باتوں اور اکل لہجے پر مسز زبیر خاموشی سے چلی گئیں۔ پل بھر میں ارد گرد دعا کے اغوا کی خبر پھیل گئی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ اب تک حرا کی واپسی کے بھی کوئی آثار نہیں تھے اس کی دوست کا بھی کسی کو پتا معلوم نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا یہ اندھیری رات ان کی خوشیوں کو نگل لے گی اور آنے والی صبح نہ جانے ان کی زندگی میں کون سی رسوائی کے داغ سجانے والی تھی؟ ان سب کے لب پر دعا کی سلامتی و خیریت سے واپسی کی دعا تھی۔ سب کو حرا کی بھی فکر تھی۔ ساحل نے پولیس میں رپورٹ درج کروانی چاہی مگر ارشد صاحب نے سختی سے منع کر دیا انہیں اپنا

خاندانی وقار اور بیٹی کی عزت بہت عزیز تھی۔ اب سب کو حرا کی واپسی کا انتظار تھا۔ اس سے ہی صحیح صورت حال کا اندازہ لگا کر کوئی قدم اٹھایا جاسکتا تھا۔ ساحل نے اس کی دوست سے آنے والے نمبر پر کال کرنا چاہا مگر سیل پاور آف جا رہا تھا۔ بالآخر دو گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد حرا اپنی دوست کے ساتھ آتی نظر آئی۔

”السلام علیکم! Happy april fool day بتائیے کیسا لگا آپ سب کو میرا فول بنانا؟“ حرا کی زندگی سے بھرپور اور کھلتی آواز سنائی دی جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ سب نے چونک کر حیرانی سے اس کی طرف دیکھا انہیں لگا شاید صدمے سے حرا کی دماغی حالت ابتر ہو گئی ہے مگر وہ تو بالکل ہوش و حواس میں اپنی دوست کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔

”کیا ہوا..... آپ سب اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟“ آخر حرا کو ہی انہونی کا احساس ہوا۔ ”دعا کہاں ہے حرا؟“ ساحل کی غراتی آواز آئی۔ حرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اسے کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔ اس کی دوست شرمین بھی ساحل کے رویے پر سہم گئی تھی۔

”وہ ساحل..... اصل میں دعا اور میں پارلر سے واپسی پر شرمین کے گھر چلے گئے تھے پھر فرسٹ اپریل کی وجہ سے میں نے آپ لوگوں کو دعا کے اغوا کا بتا کر بے وقوف بنانا چاہا۔“ حرا نے ساحل اور وہاں موجود باقی لوگوں کے پریشان چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے اٹکتے اٹکتے وضاحت دی۔ اتنے میں دعا بھی اندر آ چکی تھی۔ اس کے لیے بھی یہ ساری صورت حال غیر یقینی اور غیر معمولی تھی۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ حرا نے شرمین کے ساتھ مل کر کوئی اپریل فول پلان بنایا ہے جس پر اس نے اسے روکا بھی تھا مگر وہ حرا ہی کیا جو کسی کی بات مان جائے مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس کی ذات کو نشانہ بنا کر اتنا سنگین



مذاق کرے گی۔

”تمہیں اندازہ ہے کہ تمہاری اس حماقت نے آج کتنا بڑا نقصان کیا ہے نہ صرف دعا بلکہ پورے خاندان کو رسوائی اور بے عزتی سے دوچار کر دیا ہے۔ حرا مجھے تم سے اس بچکانہ حماقت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔“ عابد صاحب نے بھی حرا کو جھنجھوڑتے ہوئے اپنے غصے پر قابو پاتے ڈپٹا۔

”وہ پاپا.....“ حرا کی گھبرائی آواز ساحل کی تیز چبھتی ہوئی آواز میں دب کر رہ گئی۔

”بس..... اب اور کچھ نہیں سنتا۔ بے وقوف اور لا پرواہ تو تم شروع سے تھیں مگر تم میری معصوم اور پر خلوص بہن کے ساتھ ایسا سلوک کرو گی یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارے اس مذاق سے دعا کا رشتہ ختم ہو گیا ہے۔“

”کیا..... کیا کہا؟“ حرا کے ساتھ دعا بھی یہ سن کر بالکل ڈھسے گئی۔ اب حرا کو اپنی حماقت کا شدت سے احساس ہو رہا تھا مگر پانی سر سے گزر چکا تھا۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔“ عابد صاحب کی غصیلی آواز پر ماما اور تائی اسے وہاں سے لے گئیں۔ دعا تو صدمے سے بے ہوش ہی ہو گئی تھی۔ شرمین کو حالات کی سنگینی پر شرمندگی سے برا حال تھا۔

”کاش وہ حرا کی بات میں نہ آئی ہوتی۔“ اس نے تاسف سے سوچا پھر حرا نے ہمت کر کے بڑی مشکل سے دعا کی ساس کو فون کر کے ساری صورت حال بتائی اور ایک بار آنے پر راضی کیا ان کے ساتھ ان کا بیٹا بھی تھا جسے حرا کی بات پر یقین آ گیا تھا پھر شرمین نے بھی ساری روداد سنائی کہ یہ صرف اپریل فول کا ایک مذاق تھا، حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ شرمین نے اپنے سیل فون پر لی ہوئی سیاری تصویریں بھی دکھائیں جو آج اس کے گھر پر لی گئی تھیں اس طرح ان کا اعتبار بحال ہوا اور دعا کے کردار سے

رسوائی کا داغ ہٹا۔ دعا کی شادی عزت و خیریت کے ساتھ ہو گئی۔ حرا نے سکون کا سانس لیا اور اپنے دل پر دھرے ندامت کے بوجھ کو ہلکا ہوتا محسوس کیا مگر رخصتی کے وقت دعا نے جس طرح اس کا خلوص سے بڑا ہاتھ جھٹکا اور آنکھوں میں بے اعتباری لیے سر دنگا ہوں سے دیکھا وہ ایک بار پھر حرا کو عرق ندامت میں بھگو گیا۔ گھر والوں کا رویہ بھی اس کے ساتھ لیا دیا تھا۔ تایاجی نے اپنے پورشن میں دیوار کھڑی کر لی۔ یہ دیوار صرف دو گھرانوں کے درمیان نہیں بلکہ دو خاندانوں کے دلوں میں کھڑی ہو گئی تھی جس کو گرانا اب ناممکن تھا۔ ماما اور پاپا نے تو اس کو معاف کر دیا تھا کہ آخر والدین تھے اور انہیں پتا تھا کہ ان کی بیٹی کی معصومیت اور نادانی کی وجہ سے یہ غلطی سرزد ہوئی۔ کاش ہمارے معاشرے میں اس طرح کی بیہودہ مغربی روایات پر پابندی عائد ہو جائے جس سے کئی زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ ساحل نے بھی پلٹ کر خبر نہیں لی پتا چلا کہ وہ تایا، تائی کے ساتھ امریکا میں شفٹ ہو گیا اور جاتے وقت اس نے ملنا بھی گوارہ نہیں کیا۔ وہ مانتی تھی کہ اس سے غلطی سرزد ہوئی مگر اس کا مقصد خدا نخواستہ دعا کی زندگی خراب کرنا یا رشتوں میں دراڑیں ڈالنا نہیں تھا مگر اتنی معافی و تلافی کے باوجود اس کی معمولی سی خطا کو معاف نہیں کیا گیا اور اس کا یہ مذاق اس کی اپنی زندگی کو مذاق بنا گیا۔ نہ صرف اس نے پر خلوص دوست کے اعتبار کھویا بلکہ اپنی نو خیز عمر کی اولین چاہت کو بھی نفرت کی آگ میں جھلسا دیا۔ ساحل نے وہیں شادی کر لی تھی بابا بھی انہوں کی جدائی کے غم میں دنیا سے چلے گئے، حرا اب بی ایس سی کر رہی تھی اب اس کی زندگی میں سنجیدگی و متانت آ گئی تھی۔ ساحل کے بعد اس کے دل کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور یہ سزا اس نے خود اپنے لیے چنی تھی۔

☆.....



# القریش پبلی کیشنز کے نئے ناول شائع ہو گئے ہیں

اب کر میری رفوگری	مصنفہ	سائرہ رضا	قیمت	600/- روپے
رگ جاں سے جو قریب تھے	مصنفہ	صالحہ محمود	قیمت	600/- روپے
دل کی دہلیز پر	مصنفہ	اشتیاق فاطمہ	قیمت	600/- روپے
میرے ہمنوا کو خبر کرو	مصنفہ	فاخرہ گل	قیمت	600/- روپے
زندگی کی حسین راہ گزر	مصنفہ	سمیرا شریف طور	قیمت	400/- روپے
وہ اک لمحہ محبت	مصنفہ	سمیرا شریف طور	قیمت	400/- روپے
درِ دل	مصنفہ	نبیلہ عزیز	قیمت	900/- روپے
زرد پتوں کا شجر	مصنفہ	نایاب جیلانی	قیمت	400/- روپے

القریش پبلی کیشنز  
سرکلر روڈ، چوک اردو بازار لاہور  
فون: 37652546 — 042-37668958

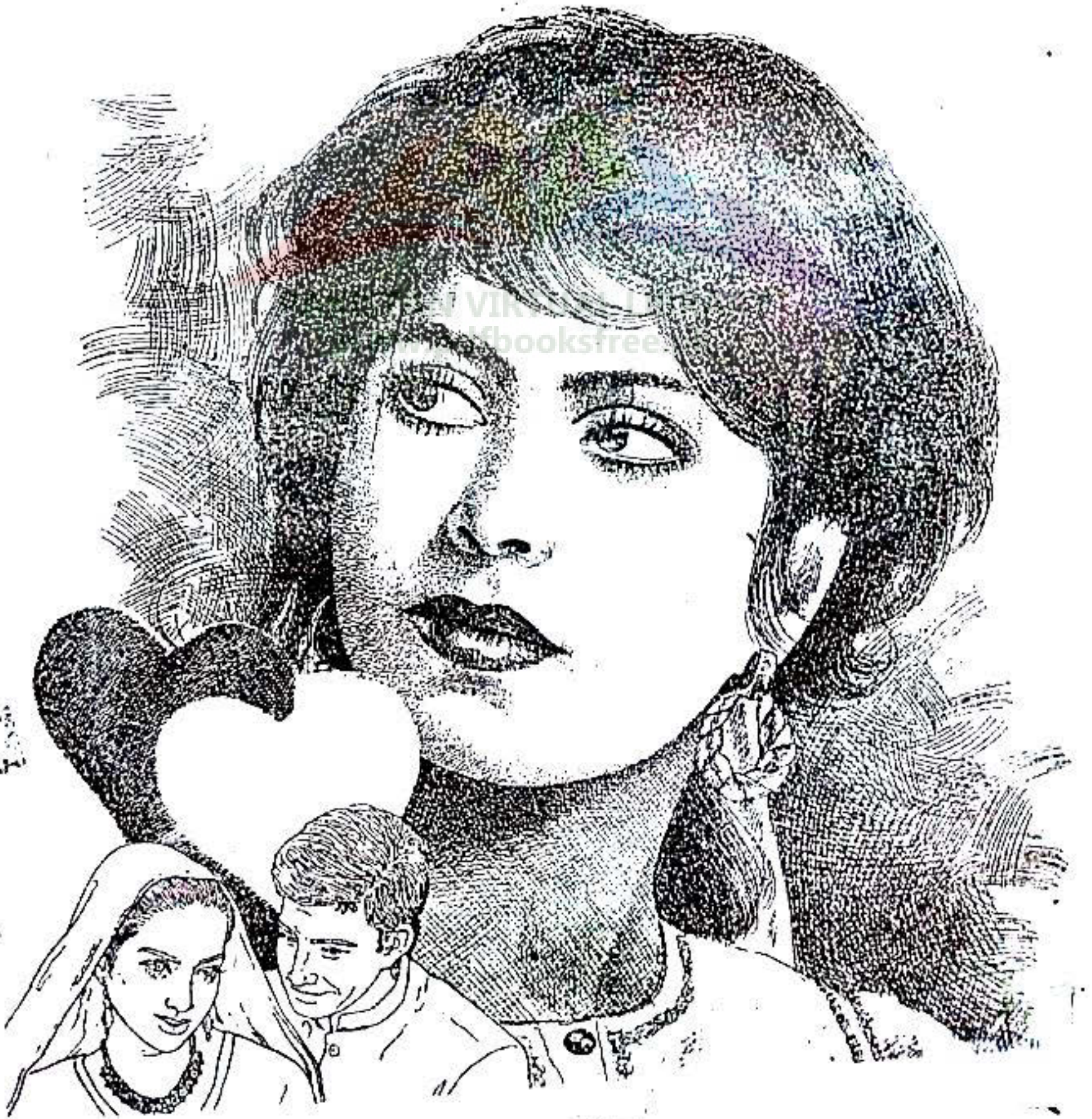


ماریا یاسر

افسانہ

# میں اپنے ہمراہ

”ماہ رخ بیٹا! ذرا تم یہ برتن تو کچن میں لے جاؤ،  
میں آ کے ابھی دھوتی ہوں۔“ رخسانہ نے ڈائنگ ٹیبل  
پر پڑے برتنوں کی طرف اشارہ کیا اور خود ریموٹ اٹھا  
کے ٹی وی آن کر دیا۔





”مما! کیا مصیبت ہے، مجھے اپنا پروگرام دیکھنا ہے اشارٹ ہو گیا ہے، آپ پلیز خود اٹھالیں ناں۔“ اس نے ڈائنگ ٹیبل پر بکھرے بے تحاشا برتنوں سے خائف ہو کے کہا۔

”سیدھی طرح کرو جو بولا ہے، نادرا کی طرح کام چور مت بنو، آج ویسے بھی اس نے چھٹی کر کے میرا موڈ سخت خراب کیا ہوا ہے، اوپر سے تم بحث کر کے مزید آف مت کرو۔“ انہوں نے ماسی کی چھٹی کا غصہ 14 سالہ ماہ رخ پر نکالا جو دانت پیستے ہوئے برتن سیٹنے لگی۔

”آنے دو اس کام چور کو کل، سیدھا کرتی ہوں اس مہارانی کو، ہزار بار بولا ہے sunday کو چھٹی مت کیا کرو، سب گھر پر ہوتے ہیں تو پہلے ختم نہ ہونے والے کاموں کا ڈھیر ہوتا ہے، اوپر سے اس کے کام بھی کرنے پڑ جاتے ہیں، اسی لئے اس حرام خور کو 300 روپے ایکسٹرا دیتی ہوں کہ اتوار کو چھٹی نہ کرے لیکن پھر بھی باز نہیں آتی، کل اچھی طرح خبر لیتی ہوں۔“ وہ نگاہیں نی دی پر جمائے خود ہی سوال جواب کرنے لگیں۔

”مما! میں رکھ آئی ہوں برتن۔ اب ریموٹ مجھے دیں ناں۔ آج کی چھٹی ہے تو آپ لے کر بیٹھ گئیں ہیں ریموٹ۔“ اس نے ماں کے ہاتھ میں ریموٹ دیکھا تو سخت بدمزہ ہوئی۔

”ہاں ہاں دیتی ہوں بس 2 منٹ مجھے ذرا یہ تو دیکھ لینے دو، کتنے زبردست کپڑے پہنے ہوئے ہیں اس ہوسٹ نے، ذرا غور سے تو دیکھ لوں، تمہاری سالگرہ کے لئے میں بھی ایسا ہی جوڑا ڈیزائن کرواؤں گی جو دیکھے گا دیکھتا ہی رہ جائے گا۔“ وہ نادرا کو بھول بھال کے ہوسٹ کے کپڑوں میں مگن ہو گئیں۔

”مما! یہ پروگرام تو ری پیٹ ہے، لائیو تو آپ نے دیکھا ہو گا ناں۔ پلیز مجھے دیکھنے دیں۔“ اس نے ماں کے ہاتھ سے ریموٹ تقریباً چھینتے ہوئے کہا۔

”تو بہ ماہ رخ کتنی بدتمیز ہو گئی ہو تم، ذرا لحاظ نہیں ماں کا۔“ انہوں نے غصے کی ایک زبردست گھوری

سے نوازتے ہوئے کچن کی راہ لی۔

☆.....☆.....☆

”آگئی تم، کیا ضرورت تھی آج بھی آنے کی۔“ نادرا ابھی اندر آئی ہی تھی کہ رخسانہ نے تیکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ باجی طبیعت خراب تھی اس لئے نہیں آ سکی۔“ اس نے سرعت سے برتن دھوتے کہا۔

”ارے بس کر نادرا بی بی، رہنے دے اپنے یہ بہانے، ہر ہفتے تو 2 بار تم یہی بہانہ بناتی ہو، خدا کا خوف کر روز جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی کیا اور خبردار جو مجھے آئندہ باجی بولا۔ بی بی جی بولا کرو سیدھے سیدھے۔“ وہ جو اس کی چھٹی پر کلاس لے رہی تھیں ”باجی“ کے لفظ پر دھیان گیا تو سخت بدمزہ ہوئیں۔

”جی بی بی جی اور بی بی خدا جھوٹ نہ بلوائے میں ٹھیک کہہ رہی ہوں جی، میری طبیعت کل بڑی خراب تھی، بلکہ بچوں کو بھی پرسوں شام وہ حنا باجی نے پرانا سالن دے دیا وہ ہم ماں بیٹیوں نے کھا تو لیا، پر جی پتہ نہیں کیا بات تھی کھا کے میری اور میری بچیوں کی حالت ایسی خراب ہوئی، پیٹ میں اتنا درد کہ اللہ کی پناہ، حکیم سے دوائی جا کے لائی تو تب جا کے ٹھیک ہوا۔ پتہ نہیں کیا مسئلہ تھا کیا پتہ خراب سالن کھا لیا۔ لیکن خراب ہوتا تو حنا باجی مجھے کیوں دیتی۔“ وہ رخسانہ کے پاؤں میں بیٹھی اپنا مسئلہ بیان کر رہی تھی۔

”بس کر دے تو زیادہ خرچ نہ کیا کر۔ ایک تو لوگ تجھے کھانے کو دیتے ہیں اوپر سے تو اسی میں سے کپڑے نکالتی ہے۔ شکر کیا کر، ناشکری مت بن اور چل جا کے اپنا کام کر، باتیں تو کوئی تجھ سے سیکھے اور خبردار جو آئندہ چھٹی کی، میں تجھے فارغ کر دوں گی اب کی بار۔“ وہ کہہ کے ٹی دی کی طرف متوجہ ہوئیں تو نادرا بولی۔

”نہ بی بی جی اب نہیں کرتی چھٹی۔“ کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆.....☆.....☆



”میں سوچ رہی ہوں کہ اس بار ہم ماہ رخ کی برتھ ڈے پارٹی بڑے پیمانے پر کریں۔“ وہ جو اخبار میں مشغول تھے بیوی کی بات پر ذرا سادھیان ہٹا کے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میرا مطلب ہے پچھلی بار بھی ہم نے خود ہی گھر میں ایک کاٹ لیا تھا، اس بار سب فیملی فرینڈز کو انوائٹ کریں گے۔“ انہوں نے وضاحت پیش کی۔

”جیسے آپ کی مرضی میں کون ہوتا ہوں آپ کی مخالفت کرنے والا۔“ انہوں نے لاڈ سے بیگم کی طرف دیکھا تو وہ جیسے کھل اٹھیں۔

”اچھا تو ٹھیک ہے پھر میں لسٹ بنالیتی ہوں مہمانوں کی۔“ وہ خوشدلی سے کہتے اٹھ گئیں تو فہد صاحب بیگم کی جلد بازی پر مسکرا دیئے۔

☆.....☆.....☆

”اف یار! میں تو تھک ہی گیا آج۔“ فہد صاحب نے چشمہ اتار کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور تکیے سے ٹیک لگالی۔

”تھک تو میں بھی بہت گئی ہوں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ سب کچھ بہت اچھے سے ہو گیا۔ کھانا کم بھی نہیں پڑا اور تھا بھی بہت مزے کا، خاص طور پر بریانی تو بہت ہی لاجواب تھی۔ ماہ رخ بھی بہت خوش ہے اس پارٹی سے، اس کی آنکھوں کی چمک اس کی خوشی بتانے کے لئے کافی ہے۔“ رخسانہ اکلوتی بیٹی کے مطمئن سے چہرے کو یاد کر کے خود بھی مطمئن ہو گئیں۔

”اب سو جائیں آپ بھی پھر صبح آفس سے لیٹ نہ ہو جائیں کہیں، میں بھی سوینے لگی ہوں 2 تو بج ہی گئے ہیں۔ صبح نادرا سے لان کی تفصیلی صفائی بھی کرائی ہے۔ پارٹی تو اچھے سے ہو گئی لیکن اپنے پیچھے خوب ڈھیر سارا کچرا چھوڑ کے گئی ہے، اب اللہ کرے کہیں وہ مہارانی صبح چھٹی نہ مار لے ورنہ تو بہت مسئلہ ہو جائے گا۔“ نیند کی وادی میں قدم رکھنے سے پہلے یہ آخری سوچ تھی جو ان کو پریشان کرنے کے لئے کافی تھی۔

☆.....☆.....☆

”مما! اتنی ڈھیر ساری بریانی بچ گئی ہے، آج نادرا آئی آئیں تو آپ ان کو دے دیجئے گا۔“ آنٹی کے بچوں کے کام آجائے گی۔“ ماہ رخ نے تھکاوٹ کی وجہ سے آج اسکول سے پھٹی کی تھی، اب کچن میں ناشتے کی غرض سے گئی تو فریج میں بریانی کے بڑے سے دیکھے کو دیکھ کر بولے بغیر نہ رہ سکی۔

”کیا فضول باتیں کر رہی ہو، میں نے اتنا پیسہ نادرا کو دینے کے لئے تھوڑا ہی لگایا ہے، بڑی آنٹیں مشورہ دینے والی۔ اتنی عمدہ بریانی ہے میں خود کھاؤں گی۔ مسز سارا اور مسز خان نے بھی اتنی تعریف کی تھی رات کو۔ حالانکہ وہ سڑیل سی عورتیں کہاں کسی کی تعریف کرتی ہیں لیکن بریانی کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکیں۔ آج دن کو میں تو یہی کھاؤں گی اور دوسری بات کان کھول کر سن لو، خبردار جو میں نے تمہارے منہ سے نادرا کے ساتھ آنٹی کا لاحقہ سنا، مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا، سچھی۔ کام کاج کی ماسیوں کو آنٹی بنانے کی کوئی ضرورت نہیں، ہمیں ایسے لوگوں سے رشتے لگانے کی کیا ضرورت بھلا۔ اس لئے خبردار جو دوبارہ نادرا کو آنٹی بولا تو۔ سیدھی طرح ماسی کہا کرو۔“ رخسانہ نے اپنا پسندیدہ مارنگ شو لگا کے پیر پیارے تو ماہ رخ منہ بنا کے رہ گئی۔

”یہ کیا ممما! آپ بوائے رائس کے ساتھ دہی کھا رہی ہیں، بٹ آپ نے تو بولا تھا کہ بریانی کھائیں گی۔“ ماہ رخ نے ماں کو سادہ چاول سامنے رکھ دیکھا تو پوچھ بیٹھی۔

”ہاں کھانا تو وہی تھا مجھے لیکن پیٹ میں اتنا درد ہو رہا ہے تو سوچا کہ اس وقت سادہ سا ہی کچھ کھا لوں۔“ انہوں نے بے دلی سے چاول میں چیچ مارا۔

”تو ممما! بریانی ماسی کو دے دیتیں ناں۔“ اس نے اپنی پرانی بات دہرائی۔

”ارے تم ماسی کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو، میں خود کھاؤں گی رات میں، تمہیں ماسی کی اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے۔“ انہیں اب کی بار غصہ ہی آ گیا۔

”نہیں ممما! میں تو بس اس لئے کہہ رہی تھی کہ وہ



بے چاری اتنا فوراً نہیں کر سکتے تو ہم انہیں تھوڑی سی بریائی دے دیں، ماسی کے بچے بھی خوش ہو جائیں گے۔ وہ منمنائی۔

”تم نے کھانی ہے تو کھاؤ ورنہ بریائی اور ماسی کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں، سمجھیں۔“ اب کی بار تو اسے جھڑک ہی دیا۔

”یہ کیا آج آپ جلدی آگئے آفس سے؟“ رخسانہ نے گھڑی پر نظر دوڑائی جو سات بج رہی تھی۔ ”ہاں بیگم! آج سوچا کہ کیوں نہ باہر ڈنر کیا جائے، اس لئے جلدی آگیا آفس سے۔ تم اور ماہ رخ جلدی سے تیار ہو جاؤ پھر چلتے ہیں۔“ وہ کہہ کر واش روم گھس گئے تو رخسانہ بھی اپنے لئے کپڑے نکالنے لگیں۔

☆.....☆.....☆

”مما! کدھر ہیں ماہ رخ بیٹا، ذرا انہیں میرے پاس بھیجو۔“ آج اتوار کی وجہ سے فہد اور ماہ رخ بھی گھر پر ہی تھے۔ ”مما آپ کو پاپا بلارہے ہیں، اس نے کچن میں آ کے فرمانبرداری سے پیغام پہنچایا۔

”پاپا کو بولو تھوڑی دیر میں آرہی ہوں، آج ذرا فریج کی تفصیلی صفائی کر رہی ہوں، کتنے دن ہو گئے فریج کی صفائی کئے ہوئے۔ تمہاری سالگرہ سے 2 دن پہلے کی تھی اور سالگرہ کے بعد بھی تقریباً 25-26 دن ہو گئے ہیں۔“ وہ خود ہی حساب لگاتے ہوئے فریج اور فریزر سے برتن نکال کے کاؤنٹر پر رکھنے لگیں۔

”ارے یہ دیکھو ناں، پارٹی والی بریائی تو میں فریزر میں رکھ کے بھول ہی گئی تھی۔ اف خدا یا کتنے مزے کی تھی لیکن ہماری قسمت میں نہ تھی۔ اف... اتنے دن پرانی نہ ہوتی تو میں ضرور کھا لیتی۔ چلو اب نادرا کے بچوں کے لئے دے دوں گی۔ پھینکنے سے بہتر ہے کہ کسی کے کام آجائے، رزق کی بے حرمتی تو نہ کی جائے۔“ وہ خود ہی بڑبڑاتے ہوئے بریائی کا دیکچہ نادرا کے لئے علیحدہ سے رکھے لگیں تو ماہ رخ نے عجیب سی نظروں سے ماں کو دیکھا۔

”مما! اب تو بریائی بہت باسی ہو گئی ہے، ماسی کو مت دیں کہیں ان کی طبیعت خراب نہ ہو جائے۔“ اسے اب نئی فکر ستانے لگی۔

”ارے ایسے کیسے طبیعت خراب ہو جائے گی، کوئی خراب تھوڑی ہوئی ہے، بس کچھ دن پرانی ہی تو ہے اور ویسے بھی ان غریب لوگوں کو ایسے ہی کھانے کھانے کی عادت ہوتی ہے، تم فکر مت کرو کچھ نہیں ہوتا۔ جاؤ جا کے پاپا سے پوچھو کہ کیا کام ہے۔“

☆.....☆.....☆

”ارے کبخت نادرا! تمہیں تو اللہ پوچھے آج پھر چھٹی کر لی ہے، میں نے آج مشین لگوائی تھی، لیکن تم ہمیشہ ہی کام کے دن ہی چھٹی کرنا، حرام خور کہیں کی۔“ رخسانہ نے گھڑی کی طرف دیکھتے مسلسل بڑبڑائے جا رہی تھیں۔

”مما! میں نے آپ کو کل بولا بھی تھا کہ ماسی کو باسی بریائی مت دیں، مجھے لگتا ہے کہ ہیضہ وغیرہ ہو گیا ہو گا انہیں اسی لئے چھٹی کر لی ماسی نے۔“ ماہ رخ نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

”تم کیا ایک بات کو لے کر بیٹھ گئی ہو۔ کل بھی تمہیں بتایا تھا کہ ایسے لوگ سب ہضم کر لیتے ہیں، وہ مجاورہ بھی تو ہے کہ لکڑ، ہضم پتھر ہضم۔ اور بریائی کوئی خراب تھوڑی ہی تھی جو ہیضہ ہو جائے گا۔ ارے یہ تو حرام خوری کے بہانے ہیں۔ بجائے احسان ماننے کے کہ پیٹ بھرنے کے لئے کھانا دیا تو اور بھی دل سے کام کرتی، چھٹی کر کے بیٹھ گئی۔ آنے دو کل اسے میں نمٹ لوں گی اور اب کی بار تو سیدھا کر لوں گی اسے اور تم ایسے کیا سوچنے بیٹھ گئی ہو، آج چھٹی کی ہے اسکول سے تو آ کے میرے ساتھ کام کرو کچن میں۔“ اب کے انہوں نے رخ بیٹی کی طرف موڑا۔

”لگتا ہے آنٹی کا پیٹ خراب ہو گیا باسی بریائی سے، مما کو منع بھی کیا لیکن مما کہاں کسی کی سستی ہیں۔“ وہ افسوس سے سوچتے کچن میں چلی آئی۔

☆.....☆.....☆



# فصلہ

کچھ لوگ بظاہر جیسے نظر آتے ہیں، ویسے ہوتے بقول اس کے میں بڑی سخت دل اور بے حس لڑکی  
نہیں۔ انا بیہ علی کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ ہوں، چاہے کچھ بھی ہو جائے مجھے کوئی فرق نہیں





لوگ ہمیں جان سے بڑھ کر پیارے ہوتے ہیں۔  
موت پہلے انہیں ہی ہم سے جدا کر دیتی ہے۔

☆.....☆

اس وقت وہ فائلوں میں سرکھپائے بیٹھی تھی  
جب بیل کی آواز پر ٹیلی فون کی سمیت دیکھا، کام  
کے وقت وہ ہمیشہ اپنا بیل آف رکھتی تھی۔

”جی فرمائیں۔“ دوسری طرف اپنی عزیز از  
جان دوست ہانیہ کی آواز پر اسے اسے خوشگوار سی  
حیرت ہوئی۔

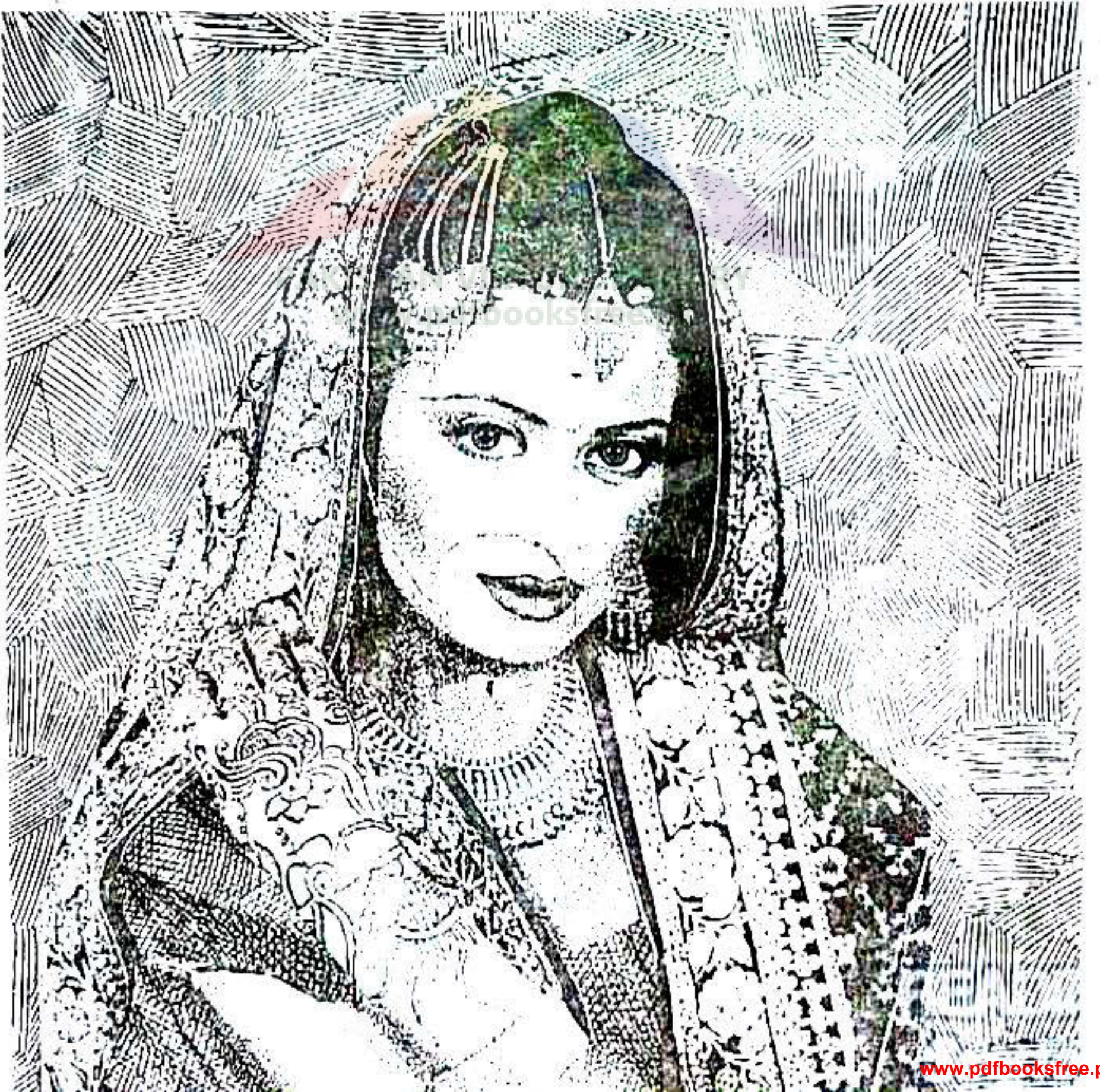
”ہانی! تم نے کیسے مجھے یاد کر لیا آج؟“ اس

پڑتا، بڑی سے بڑی بات میرے لیے معمولی ہوتی  
ہے۔

نود پرشتی کا نول پڑھائے رہنے والی وہ انا بیہ  
در اصل ایک نرم دل لڑکی ہے، بس پر دوسروں کی  
تکلیف کا اتنا ہی اثر ہوتا ہے کہ وہ خود کو پہروں  
کمرے میں بند کیے روتی رہتی ہے۔

بہت کم لوگوں سے دوستی کرنے والی مکر دوستوں  
پر جان تک قربان کرنے والی بیا، اپنی ماما کی وفات  
کے بعد تو جیسے ہنسنا ہی بھول گئی تھی۔

”زندگی میں اس سے زیادہ تلخ اور کچھ نہیں، جو





نہ ہوتا، وہاں بیٹھے ابھی اسے کچھ ہی دیر ہوئی تھی، جب ایک پیاری سی لڑکی اس کے ساتھ آکر بیٹج پر بیٹھی۔

”ہائے آئی ایم ہانیہ اینڈ یو؟“ انا بیہ کے ہاتھ پر مل نمودار ہوئے اسے ہانیہ کی آمد ناگوار گزری تھی۔

”پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می!“ اس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

”کیا ہے یار! ڈسٹرب تو آپ نے مجھے کر دیا ہے۔ اتنی گرمی میں، میں یہاں اس پارک کو دیکھنے چلی آئی، سوچا تھا اس وقت کہاں کوئی ہوگا۔ خوب معمولات مناظر کی پکس لوں گی مگر یہاں تو آپ جناب کو دیکھ کر حیرت ہوئی، پائل میں نہیں ہو چکی، دوپہر کو یہاں چلی آئی، پائل کوئی اور بھی ہے۔“ اس نے شرارت سے انا بیہ کی طرف دیکھا۔

انا بیہ کی نظر انداز کی اور بے رخی سے اسے کوئی فرق نہ ہوا تھا۔ اس کی چھوٹی بہن فریجہ ٹھیک اسے دیکھ رہی تھی جو ایک بار کھینچنے کی ٹھان لیٹی کر کے رہی۔ انا بیہ اپنا بیگ اٹھا کر جانے لگی جب اسے ہانیہ کی آواز سنائی دی۔

”اس میں غصے والی کیا بات ہے۔ آپ مجھ سے دوستی کریں گی؟“ انا بیہ نے چڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں انجان لوگوں سے دوستی نہیں کرتی۔“ یہ کہہ کر وہ گھر کی طرف چل دی۔ جب کہ وہ دیر تک وہاں بیٹھی مسکراتی رہی۔

”نئے مشن کی کامیابی کے لیے دعا کی درخواست۔“ میسج ٹائپ کر کے فریجہ کے نمبر پر سینڈ کرنے کے بعد وہ پکس بنانے میں مصروف ہو گئی۔

”ہانی کی بچی سدھر جاؤ۔“ فریجہ کے رہ پلائی پر وہ اسے بعد میں ساری بات بتانے کا کہہ کر پھپھو کے گھر کی طرف جانے والے راستے پر چل دی۔“

نے شرارت سے کہا۔

”ایکسیکویزمی انا بیہ غلی صلابہ! ہمیشہ میں ہی آپ کو یاد کرتی ہوں اگر دماغ پر ذرا سا زور دے کر سوچیں تو..... پتہ نہیں وہ کون سا لمحہ تھا جب میں نے آپ سے دوستی کے لیے کہا تھا۔“ ہانیہ کی مصنوعی خشکی سے کہنے پر وہ ہنس دی تھی۔

”تمہیں میری ذرا بھی پروا نہیں ہے مجال ہے جو کبھی میری بھی کوئی بات مانی ہو، ہمیشہ اپنی کرتی ہو۔“ دوسری طرف ہانیہ کا لیکچر شروع ہو چکا تھا۔ اس کی پیار بھری ڈانٹ ہمیشہ اسے اچھی لگتی تھی۔ کوئی تو ہے جسے اس کی بھی فکر ہے۔

”جناب! آپ کا لیکچر ختم ہو گیا ہے۔“ عرض فرمائی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ لکچر آپ کی اپنی تیار کیا ہے۔ پاس آئی ہوں، کچھ کمزور ہیں اس وقت لپٹائی کے محاذات سے اٹھانے میں کمی ہوئی۔

”جی ہاں! رات میں سے نہیں لیجئے، کیا تھا۔ آج شاپنگ کے لیے چلیں گے۔“ انا بیہ نے کہا۔

”یہ آہا، ٹشریف لائیں۔“ ہانیہ نے اٹھانے کی زحمت تو ہرگز نہیں کی ہوگی۔ محترمہ کا سہیل ابھی تک آف جو جا رہا ہے۔“ اس کے مان اسٹاپ بولنے پر انا بیہ کا قبضہ بے ساختہ تھا۔

”اف لگتا ہے آج میری خیر نہیں جناب عایہ آج بہت غصے میں ہیں۔“ اس کے کہنے پر دوسری طرف کال کاٹ دی گئی۔ لبوں پر خوب صورت سی مسکراہٹ لیے اس نے ان دینوں کو یاد کیا جب اسے ہانیہ جیسی پیاری دوست ملی تھی۔

☆.....☆

وہ ایک عام سادہ تھا مگر اس کے لیے خاص بن گیا تھا گرمی کی شدت عروج پر تھی۔ جب انا بیہ پتی دوپہر کو پارک میں آکر بیٹھی تھی، یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ اکیڈمی سے واپسی پر گھر سے نزدیکی پارک میں کچھ دیر آکر بیٹھتی، دن کے وقت وہاں کوئی



ہم اس سے ہٹ کر چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے

”خاص لوگوں سے دوستی کی خواہاں ہانیہ! جناب اب تو تعارف بھی کروا دیا ہے۔“ نیچے منہ چڑانے والی اسماعیلی بنی ہوئی تھیں۔

انابہ کو کل والی لڑکی یاد آئی اور چہرے پر خوش نما راہٹ نمودار ہوئی، ناشتہ کرنے کے بعد وہ باہر آ کر بیٹھ گئی۔ موسم کافی اچھا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہاں بیٹھے ہوئے اسے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ اچانک ایک چھوٹا سا پتھر بڑے زور کا اس کے سر پر آ لگا۔ اس نے کوفت سے سائیڈ پر دیکھا جہاں سے پتھر آیا تھا۔ ہانیہ ساتھ والوں کے ٹیس پر سے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ یقیناً یہ اسی کا کارنامہ تھا۔

”مس غصے والی، کیا میں آپ کے گھر آ جاؤں؟“ اس نے اجازت چاہی اور اگلے پانچ منٹ میں وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ ایسے جیسے صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔ بابا کام کے سلسلے میں دو تین دن کے لیے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ باتوں کے دوان اچانک انابہ نے اس سے پوچھا تھا۔

”آپ مجھ سے دوستی کیوں کرنا چاہتی تھیں۔“ تیرے سوا بھی کئی رنگ خوش نظر تھے مگر جو تجھ کو دیکھ چکا ہو وہ اور کیا دیکھے جواب اس نے شعر میں دیا تھا۔ دونوں ایک ساتھ ہنس دیں۔

رفتہ رفتہ دونوں کی گہری دوستی ہو گئی ہانیہ اپنی ہر بات انابہ سے شیئر کرتی، مگر انابہ بہت کم اس پر کھلتی، ہانیہ کو زبردستی باتیں اگلوانا آتا تھا، وہ جب بھی حیدر آباد پھپھو کی طرف آتی، زیادہ وقت انابہ کے ساتھ رہتی تھی۔ اب جب دوستی ہوئی تھی پھپھو کی طرف آنا جانا بھی اس کا کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔

ہانیہ اپنی پھپھو سے ملنے ان کے گھر آئی ہوئی تھی۔ اپنی عادت سے مجبور کل جب اس نے ساتھ والوں کے گھر کا جائزہ لینا شروع کیا تو اس نے دیکھا بلیک کلر کے لباس میں ایک لڑکی وہاں پودوں کو پانی دے رہی تھی، ہانیہ نے نیچے زمین سے مٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹھا کر اس لڑکی کی طرف پھینک دیا۔ جو اسے لگنے کے بجائے اس کے پیر کے ساتھ جا گرا اس لڑکی نے ناگواری سے ادھر ادھر دیکھا۔ مگر کوئی نہ تھا پانی دے کر وہ اندر چلی گئی۔ اسے وہ لڑکی بہت پسند آئی تھی۔

آج اس نے اپنی کزن سے کہا کہ وہ کسی نزدیکی پارک جانا چاہتی ہے۔ دوپہر ہونے کی وجہ سے اس کی کزن نے اسے روکا تھا مگر نزدیکی نئے بننے والے پارک کا ایڈریس پوچھ کر وہ اکیلی ہی چلی آئی تھی۔ پارک میں اندر آتے ہوئے اس نے کل والی اس بلیک ڈریس والی لڑکی کو دیکھا جسے کل اس نے شرارت کا نشانہ بنایا تھا۔ اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ چلوٹل کر دو چار باتیں ہو جائیں گی مگر انابہ نے اسے سرے سے لفٹ ہی نہ کروائی نہ اس کی دوستی کی درخواست قبول کی۔

☆.....☆

وہ ابھی اپنے لیے ناشتہ بنا کر صوفے پر آ کر بیٹھی ہی تھی کہ چوکیدار نے آ کر اسے ایک کارڈ دکھایا۔ ”انابہ باجی! یہ ساتھ والوں کے گھر سے ایک لڑکی نے آپ کو دینے کے لیے کہا ہے۔“ ہاتھ سے بنا ایک دلکش سا کارڈ تھا جہاں باہر کی طرف

”Only for angry girl“

لکھا ہوا تھا۔ ستارے مشعلیں لے کر مجھ کو ڈھونڈنے نکلیں میں رستہ بھول جاؤں جنگل میں شام ہو جائے اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے



سیل پر رابطہ تو تھا ہی مگر سامنے مل بیٹھنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔

☆.....☆

شاپنگ کے بعد وہ ریسٹورنٹ میں آ بیٹھی تھیں۔  
”آج کا مزیدار کھانا میری طرف سے، ہاں ادا یگی مگر حص انو کی طرف سے ہو گی۔“ مینو لکھانے کے بعد ہانیہ نے کہا تو انا بیہ کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

”یار! اپنی سخاوت سنبھال کر رکھو کہیں اور کام آئے گی۔“

”بیا تمہیں معلوم ہے اس بار میں اتنی جلدی یہاں کیوں آئی ہوں؟“ ہانیہ کے اچانک سنجیدگی اختیار کرنے پر اس نے اسے دیکھا تھا۔

”مجھے بابا جانی نے یہاں تمہارے لیے بلایا ہے کہ میں تمہیں سمجھاؤں۔ بابا کا کہا مان لو تم اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ بے جاضر لے کر بیٹھی ہو تم۔ زندگی اکیلے نہیں گزرتی انو۔ بیٹیاں خوشبو ہوتی ہیں جنہیں صرف والدین کا ہی نہیں بلکہ سسرال کا گھر بھی مہکنا ہوتا ہے۔ کراچی اب اتنا دور بھی نہیں کہ تم بابا جانی سے ملنے نہ آ سکو۔“ ہانیہ نے محبت سے اسے سمجھایا۔

”ہانی! فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے میں بابا جانی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ان سے دور رہوں تو ڈر لگتا ہے۔ جب وہ شہر سے باہر جاتے ہیں میں ساری رات جاگ کر گزرتی ہوں، ماما کے جانے کے بعد جس طرح انہوں نے مجھے سنبھالا ہے یہ وہی جانتے ہیں۔ ان کا کہا میرے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے مگر انہیں اکیلے چھوڑ کر جانا..... امپا بل، میں یہ نہیں کر سکتی۔“ دوسری طرف رخ موڑے اس نے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے۔

”بابا کی طبیعت اب خراب رہتی ہے انو! وہ

تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہیں تم اگر ان کا کہنا مان لو تو بہتر ہے۔ اب تو نکاح کو بھی بہت سال ہو چکے، آنٹی کا رخصتی کے لیے اصرار اب بڑھتا جا رہا ہے۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے نفع و نقصان کا سوچ لو، آنٹی فاطمہ کو لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں آخر ان کا بیٹا ڈاکٹر ہے۔ لوگ تو ایسی فیملی کی خواہش کرتے ہیں۔ خدا نخواستہ اگر بابا کو کچھ ہو گیا تو پھر تم کیا کرو گی۔ اکیلے زندگی گزارنا بہت مشکل ہے انا بیہ! آنٹی لوگ بہت اچھے ہیں تم نے ان کے سامنے انکار کیا تھا مگر پھر بھی وہ بار بار بات کرتی ہیں۔ بے جاضر چھوڑ دو۔ اللہ پاک پر بھروسہ رکھو، انشاء اللہ سب اچھا ہوگا۔“ ہانیہ نے اس کے دونوں ہاتھ محبت سے تھام لیے تھے۔

☆.....☆

”بعض اوقات ہم فیصلہ کرتے ہوئے پرسکون نہیں ہوتے۔ ہم کنفیوژ ہو جاتے ہیں کہ یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں مگر پھر کسی بہت اپنے کا مشورہ ہمیں درست فیصلہ کرنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔“

”پر خلوص دوست کسی نعمت سے کم نہیں ہوتے۔“ وہ جو ایک غلط فیصلہ کرنے جا رہی تھی۔ ہانیہ نے کتنی محبت اور خلوص سے اسے سمجھایا تھا، اس کی کہی ہر بات سو فیصد درست تھی، زندگی تنہا نہیں گزرتی، بعض اوقات ہمیں ایسے کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔ جن پر دل و دماغ آمادہ نہیں ہوتے مگر وہی کام ہمارے لیے نفع بخش ہوتا ہے، بروقت صحیح فیصلہ کرنے پر بابا جانی بھی اس کی فکر سے آزاد ہو جاتے، اس نے اللہ کا شکر ادا کیا وہ غلط فیصلہ کرنے سے بچ گئی تھی۔ پلکیں موندھے اس نے سر تکیے پر ٹکا دیا تھا۔

☆.....☆



ثناء ناز

افسانہ

# محبوب فائق عالمی





شام کی چادر دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ سورج دن بھر کی مسافت طے کرنے کے بعد اس وقت ٹھکنے اتارنے کی تیاریوں میں لگن تھا، ہوا میں ہلکی سی خوشگوار خشکی تھی اور چاند ہر سو اپنی ٹھنڈی چاندنی بکھیرنے کو بے قرار ہو رہا تھا۔ جب وہ دنیا جہان سے بے خبر شان بے نیازی سے چلتے ہوئے کانوں میں ہینڈ فری ٹھونسے منہ ہی منہ میں گنگناتے ہوئے اپنے اور دانیہ کے مشترکہ کمرے میں داخل ہوئی۔ کمر تک آتے براؤن سلکی بال سلور کچر میں مقید تھے جب کہ کچھ آزاد شہ اڑتی تھیں اس کے شفاف چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ بیو جینز اور نیوی بلیو ٹاپ جس میں اس کا دلزدہ سا بے حد دلکش لگ رہا تھا۔ بیش قیمت ہینڈ ٹیک مرہا تھیں پٹزافولڈر بیڈ پر اچھالتے ہوئے وہ سونے پرانے می ٹی ٹی اور تھکے ماندے انداز میں اپنے دودھیر پاؤں خوب صورت موتیوں سے جڑی سمور سینڈل سے آزاد کروانے لگ گئی۔

”ریمل! کہاں رہ گئی تھیں تم، کم سے کم آج تو جلدی گھر آتی تمہیں بتایا بھی تھا خالہ بیگم آرہی ہیں۔“ دانیہ، ریمل کی لاپرواہی پر ہنسنے لگی۔

”سو اس میں کیا کروں تمہاری ساس ہیں تم جانو اور تمہارا کام۔ اب میں روز ہر ایرے غیرے کی آمد پر کلاسز تو آف کرنے سے رہی۔ تم جانتی ہو نا میرا فائل ایئر چل رہا ہے۔ پروجیکٹ، اسائنمنٹس سے جان نہیں چھوٹی اور تم مجھے نئے حکم جاری کر دیا کرو۔“ اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

”میری ساس تمہاری بھی کچھ لگتی ہیں، کچھ تو ہوش کے ناخن لو بڑے چھوٹے کا لحاظ ہی نہیں رہا تمہیں۔“ وہ دانیہ کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کانوں میں ہینڈ فون لگائے اپنے فیورٹ میوزک کو انجوائے کرتی رہی۔

”ریمل! میں تم سے بات کر رہی ہوں۔“ دانیہ نے آٹھ کر ریمل کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔

”کیا مصیبت ہے یار؟“ وہ پل بھر میں بھڑک اٹھی تھی۔

”خالہ بیگم آرہی ہیں اٹھو اور اپنا حلیہ درست کرو۔“ اب کی بار دانیہ نے قدرے نرم لہجے میں کہا تھا۔

”ٹھیک تو ہے میرا حلیہ اب اور کتنا ٹھیک کروں۔“ ایک نظر خود پر ڈالنے کے بعد وہ کندھے اچکاتے ہوئے میسج ٹائپ کرنے میں مچو ہو گئی۔

”خالہ ہشام اور تمہاری شادی کی بات چکی کرنے آرہی ہیں۔“

”کیا کہا میری شادی کی بات، وہ بھی ہشام سے دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا جو یوں بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔“ دانیہ کی بات سن کر ریمل یوں اچنی بیسے اسے 440 کا کرنٹ چھو کر گزرا ہو۔

”میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔ تم پناہ دے جتنی جلدی ٹھیک کر سکتی ہو کرو۔ تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔“ دانیہ نے تنک کر کہا۔

”دیکھو دانی! اگر تم مذاق کر رہی ہو تو میری بات کان نہال کر سن لو ایسے تھرڈ کلاس اور گھٹیا مذاق بائیل پسند نہیں ہیں۔“ ریمل اسے خبردار کرتے ہوئے بولی تھی۔

”میں مذاق کیوں کروں گی مجھے خود امی نے بتایا ہے۔ ابو کی طرف سے بھی ہاں ہے۔ ہشام بھائی اور خالہ جان کو تو نہ پہلے کبھی اعتراض تھا اور نہ اب ہے اور تو اور دادا جان تو خوشی سے پھولے نہیں سمارے بلکہ ان کا کہنا ہے یہ تو اللہ کا خاص احسان ہے ہم پر ورنہ ہشام جیسا ہیرو تو چراغ لے کر ڈھونڈتے بھی نہ ملے ہماری ریمل کے لیے۔ ویسے کہہ تو وہ بھی ٹھیک رہے ہیں ہشام ہے ہی ہر لحاظ سے قابل رشک سچی ریمل تم دونوں کی جوڑی چاند سورج کی جوڑی لگے گی۔ خبردار جواب تم نے کوئی ہنگامہ برپا کر کے رنگ میں بھنگ ڈالنے کی کوشش کی۔“ دانیہ، ریمل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر محبت بھرے لہجے میں مان اسٹاپ بولتی چلی گئی۔



”یوسلی وہ امریکن بندر اب وہ چنچے گا میرے ساتھ، دماغ تو تمہارا پہلے ہی خراب تھا اب لگتا ہے تمہاری نظر بھی کمزور ہو گئی ہے۔ جاؤ جا کر کسی ماہر آشوب کو چیک کرواؤ۔ بلکہ اس سے پہلے ذرا امی کے پاس جاؤ اور کہہ دو ان سے مجھے نہیں کرنی کسی سے شادی۔ اگر انہوں نے زبردستی کی تو میں.....“

”اسٹاپ اٹ ریمیل۔“ دانیہ نے بات کاٹی تھی۔

”آج نہیں تو کل تمہاری شادی کرنی ہے۔ ہمیں اب ساری زندگی تمہیں گھر میں بٹھا کر تو نہیں رکھ سکتے۔ بچی نہیں ہو تم جو ایک ہی بات تمہیں بار بار سمجھائی جائے۔“ وہ ایک دم متفکری ہو گئی۔

”دانیہ! میں نے یہ کب کہا کہ مجھے شادی نہیں کرنی میں تو بس اتنا کہہ رہی ہوں مجھے ہشام سے شادی نہیں کرنی۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی تھی۔

”کیوں کیا کی ہے ہشام میں تعلیم یافتہ ہے ماشاء اللہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرت بھی ہے ویل سیٹل ہے اور سب سے بڑھ کر وہ تمہیں بچپن سے چاہتا ہے۔ اب اور کیا چاہیے تمہیں عیش کروگی، جتنی اچھی خالہ ہیں ہماری ماما ہمیشہ کہتی تھیں خالہ جیسی ساس کسی قسمت والی کو ملے گی اور وہ بالکل ٹھیک کہتی تھیں خالہ جیسی اچھی ساس کوئی اور دنیا میں ہو ہی نہیں سکتی۔“ دانیہ بڑی بہن ہونے کا فرض بخوبی نبھارہی تھی۔

”دیکھو ریمیل! زندگی میں ہمیشہ وہی نہیں ملتا جو ہم نے مانگا یا سوچا ہوتا ہے، کبھی کبھی ہمیں دوسروں کی خوشیوں کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ دوسروں کی خواہشات کے لیے کپرو مانز کرنا پڑتا ہے۔ یہ جو زندگی ہے نا محض اپنی خواہشوں کے حصول کی خاطر نہیں گزاری جاسکتی، جب خاندان کے سبھی افراد کی یہی خواہش ہے تو جلیز تم ان کی خوشیوں کا پاس رکھ لو اللہ کے حکم سے تمہیں کبھی مایوسی نہیں ہوگی۔ اب چپ چاپ اٹھو اور تیار ہو کر فوراً نیچے آؤ۔ خالہ بیگم بس پہنچنے والی ہوں گی میں ذرا کچن میں

جا کر انتظامات سنبھال لوں۔“

”اف حد ہے یار!“ وہ غصے سے اسمارٹ فون صوفے پر پٹختے ہوئے چیخنگ روم میں گھس گئی۔

کہنے کو تو دانیہ اور ریمیل جڑواں بہنیں تھیں مگر شکلوں کے ساتھ ساتھ ان کی عادتوں میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا۔ ریمیل ہو بہو ماں کا پرتو تھی۔ پشت تک آتے لمبے سنہری بال گندم کے خوشوں کی مانند چمکتی ہوئی دلکش سنہری رنگت، سنہری آنکھیں جن میں زمانے بھر کا خمار چھلکتا تھا۔ کچھ وہ قدرتی خوب صورت تھی کچھ جب تک سک سے تیار ہوتی تو اس کی پروقار شخصیت ہر دیکھنے والے کے دل میں خود بخود گھر گر جاتی۔ اس کے برعکس دانیہ کے مین نقوش فاروقی صاحب (ابو) سے ملتے جلتے تھے۔ خاص کر چمکدار سیاہ آنکھیں اس کی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ کسی بھی چیز کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت اس میں ریمیل سے کہیں زیادہ تھی جب کہ ریمیل عادتاً جذباتی اور ضد کی انا پرست لڑکی تھی۔

دانیہ اور ریمیل جیسے ہی گریجویشن کر کے فارغ ہوئیں خالہ بیگم نے جھٹ پٹ اپنے دونوں لڑکوں سانول اور ہشام کے لیے ان کا ہاتھ مانگ لیا۔ ریمیل نے ہائر اسٹڈی کی آڑ لے کر شادی سے انکار کر دیا جب کہ دانیہ نے ماں باپ کے فیصلے کو بخوشی قبول کر لیا۔ دانیہ کی شادی کے بعد گھر کی ذمہ داری مکمل طور پر ریمیل کے نازک کندھوں پر آ پڑی تھی۔ جسے وہ مجبوراً کسی نہ کسی طرح نبھارہی تھی۔

☆.....☆

”ہشام صاحب! آخر مسئلہ کیا ہے۔ آپ کے ساتھ کیا سمجھتے ہیں آپ میرے ہاتھ میں اپنے نام کی انگوٹھی پہنا دیں گے اور میں چپ چاپ اپنا آپ مکمل طور پر آپ کو سونپ دوں گی۔ دانیہ بن کر ساری زندگی آپ کی پوجا کروں گی۔ ایک بات میری آپ کان کھول کر سن لیں نہ تو میں آپ سے شادی کروں گی



اور نہ ہی مجھے کوئی شوق ہے آپ سے کسی بھی قسم کا رشتہ استوار رکھنے کا آئندہ پلیز میرے راستے میں مت آئیے گا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ اب کی بار اس نے بھی کسی قسم کا لحاظ نہ رکھنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

ہشام، خالہ بیگم کے کہنے پر ریمیل کے ساتھ انجمنٹ کی شاپنگ کرنے آیا تھا۔ گھر میں تو وہ بھی مرد و ناسب کے سامنے چپ رہی اور دل ہی دل میں جلتی کڑھتی ان کے ساتھ چل دی مگر شاپنگ مال میں انٹرہوتے ہی اس نے اپنے دل کا غبار نکالنے میں ایک سیکنڈ نہیں لگایا۔ ریمیل کی بات سن کر جہاں ہشام سکتے میں آیا تھا وہیں دانیہ کے چہرے پر بھی ندامت اور پریشانی کے آثار پھیلے تھے۔

”ریمیل! تم حد سے بڑھ رہی ہو آخر برائی کیا ہے ہشام میں؟“ دانیہ اسے بازو سے پکڑ کر تقریباً کھینچتے ہوئے ہشام سے دور لائی تھی۔

”دانی ان سے کہو مجھ سے شادی کا خیال دل سے نکال دیں۔ مجھے ان سے شادی نہیں کرنی کیونکہ نہ یہ میرے آئیڈیل ہیں اور نہ ہی سول میٹ، انہیں میرے کپڑوں سے جڑ ہے، انہیں میری کمپنی پر اعتراض ہے۔ یہ مشرق ہے تو میں مغرب، ہمارا گزارا ایک ساتھ ناممکن ہے اور میرے خیال میں جن رشتوں کے بعد میں ٹوٹنے کا خدشہ ہو ان رشتوں کی بنیاد سرے سے رکھنی ہی نہیں چاہیے اور پھر یہاں تو ساری بات ہی دل کی ہے۔ جب دل ہی راضی نہ ہو تو دوپل کا ساتھ نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ شادی تو پھر تاحیات کا بندھن ہے۔“ بالآخر وہ دل میں پلنے والے سبھی خدشات کو زبان دیتے ہوئے روہاسی ہو کر بولی تھی۔

”واٹ کیا کہا تم نے؟“ دانیہ ناگہی کے عالم میں اسے تکتی جا رہی تھی۔

”ریمیل تم..... تم پڑھی لکھی ہو کر بھی ایسی احمقانہ سوچ رکھتی ہو توف ہے تم پر۔“

”اب ساری زندگی تمہیں تمہارے مسٹر سول میٹ

نہ ملے تو کیا یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھی رہو گی۔ کچھ تو ہوش کے ناخن لو لڑکی۔“ ریمیل کی اس قدر بچکانہ سوچ پر دانیہ کا دل چاہا کہ وہ اپنا سر پیٹ لے۔

”میرا یقین ہے دانی! ایک دن مجھے وہ ضرور ملے گا جو بن کہے میری ہر خواہش جان لے گا، جسے کبھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوگی جو میری آنکھوں میں دیکھے گا اور میرے دل کے سبھی راز پڑھتا چلا جائے گا۔“

ریمیل کسی بات کے زیر اثر پختہ لہجے میں بولی تھی۔

”ہشام اپنی محبت کی تذلیل پر دل برداشتہ تو بہت تھا پر ضبط کے گھونٹ پی کر ان کے فریب چلا آیا۔“

”بھابی! ان سے کہیں انہیں میری وجہ سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ویسا ہی ہوگا جیسا یہ چاہیں گی ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔ ویسے بھی جہاں دل ہی راضی نہ ہو وہاں زبردستی کے رشتوں کا کوئی مول نہیں ہوتا۔“ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ رکنا نہیں بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا شاپنگ مال سے باہر نکل گیا اور دانیہ ریمیل کی ہٹ دھرمی پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

☆.....☆

”کل خالہ بیگم آئی تھیں ہشام کا رشتہ لے کر۔“ ریمیل بجھے بجھے لہجے میں سامنے بیٹھے علی کو گزشتہ شام کی سرگزشت سنارہی تھی۔ اس وقت وہ دونوں کیفے ٹیریا میں بیٹھے باہر برستی بارش سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”تو تم نے ہاں کر دی۔“ علی ازلی لا پرواہی چہرے پر سجائے کافی کا سپ لیتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”میں ہاں کیسے کرتی؟“ وہ الٹا دست سوال ہوئی۔

”کیوں بھئی ہشام اچھا لڑکا ہے، امریکہ میں رہتا ہے اور تمہیں کیا چاہیے تمہاری جگہ کوئی اور ہوتی تو بنا سوچے سمجھے فوراً ہاں کر دیتی۔“ وہ اب چکن پیٹیز کے ساتھ بھرپور انصاف کرنے میں مگن تھا۔ جب کہ ریمیل نم آنکھوں کے ساتھ اس کے دھندلے پڑتے



چہرے کو پڑھنے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ جہاں ابھی تک کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔

علی اور ریمیل کا شمار یونیورسٹی کے ٹاپ ٹین اسٹوڈنٹس ہوتا تھا۔ ان کی پہلی ملاقات دو سال پہلے ہونے والے ایک کونز میٹیشن میں ہوئی تھی۔ دونوں ممبران کو اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی نمائندگی کرنا تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سرسری سی ملاقات دوستی میں کب بدلی، وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ شاید اس دوستی میں سب سے بڑا ہاتھ ان کی ذہنی ہم آہنگی کا تھا۔

”ایسا سکیوز می Can I sit here؟“ وہ ایبھریونی میں بیٹھی کچھ کتابوں کا مطالعہ کرنے میں لگی تھی کہ علی کے اس طرح اچانک مخاطب کرنے پر اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔

”شیور۔“ وہ پروقار لہجے میں کہہ کر دوبارہ ارد گرد بکھرنے لگا۔

”تینکس“ میں علی ہوں۔ ”ایبھریونی“ ڈیپارٹمنٹ سے۔ وہ شائستگی سے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔ ”تو.....؟“ ریمیل نے سر اٹھائے بغیر بے زاری سے جواب دیا۔

”پرسوں اسلام آباد میں آل پاکستان یونیورسٹی ایکسپو ہے۔ ہماری یونیورسٹی کی ڈیپٹنگ سوسائٹی نے اس ایونٹ میں شرکت کے لیے آپ کا اور میرا نام نامزد کروا دیا ہے، سو میرے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹس کی طرف سے یہ آرڈر تھا کہ میں آپ سے مل لوں اور اس میٹیشن کے بارے میں ڈسکس کر لوں۔“ وہ اپنی پوزیشن کلیئر کرتے ہوئے تیز تیز بولا تھا۔

”اوہ.....! میں ریمیل ہوں سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ سے۔“ اب کی بار اس کا لہجہ قدرے نارمل تھا۔

”ریمیل..... تم اشارز پر یقین رکھتی ہو۔“ وہ میٹیشن کے لیے کمپائن اسٹڈی کر رہے تھے کہ اچانک موڈ خوشگوار کرنے کے لیے علی نے سوالات کا سلسلہ جوڑ لیا۔

”انجوائے منٹ کے لیے لیکن پریکٹیکل نہیں۔“ وہ سرسری سا جواب دے کر دوبارہ نوٹس بنانے میں مصروف ہو گئی۔

”تمہارا اشار کون سا ہے؟“

”لیبرا۔“

”اوہ ریمیل میرا اشار بھی لیبرا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

”اور ڈیٹ آف برتھ؟“

”18 اکتوبر۔“

”واٹ تم یقین نہیں کرو گی پر میری ڈیٹ آف برتھ بھی یہی ہے۔“ وہ حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات لیے اچھلا تھا۔ اس کے بعد تو گویا ان کے لیے ایک نیا کیمیل شروع ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ جان لینا چاہتے تھے۔ علی، ریمیل سے ایک کے بعد ایک سوال پوچھتا اور ہر سوال کا جواب خود میں بھی موجود پاتا، اب اسے اپنی اور ریمیل کی ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سمجھ آنے لگی تھی۔

علی کا تعلق ایک مڈل کلاس گھرانے سے تھا۔ وہ اکلوتا تھا باپ کی وفات کے بعد ساری ذمہ داری اس کے کندھوں پر آ پڑی تھی۔ کلاسز اٹینڈ کرنے کے بعد وہ رات گئے تک ہوم ٹیوشنرز دیا کرتا تھا۔ یوں اس کی زندگی کا پہیہ کسی نہ کسی طرح چل رہا تھا۔ جب حالات گردش میں آجائیں تو انسان صبر کے بجائے اونچی اڑان اڑنے کی کوشش میں ہلکان ہوا پھرتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت علی کی تھی۔ وہ راتوں رات امیر ہونے کے خواب بنایا کرتا تھا۔ ماسٹر مائنڈ تو وہ تھا ہی اس کے ذہن میں آنے والے وقت کو لے کر پوری پلاننگ موجود تھی۔

☆.....☆

ریمیل اور علی کا زیادہ تر وقت ایک ساتھ گزرتا تھا۔ دونوں کی پسند ناپسند تقریباً ایک جیسی تھی۔ دونوں کی عادتوں میں بھی زیادہ فرق نہ تھا۔ دونوں بولنے پر آتے تو گھنٹوں باتیں کرتے رہتے، کبھی چپ بیٹھتے تو



ان کے درمیان مکمل خاموشی کا راج ہوتا، دونوں کئی کئی گھنٹے ساتھ گزارتے، ملکی، غیر ملکی نصابی غیر نصابی ہر طرح کے موضوعات پر ڈسکس کرتے۔ ریمیل کو علی کی شکل میں اپنی تصوراتی دنیا کا آئیڈیل مل چکا تھا۔ وہ اپنے دل میں قید جذبوں کو علی پر عیاں کرنا چاہتی تھی مگر حیا تھی کہ ہر بار آڑے آ جاتی تھی۔ وہ زمانے کے لیے لاکھ بولڈ سہی مگر اندر سے تھی تو ایک لڑکی حیا کے رنگوں میں ڈھکی چھپی شرم و حیا کا لاجواب پیکر، علی کے سامنے آتے ہی اس کی زبان کنگ ہو جاتی تھی۔ الفاظ خود بخود ساتھ دینا بھول جاتے تھے۔

آج وہ دونوں بڑی مدت کے بعد اپنے فیورٹ ریسٹورنٹ میں اکٹھے تھے۔

”تو پھر کیا سوچا تم نے؟“ ویٹر کو آرڈر لکھوا کر علی نے موبائل ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”کس بارے میں؟“ وہ الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی جانب تنکے لگی۔

”آف کورس یار ہشام کے بارے میں۔“ وہ کندھے اچکا کر بولا تھا۔

”بتایا تو تھا میں نے یا کر دی۔“

”مگر کیوں؟“ وہ واقعی انجان تھا یا پھر جان بوجھ کر اس کے ضبط کا امتحان لے رہا تھا۔

”تم اپنے گھر والوں سے بات کب کرو گے۔“

ریمیل مہارت سے بات بدلتے ہوئے بولی تھی۔

”کس بارے میں؟“ وہی ازلی لا پرواہی وہی پرسکون تاثر وہ کچھ اندازہ نہ لگا پائی۔

”بھئی ہماری شادی کے بارے میں اور کس بارے میں۔“ آج وہ جیسے ہر بات کرنے کا تہیہ کر آئی تھی۔

”واٹ.....!“ پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا تھا۔

ریمیل ریسٹورنٹ میں موجود لوگوں نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا پھر واپس اپنی اپنی دنیا میں مگن ہو گئے۔

”میں نے یہ کب کہا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ ریمیل کی بات سن کر وہ ایک دم چونکا تھا۔

”دیکھو ریمیل! میری بات تسلی سے سنو تم کردار کی مضبوط اور بلا کی ذہین لڑکی ہو، ہر کوئی تمہیں پا کر فخر کرے گا مگر مجھے معاف کرنا وہ کوئی میں کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے تمہیں ہمیشہ دوست کی نظر سے دیکھا ہے۔ پھر تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا میں اپنے گھر والوں کو تمہارے گھر بھیجوں گا؟“

باہر برستی بارش کا شور ریمیل کے دل میں کہرام مچا رہا تھا۔ کتنے لمحے وہ پلکیں جھپکے بنا سامنے بیٹھے بے حس پتھر دل انسان کو نم آنکھوں سے تکتی رہی۔ اسے جیسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

ذرا سی دلچسپی ذرا سی توجہ جانے کیوں ہمیں اس دہم میں مبتلا کر دیتی ہے کہ فریق ثانی کو بھی آپ سے اتنی ہی محبت، اتنی ہی چاہت ہے جتنی کہ آپ کو اس شخص سے وہ بھی آپ کے لیے اتنا ہی بے قرار ہے جتنا کہ آپ خود اس شخص کے لیے مگر یہ جو محبت ہوئی ہے نا اسے محض وہمات کی بنا پر نہیں جیتا جاسکتا۔

”پر تم تو کہتے تھے میں تمہارا سہارا ہوں اور یہ بھی میں نہیں ہوتی تو تم ہمت ہارنے لگتے ہو۔ تمہارے ہی کہے گئے الفاظ ہیں نا یہ؟“ وہ ٹھکرائے گئے دل کی تسکین کی خاطر جانے کس بنا پر پھر سے تصدیق کر رہی تھی۔

”اوہ کم آن ریمیل! کیا ہو گیا ہے تمہیں ہم اچھے دوست ہیں اور اس دوستی کی بیس پر میں اب بھی تمہیں یہی کہوں گا تم نے ہر موڑ پر میرا ساتھ نبھایا ہے، تم میرے لیے بہت خاص ہو اور ہمیشہ رہو گی لیکن تم میں وہ سب نہیں ہے جو میں اپنی لائف پارٹنر میں دیکھنا چاہتا ہوں، میں سمجھ نہیں پا رہا تم میرے بارے میں ایسا کیسے سوچ سکتی ہو۔ مجھے یقین نہیں آرہا سب جاننے کے باوجود بھی کہ میں بچپن سے اپنی کزن سے منسوب ہوں تم ایسا خیال دل میں لا کیسے سکتی ہو۔“ وہ اسے کچھ جتانے ہوئے حنفی سے بولتا جا رہا تھا۔



”ہم سول میٹ ہیں علی! ہم چاہیں تو لائف میں بہت اچھی طرح ایڈجسٹ کر سکتے ہیں۔“ ریمیل ایک بار پھر سول میٹ پر اڑ گئی تھی۔

”کن خوش فہمیوں میں رہتی ہو بی بی، یہ دنیا ہے، حقیقی دنیا کسی آئیڈیل پرسن کا انتظار کرو گی تو پھپھو جان کی طرح بیٹھی رہو گی۔ پوری زندگی بیت جائے گی مگر ہاتھ کچھ نہیں آئے گا سوائے پچھتاوے کے۔“ دانپہ کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

”کتنا سچ کہتی تھی وہ لڑکی ایکسکیزومی مس ریمیل سول میٹ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے تم میری آئیڈیل تو نہیں ہوتا۔“ تمسخر سے کہتا ہوا وہ ریمیل کے جذبات کا مذاق اڑاتا چلا گیا۔ مزید بیٹھنا بے کار تھا۔ وہ اشک برسانی دھندلی آنکھوں کے ساتھ اندھا دھن بھاگتی ہوئی ریسٹورنٹ سے باہر آئی۔ باہر برستے بادل لمحہ بہ لمحہ شدت اختیار کر رہے تھے۔ دل جیسے غم کے مارے بیٹھنے کو بے قرار تھا۔ وہ ہوش و حواس سے عاری بیگانگی کے عالم میں یونہی سڑک کے کنارے چلتی رہی۔

”میں نے ایسا کب کہا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ آنسوؤں نے ایک بار پھر شدت اختیار کی تھی۔

”تم میں وہ سب نہیں ہے جو میں اپنی لائف پارٹنر میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ ہچکیاں بھرتی وہیں سڑک کے کنارے پر پڑے بیچ پڑھنے لگی۔

”ایکسکیزومی مس ریمیل! سول میٹ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے تم میری آئیڈیل تو نہیں ہوتا.....“ علی کے الفاظ مسلسل اس کے کانوں میں سیسہ انڈیل رہے تھے۔ احساسات کی اس قدر تذلیل کیے جانے پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ یہ جانے بغیر کہ اس وقت وہ ایک پبلک پلس پر بیٹھی لوگوں کی سوالیہ نگاہوں کا نشانہ بن رہی ہے۔

کہتے ہیں محبت جب وار کرتی ہے تو انسان کو ہر شے سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ کچھ ایسی ہی بے خودی کی

کیفیت اس وقت ریمیل کی بھی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی گہرے اذیت ناک ذہنی صدمے سے گزر رہی ہو۔ اچانک ایک بلیک مرسدیز اس کے پاس آ کر رکی۔ ہشام جو خراب موسم کے پیش نظر خالہ جان کی ہدایت پر ریمیل کو پک کرنے یونیورسٹی جا رہا تھا۔ اسے ایسی حالت میں بیچ سڑک پر روتا دیکھ کر تڑپ سا اٹھا، زرد پتوں کے بیچ زرد چہرہ لیے برستی بارش میں تنہا بیٹھی وہ اس اداس شام کا اجڑا ہوا منظر لگ رہی تھی۔ وہ کچھ بے قراری اور کچھ اضطراب کی کیفیت میں تقریباً دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا جو بارش میں مسلسل بیٹھے رہنے کی وجہ سے تھر تھر کانپنے جا رہی تھی۔

”ریمیل تم ٹھیک تو ہونا؟“ ہشام نے تیزی سے اپنا اوور کوٹ اتار کر ریمیل کے گرد پھیلا دیا۔ ریمیل نے اٹھی ہوئی نگاہوں سے ایک نظر اس کے چہرے کی جانب دیکھا اور پھر اپنے حواسوں پر قابو نہ رکھتی ہوئی وہیں اس کی بانہوں میں جھول گئی۔

ریمیل کی اجڑی حالت اور سرخی مائل آنکھیں دیکھ کر ہشام بخوبی جان گیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑی شکست کا سامنا کر کے لوٹی ہے اور کیسے نہ جانتا ایک عرصہ وہ بھی بہارِ رت کے لیے ترسا تھا۔ ایک عرصہ اس پر بھی خزاں کی آمد رہی تھی۔ ایک عرصہ یہ ٹوٹے ہوئے زرد پتے اس کے بھی ہماراز رہ چکے تھے جنہیں وہ روز اپنے دل کی روداد سنایا کرتا تھا۔ پر آج یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے محبت کی راہ گزر پھولوں سے سخن والی ہو۔ جیسے زندگی کی سبھی مسافتیں یک دم ختم سی ہو گئی ہوں۔

ریمیل کو بحفاظت گھر ڈراپ کرنے کے بعد وہ مطمئن سا ہو کر آگے کی جانب بڑھ گیا۔ اسے واپس لوٹنا تھا اپنی متاعِ حیات کو ہمیشہ کے لیے لے جانے کے لیے۔ ”محبت فاحِ عالم“ کسی نے ہولے سے اس کے کانوں میں سرگوشی کی تھی اور جو اب وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ اداس زرد پتوں کا موسم ڈھل چکا تھا۔



آگے کا راستہ بہت حسین تھا۔ کیونکہ محبت کے گیت گاتے، پھول اور ملن کی سرگوشیاں کرتے شوخ پتے اس کے منتظر جو تھے۔

☆.....☆

آج یونیورسٹی میں اس کا آخری دن تھا۔ وہ جلدی جلدی تھیسز رپورٹ کروا کر اتھل پھل کرتے دل کو سنبھالتے ہوئے پارکنگ ایریا تک پہنچی جہاں خوشیاں بانہیں پھیلائے بے تابی سے اس کی منتظر تھیں۔ پچھلے ہفتے خالہ بیگم اسے ہشام کے نام کی ایک نفیس سی رنگ پہنا گئی تھیں۔ بے درد ماضی کو ایک بھیاں خواب سمجھ کر وہ کب کا فراموش کر چکی تھی۔ بظاہر وہ اس رشتے سے بہت خوش تھی۔ دماغ سے آئیڈیلزم کا بھوت اترتا تو ہشام اپنی تمام تراچھائیوں کے ساتھ اس کے دل میں آن بے۔ جیسے جیسے شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہشام کی تذلیل کو لے کر طرح طرح کے خدشات اس کے ذہن و دل پر دستک دے رہے تھے۔ اب اس میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ وہ ڈائریکٹ ہشام سے بات کر لے اس سے اپنی نادانیوں کی معافی مانگتی۔ بالآخر کافی سوچ بچار کے بعد اس نے ہشام کو میسج کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ لینڈ لائن اسکرین پر چمکتے ہشام کے نمبر نے اس کی ساری توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی۔ بمشکل دل کو سنبھالا اور لیس کا بٹن دباتے ہوئے ریسپورکان سے لگایا۔

”السلام علیکم، کیسی ہیں آپ؟“ ریسپور میں سے ہشام کی شوخ آواز ابھری تھی۔

”وعلیکم السلام میں ریمیل بات کر رہی ہوں۔“ دوسری جانب مکمل طور پر خاموشی چھا گئی۔

”ہشام مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ ریمیل نے ڈری سہمی آواز میں خاموشی کا تسلسل توڑا۔

”جی کہیے۔“ مودبانہ انداز میں کہا گیا۔ وہ سب

الفاظ جو اس نے ہشام کو کہنے کے لیے سوچ رکھے تھے یک دم دماغ کی سلیٹ سے مٹنے لگے۔

”وہ مجھے..... ہشام.....“ زبان لڑکھڑا گئی تھی۔ پچھتاوے اور ندامت کے کئی لمبے جملے آنسو اس کے سفید پڑتے گالوں پر آر کے تھے۔

”ریمیل! پہلے رونا بند کریں۔“ وہ بے آواز روئی تھی مگر ہشام جان چکا تھا۔

”آپ کو کیسے پتا چلا میں رو رہی ہوں؟“ وہ نم لہجے میں پوچھنے لگی۔

”ریمیل صاحبہ! جو دل میں بستے ہیں ان کی تو سانس بھی سات سمندر پار سنائی دیتی ہے آپ تو پھر میری ذات کا ایک حصہ ہیں۔ ابھی آپ مجھ سے معافی مانگنے والی تھیں تو جناب آپ کو آگاہ کرتے جائیں معاف

انہیں کیا جاتا ہے جن سے کوئی گلہ ہو، مجھے تو آپ سے کبھی کوئی گلہ تھا ہی نہیں تو پھر معافی کسی۔ ان فیکٹ آپ کا ہر لفظ ہر انداز میرے لیے تحفہ ہے محبت کا نایاب تحفہ، جس عمر میں بچے محبت کے صحیح معنوں سے بھی آشنا نہیں ہوتے اس عمر سے میں آپ کے خواب دیکھ رہا ہوں۔ مجھ سے بہتر آپ کو اور آپ کے دل میں پلنے والی خواہشوں کو بھلا کون جان سکتا ہے۔“ محبت اور سچے

جذبوں کی چاشنی میں ڈوبی ہشام کی آواز اسے خوابوں کے حسین نگر لے پہنچی تھی۔

”خیر میں نے فون یہ بتانے کے لیے کیا تھا کل یونیورسٹی کے بعد تیار رہیے گا امی جان نے ہونے والی بہو کو ڈھیر ساری شاپنگ کروانی ہے۔“ ہشام اپنے مخصوص لہجے میں بولتا چلا گیا۔

”زندگی میں محظ اپنی خواہشوں کے حصول کے لیے نہیں جیا جاسکتا۔“ وہ ایک بار پھر دانیہ کی بات سے متفق ہوئی تھی۔

”نئی صبح اس کے دل کے سونے آنگن میں بے پناہ خوشیاں لے کر اترنے والی تھی۔

☆.....☆



نائلہ طارق  
سلسلے وار ناول

# لجے عشق، بسین، بڑا لاکھڑا کر

بوسیدہ اور قدیم عمارتوں کا یہ عبقی حصہ تھا جہاں ایک چوڑی اور طویل سڑک موجود تھی۔ سڑک کے دوسری جانب پچھلی باؤنڈری سے دور کافی ہٹ کر چچی مگر محدود آبادی والی بستی تھی اور اس وقت وہاں تاریکی میں چند ہی ٹمٹماتی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ سڑک کے کنارے موجود پول پر ایک اسٹریٹ لائٹ روشن تھی اور اس





کی دور دور تک بکتری تیز زرد روشنی میں "وہ" موجود تھا۔ وہ جس کا وجود اسٹریٹ لائٹ سے بھی زیادہ روشن اور منور۔ وہ انسانی وجود واقعی نظر بھر کر دیکھنے اور پھر دیکھتے ہی رہ جانے کے قابل تھا۔ کوئی عجیب سی کشش تھی اس میں ٹھٹھکے دینے والی، چونکا دینے والی عجیب مگر انوکھی ہیئت کے سیاہ لانگ شوز کے ساتھ بلیک لیدر کی چمکتی چست پیٹ میں اس کی ٹانگیں انتہائی پرکشش دکھائی دے رہی تھیں۔ خون کورگوں میں منجمد کر دینے والی سردی میں اس کے جسم سے چمکی بغیر آستینوں کی سرخ رنگ کی شرٹ دور سے ہی جھلملائی دکھائی دے رہی تھی۔ برہنہ بازوؤں پر رگمیں نقش و نگار نمایاں تھے۔ اس کے ہاتھوں اور گردن میں مختلف وضع طرز کی زنجیریں موجود تھیں اور انگلیاں خوب صورت انگوٹھیوں سے لیس تھیں۔ اس کے سرخ و سپید چہرے کے نقوش بے حد جاذب نظر اور چمکتے ہوئے تھے، جن میں نوجوانی اور مصومیت کی چمک بھری ہوئی تھی مگر اس کی آنکھیں

نہیں دیکھتی





معصومیت کی چمک سے عاری تھیں۔ بے شک ان بڑی بڑی شہدریگ آنکھوں میں مد مقابل کو مبہوت کر دینے والی صلاحیت موجود تھی مگر ان میں عقاب جیسی تیزی اور عیاری موجود تھی۔ اسے دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس کا شمار ایسی مخلوقات میں ہوتا ہے جو آدھی رات میں سڑکوں پر گھومتی پائی جاتی ہیں۔ وہ مخلوقات جو بہت مخصوص اور مخصوص جگہوں پر با آسانی دکھائی دے جاتی ہیں مگر وہ ان سب سے الگ ہے اس کے ریٹ عام اسٹریٹ ورکرز سے کافی زیادہ تائی ہیں۔ شہر کے مہنگے ترین کال بوائےز میں اس کا نام ناپ پر ہے باوجود اس کے کہ وہ کسی کے ماتحت نہیں نہ ہی اس کی بیک پر کوئی مخصوص سپورٹ ہے۔ دوسرے کئی اسٹریٹ ورکرز کی طرح سڑکوں پر گھوم پھر کر اس نے کبھی کسٹمرز کو تلاش نہیں کیا شاید وہ اس بات پر زیادہ یقین رکھتا ہے کہ پیاسا ہمیشہ خود چل کر کنویں کے پاس آتا ہے۔ ویسے بھی وہ کافی نفیس اور نازک مزاج طبیعت رکھتا ہے۔ سڑکوں پر کسٹمرز کی تلاش میں خوار ہونے کے بعد ٹھکن کے باعث وہ یقیناً بہتر سروس مہیا کرنے کے قابل نہیں رہ سکتا تھا اور پھر یہ بھی کہ اس طرح بھٹکنے کے دوران اسے غیر مہذب لوگ بھی ٹکرا سکتے تھے جب کہ ایسے لوگوں کی طرف دیکھنا بھی اس کی برداشت سے باہر تھا۔ جب مہذب اور ہائی کلاس کے افراد خود اس تک اسے ڈھونڈتے ہوئے آتے ہیں تو اسے ضرور ہی کیا بھی خواری اٹھانے کی حالانکہ اس کے کسٹمرز اس کے ریٹ سن کرتے مہذب میں ضرور پڑ جاتے تھے مگر اس کی مقناطیسی شخصیت ان کو سب کچھ بھلانے پر مجبور کر دیتی تھی ہر بار وہ ڈیلنگ کے دوران ہی اپنی منہ مانگی قیمت طلب کرتا تھا۔ وہ بھی کیش کی شکل میں۔ رقم کے معاملے میں کوئی کمپروماز نہیں۔ اس کی بے نیازی اس کی شخصیت کا اہم خاصہ تھی۔ ڈیلنگ میں وہ اپنی شرائط پہلے رکھتا تھا۔ سب سے اہم تو یہی کہ وہ کسی بھی قسم کی ڈرگز اور رقص وغیرہ سے اجتناب کرتا ہے۔ کسی بھی قسم کے Violence کے خلاف وہ اپنی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ہر چیز میں پہلے اس کی رضامندی ضروری ہے۔ اس کے پاس ایسے کسٹمرز بھی آتے تھے جن کو صرف ایک اچھے سامع کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ساتھ وہ اچھے ماحول میں ڈنر کر سکیں۔ اپنی پرابلمز اور پرسنلوشیئر کر سکیں اور اس سب کے لیے وہ ایک آئیڈیل بوائے فرینڈ تھا۔

اسٹریٹ لائٹ کی زرد روشنی میں وہ دسلنگ کرتے ہوئے چہل قدمی کر رہا تھا۔ مہکتے بھڑکتے لباس میں اس کی چال مکمل اور خالص مردانہ تھی مگر کچھ لالہ بالی اور لاپرواہی کا عنصر بھی موجود تھا۔ یکدم ہی چونک کر رکتے ہوئے اس نے ایک طائرانہ نگاہ اپنے اطراف میں دوڑائی تھی۔ ایک بار پھر اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ مسلسل کسی کی نظروں کے حصار میں ہے اور آج یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا حالانکہ اس وقت دور دور تک اس کے علاوہ کوئی آدم زاد نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ سڑک سے بھی کوئی گاڑی گزرتی تو سنا نا چند لمحوں کے لیے ٹوٹ جاتا۔ ویسے بھی اس کڑا کے کی سردی میں کوئی اسے ٹکنے کے لیے وہاں نہیں رک سکتا تھا۔ سر جھٹکتے ہوئے اس نے سفید پول سے پشت نکالی تھی اور سینے پر بازو باندھ کر آسمان پر چھائی دھند کو دیکھنے لگا تھا۔ اس جگہ کا انتخاب اس نے ہفتے بھر پہلے ہی کیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے وہ کسی اور اسٹریٹ پر ہوتا تھا۔ جس پر فیشن میں وہ تھا جیسی اور رقابت اس میں بھی موجود تھی۔ پولیس کا چھاپہ اچانک پڑا تھا۔ بروقت اگر وہ منظر سے غائب نہ ہوتا تو یقیناً کسی لاک اپ میں ہوتا۔ کچھ دن پوشیدہ رہنے کے بعد منظر پر آنے کے لیے اس نے یہ موجودہ اسٹریٹ تلاش کر لی تھی اور کافی مطمئن تھا کہ یہاں بہت خاموشی اور سکون تھا اور اس کا واسطہ بھی یہاں کافی مہذب اور ہائی کلاس کسٹمرز سے پڑ رہا تھا۔ جو کام وہ کر رہا تھا اس سے متعلق وہ کسی مخصوص یا خفیہ ایجنسی سے منسلک نہیں ہوا تھا بلکہ اپنے طور پر اپنی مرضی سے یہ کام کر رہا تھا اس لیے اپنے تحفظ اور حفاظتی اقدامات بھی اسے خود ہی کرنے پڑتے تھے اور اس میں



وہ کامیاب تھا۔

خوب صورت تراش خراش کے ہلکے سنہری بالوں میں انگلیاں پھیرتا وہ ایک بار پھر چونکا تھا۔ اس بار چونکی نظروں سے اس نے دور بچی آبادی کی جھونپڑیوں پر نظر ڈالی تھی اور پھر اپنے دوسری جانب سڑک کے اس پار بوسیدہ عمارتوں کو بغور دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ تب ہی اس کی تیز نگاہ اس ایک عمارت پر رک گئی تھی۔ دھندائی بھی نہ تھی کہ کچھ دکھائی نہ دیتا۔ اس عمارت کے قلیئس کی سب کھڑکیاں بند تھیں سوائے اس ایک کھڑکی کے جہاں اس کی عقیانی نظریں جم گئی تھیں۔ وہ کھڑکی روشن تھی اس کے کھلے پٹ کے درمیان ایک انسان کا سر دکھائی دے رہا تھا مگر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ سر کسی عورت کا ہے یا مرد کا۔ وہ سر سیاہ ہولے کی طرح ہی ساکت نظر آ رہا تھا کچھ دیر تک وہ بھی اس سیاہ ہولے کو دیکھتا رہا مگر پھر بھی ہولا وہاں موجود رہا تھا۔ پول سے دور ہوتا وہ دوبارہ چہل قدمی شروع کر چکا تھا مگر کن انکھیوں سے اس کھڑکی کی جانب بھی وقتاً فوقتاً دیکھتا جا رہا تھا۔ کھڑکی میں ہولا اب بھی ساکت تھا اور وہ اس کی نظروں کی تپش بخوبی محسوس کر رہا تھا۔

پھر بہت زیادہ وقت نہیں گزرا تھا جب سڑک پر ایک چمچائی کار آ کر رک گئی تھی جس کے شیشے بالکل سیاہ تھے۔ کار سے ایک شو فراتر کر اس کی طرف آیا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ کار کے اندر اس کا کوئی پرانا کسٹمر موجود ہے جو ظاہر ہے کہ اس کی شرائط وغیرہ کے بارے میں جانتا ہے۔ شو فر اور اس کے درمیان کچھ جملوں کے تبادلے ہوئے اس کے بعد شو فر نے ایک خاکی رنگ کا بھاری لفافہ اسے دے دیا تھا۔ لفافہ کھول کر اس نے رقم کو دیکھا اور مطمئن ہو کر اسے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا تھا۔ ازلی بے نیازی کے ساتھ وہ شو فر کی تقلید میں کار تک آیا تھا۔ شو فر نے پہلے ہی اس کے لیے بیک سیٹ کا دروازہ کھول دیا تھا۔ کار میں بیٹھنے سے پہلے اس نے ایک آخری نگاہ سامنے اس کھڑکی پر ڈالی تھی جہاں سیاہ ہولا اب تک موجود ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی کار تیزی سے طویل سڑک پر بھاگتی جا رہی تھی۔

جہاں تک اس کی نظریں کار کا تعاقب کر سکتی تھیں وہ اس جانب دیکھتی رہی تھی اور پھر گہری سانس لے کر دوبارہ سامنے اس پول کی جانب دیکھا تھا جہاں اب کوئی نہیں تھا۔ اس کے جانے کے بعد پول کی روشنی بھی پھمکی پھمکی دکھائی دے رہی تھی۔ اس سنسان سڑک کورات گئے تک تکتے رہنا اس کی عادت تھی۔ سڑک سے گزرتی اکا دکا گاڑی کی آواز اسے اپنے زندہ ہونے کا احساس دلا جاتی تھی اس کے بعد پھر وہی موت جیسا ہولناک سناٹا گہرا سکوت اور کسی دوسری گاڑی کا انتظار.....!

تقریباً ایک ہفتہ پہلے وہ اس کی نظروں میں آیا تھا۔ رات بارہ بجے سے ایک بجے کے درمیان وہ جانے کہاں سے اسٹریٹ لائٹ کے نیچے نمودار ہو جاتا تھا۔ اس سے زیادہ اس کی حرکتیں چونکا دینے والی تھیں۔ دو راتیں گزرنے کے بعد ہی اسے مکمل یقین ہو گیا کہ وہ کس مقصد سے وہاں موجود ہوتا ہے اور یہ کہ اسے کس گاڑی کے رکنے کا انتظار ہوتا ہے۔

اس کی اپنی زندگی بہت محدود تھی۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ وہ اپنی ویران قبرستان جیسی زندگی میں سانس لیتے لیتے دنیا سے کٹ کر بالکل الگ تھلگ ہو چکی ہے اور پچھلے ایک ہفتے میں وہ یہ سوچنے پر مجبور تھی کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے اور اس کے ساتھ چلنے والے اشرف المخلوقات کہلائے جانے والے انسان کیسے کیسے راستوں سے گزر جانے کا عزم رکھتے ہیں۔ غلاظتوں سے اٹے پڑے سیاہ راستے..... گھناؤنے راستے..... بوجھل دل کے ساتھ اس نے آہستہ سے کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے تھے۔



فرش پر پچھی سفید چادر پر ہلکی سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ دیوار سے پشت لگائے بیٹھی وہ ان سلوٹوں کو تک رہی تھی۔ کمرے میں پھیلی بلب کی بیمار زرد روشنی میں اور کوئی چیز بھی نہیں دیکھنے کے لیے۔ الگرتی اور یوبان کی دھیمی مہک اب تک فضا میں بسی ہوئی تھی۔ اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے اپنی ڈھٹائی پر حیرت تھی اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ سر سے آخری سانس بھی چھین جانے کے بعد وہ اب تک زندہ کیسے ہے؟ اس کی نظریں کمرے میں رکھے واحد تخت تک گئی تھیں جو خالی تھا۔ اس تخت کو اب خالی ہی رہنا تھا کیونکہ جسے وہ اس تخت پر دیکھتی تھی جو اس کی ڈھارس تھیں وہ اب منوں مٹی تلے ابدی نیند جاسوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں تخت دھندلانے لگا تھا۔ اس کا دل بند ہونے لگا تھا۔ دل سے کراہیں بلند ہو رہی تھیں۔ باپ کے لیے اس نے کسی نہ کسی طرح صبر کر لیا تھا مگر ماں کے لیے اس کی روح تک تڑپ رہی تھی۔ اس کے دل سے ان سب کے لیے بددعا میں نکل رہی تھیں جو اس کی ماں کو اذیت میں دیکھ کر بھی انجان بنے رہے۔ انہیں تو ابھی اپنی بیٹیوں کے گھر آباد کرنا تھے ان کی خوشیاں دیکھنی تھیں مگر..... اپنے ہی دشمن نکلے۔ ننھیال و دھیال دونوں طرف سے سب دامن بچاتے رہے۔ زکوٰۃ خیرات کے قابل بھی نہ سمجھا کہ کم از کم ایک عورت کو بہتر علاج تو میسر آ جاتا۔ گرم سیال اس کے چہرے سے بہتا اس کے گریبان تک آپہنچا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں قبر میں بھی سکون سے نہیں ہوگی۔ اس ظالم دنیا میں اپنی ماں تو ان بیٹیوں کو بے آسرا چھوڑ کر کس طرح نہ ان کی روح تڑپی ہوگی۔ آج تین دن گزر چکے تھے مگر اس کا دل اس وقت بھی ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ اس کی سسکیاں دیواروں سے ٹکرانے لگی تھیں۔

”درج.....“ کمرے میں بھاگی آئی رائمہ کا دل مٹھی میں جکڑا تھا۔ سرعت سے اس نے روتی بلکتی درج کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ ماں کی جدائی کا غم تو آخری سانس تک تازہ رہنا تھا مگر رائمہ کا دل چھوٹی بہن کے لیے پھٹا جا رہا تھا۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں کتنی مشقتیں کتنی اذیتیں اٹھا رہی تھی۔ اس کا بچپن، شوخیاں، شرارتیں سب حالات کی تلخیوں کی نذر ہو گئی تھیں۔ یہ ایک ستم جو ہر اذیت پر بھاری تھا تین دن سے وہ دونوں بہنیں اس کا بوجھ دل پر رکھے کیسے زندہ تھیں یہ ان کا رب ہی جانتا تھا۔ کوئی ان کے آنسو پونچھنے والا نہ تھا۔ کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا نہیں تھا۔ کہنے کو سب رشتے ناتے اس زمین پر تھے مگر کوئی قریب اس ڈر سے نہیں آتا تھا کہ کہیں دنیا دکھاوے کی ہمدردی بھی گلے نہ پڑ جائے۔ ایک تو اپنی جان سے گئی کہیں دو جانوں کا بوجھ ان کے کندھوں پر نہ آ جائے۔

جانے کتنی دیر دونوں بہنوں کی سسکیاں کمرے میں گونجتی رہی تھیں۔ ضبط کا دامن کسی طرح تمام کر رائمہ نے اس کے آنسو بھی صاف کیے تھے اور پھر اس کا سراپنی گود میں رکھ لیا تھا۔

”درج! اب ہم دونوں کو ہی ایک دوسرے کو سہارا دینا ہے ورنہ ہمارے آنسو ہمارے ماں باپ کو سکون نصیب نہیں ہونے دیں گے۔ ہمیں اس سچ کو قبول کرنا ہی ہوگا کہ اللہ کے سوا کوئی ہمارا مددگار نہیں ہے۔ زندہ رہنے کے لیے ہمیں خود کو مضبوط کرنا ہوگا۔“

”تم اکیلی نہیں ہو میں ہوں تمہارا خیال رکھنے کے لیے، تمہاری فکر کرنے کے لیے۔ بڑی بہن ماں کی جگہ ہوتی ہے تمہاری ماں ابھی زندہ ہے۔ ہمت رکھو، ایک دن سب ٹھیک ہو جائے۔“ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی وہ نم لہجے میں اسے سمجھاتی جا رہی تھی۔

”کھانا لے آؤں تمہارے لیے؟“ رائمہ کے سوال پر اس نے بس نفی میں ہر ہلایا تھا۔ ”سو جاؤ کچھ دیر تم تین دن سے ٹھیک طرح سوئی نہیں ہو۔“ رائمہ کے محبت بھرے اصرار پر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ رائمہ نم



آنکھوں سے اس کے بے حد سو جے پوٹوں اور چہرے پر پھیلے درد کے سائے دیکھتی رہی تھی۔ تب ہی باہر سے پکارتی آواز پر رائمہ نے دروازے کی طرف دیکھا تھا۔

”رائمہ باجی! اوپر آجائیں زیرکاش بھائی کا فون آیا ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔“ دہلیز پر رکی اس کی تایا زاد شہزائے اطلاع دی تھی اور وہیں سے واپس چلی گئی تھی جب کہ دراج ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔

”آپ اوپر نہیں جائیں گی۔ نفرت ہے مجھے ان سب کی شکلوں سے، کھا گئے میری ماں کو یہ لوگ.....!“

”دراج! مجھے جانا پڑے گا زیرکاش بھائی اتنی دور بیٹھے ہیں۔ ان کا کیا قصور ہے؟“

”امی کے لیے ہی بات کرنا چاہ رہے ہوں گے۔ نہیں جاؤں گی تو بری بات ہوگی۔“

”آئی ہوں ابھی میں۔“ رائمہ اس کی بات کاٹتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔

”یہ ماں، بیٹے، بیٹیاں سب کے سب شاطر ہیں۔ خدا غارت بھی نہیں کرتا ان لوگوں کو۔“ زہر خند لہجے میں وہ غرائی تھی جب کہ رائمہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد رائمہ کی واپسی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ حزن پھیلا تھا۔ خاموشی سے وہ دراج کے پاس آ بیٹھی تھی۔

”تمہارا پوچھ رہے تھے میں نے بہانہ کر دیا کہ دراج ابھی سوئی ہے۔“

”بہانہ کیوں؟ سچ بتا دیتیں اسے کہ دراج اس سے بات تو کیا اس پر تھوکتا بھی گوارا نہیں کرتی۔“ وہ شدید نفرت سے بولی تھی۔

”امی، ابو اور تایا کو یاد کر کے رو رہے تھے بہت۔“ رائمہ کا لہجہ سوگوار تھا۔

”اس کے گھر والے کم ہیں تا ملک کرنے کے لیے جواب وہ فون پر ڈرامے کر رہا ہے۔ اس سے کہنا تھا میرے ماں باپ کو نہیں اپنے باپ کو روئے بیٹھ کر۔ جن کا آخری دیدار بھی کرنا نصیب نہیں ہوا اس نامراد کو۔ پورپ میں بیٹھ کر عیاشیاں کر رہا ہے۔ گھر والے اس کے نوٹوں پر خوب اچھل رہے ہیں۔ ویسے تو کبھی خبر تک نہیں لیتا جنازے اٹھتے ہیں تو ہمدردی دکھانے کے لیے فون کر لیتا ہے۔“

”کہہ رہے تھے ہفتہ دس دن میں وہ واپس آ رہے ہیں۔“ رائمہ نے بتایا تھا۔

”کیوں.....! اب کس کو کندھا دینے واپس آ رہا ہے؟“

”مت کرو ایسی باتیں۔“ رائمہ نے ہول کر اسے روکا تھا۔

”ہمیں ان سب نے مل کر ڈسما ہے۔ میں جو بولوں کم ہے۔ اس فتنے کے ہی مل بوتے پر اس کے گھر والے اس گھر کو بیچنا چاہتے ہیں۔ ہم دونوں کو در بدر کرنا چاہتے ہیں اور خود جائیں گے بنگلے میں۔ آئینہ دکھا دوں گی ان سب کو پوری دنیا کے سامنے اس گھر کی زمین میرے باپ کی ملکیت ہے ہماری ہے۔ میرا باپ ان لوگوں کو پیر رکھنے کے لیے یہ زمین نہ دیتا تو اوپر والا پورشن کیا یہ لوگ ہوا میں بتاتے؟ ابو کے لیے ڈیڑھ لاکھ علاج کی مد میں اگر ان لوگوں نے خرچ کیا تو صرف اس لیے کہ اس وقت تایا ابو زندہ تھے۔ اب یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ڈیڑھ لاکھ دے کر انہوں نے اس زمین کی قیمت ادا کر دی ہے۔ میری ماں کو بڑھاپا دیکھتے رہے ہیں یہ لوگ۔ اذیت ہم نے اٹھائی، عیش کرتے یہ لوگ ہماری بے بسی کا تماشا دیکھتے رہے ہیں اگر آج ہم قانونی کارروائی کرنے کے قابل ہو جائیں تو اس زمین کی قیمت لاکھوں میں ہے۔ ان لوگوں کے ہاتھوں سے طوطے اڑ جائیں گے۔ پچھلی بار تو مجھے آپ نے روک لیا تھا مگر اب اگر تائی یا شیراز نے گھر کے معاملے کو اٹھایا



تو دن میں ماں، بیٹے کو تارے دکھا دوں گی۔ بہت سن لیے ان کے طعنے بہت دیکھ لیے ان کے رنگ رشتوں کے نام پر سیاہ دھبہ ہیں یہ لوگ بے شرم خود غرض آستین کے سانپ.....!!

”بس کرو مت دل جلاؤ اپنا۔ اچھا ہوا پتا چل گیا کہ زرخاش بھائی آرہے ہیں۔ میں موقع دیکھ کر ان سے تمام معاملات پر بات کروں گی۔ وہ ضرور کوئی حل نکالیں گے وہ ان سب کی طرح نہیں ہیں۔“

”خوش فہمی ہے آپ کی۔ اس کی رگوں میں بھی اپنی ماں اور بھائی جیسا سیاہ خون دوڑ رہا ہے۔ اس کی ماں ہمارے سائے سے بھی بچا کر رکھے گی اسے سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہے زرخاش اپنے گھر والوں کے لیے۔ دولت کے پجاری۔“ اس کے زہر خند لہجے پر رائے سر جھکائے خاموش ہی رہی تھی۔

☆.....☆

رات کی رانی کی مخصوص پراسراری مہک ہوا کے مدھم جھونکوں کے ساتھ ہر سمت پھیلتی جا رہی تھی۔ کیاری میں بے تحاشیہ کھلے نازک سفید پھولوں کے قریب گہری سانس لیتی وہ سر اٹھائے آسمان پر ٹٹماتے لاتعداد ستاروں کو دیکھ رہی تھی۔ پورے چاند کے گرد روشنی کا ایک ہالا سا بنا ہوا تھا۔ اس ہالے کے گرد پہرہ دیتے ستاروں پر اس کے قدم تھے۔ ایک تارے سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے اور پھر چوتھے..... ایک ہی جست میں وہ ایک تارے سے دوسرے تارے پر قدم رکھتی چاند کا طواف کر رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ جھللا رہی تھی۔ چاند کے گرد اس کا دوسرا پھیرا شروع ہو رہا تھا جب ایک آواز اسے زمین پر کھینچ لائی تھی۔ سرعت سے آسمان سے نگاہ ہٹائی وہ پلٹ کر برآمدے کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ ”رجاب! وہاں کیا کر رہی ہو؟ سب کھانے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ ندا واپس اندر جاتی بولی تھیں۔

”آئی ہوں بھابی۔“ آواز لگا کر اس نے دوبارہ آسمان کی جانب دیکھا تھا اور پھر تیز قدموں سے برآمدے کی سمت بڑھ گئی تھی۔

”آج خاص آپ کے لیے آپ کی فیورٹ سبزی بنائی ہے۔“ ندانے مسکراتے ہوئے اطلاع دی تھی۔

”واقعی؟“ راسب نے حیرت سے اسے دیکھا تھا جو جھپنی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔

”کہیں تم نے اپنا ہاتھ تو نہیں جلایا؟ دکھاؤ ذرا مجھے۔“ راسب کی تشویش پر اس نے اپنے ہاتھ ان کو چیک کروائے تھے۔

”فکر مت کریں میں اس کے ساتھ کچن میں تھی۔ اب آپ رجاب کو زیادہ انتظار نہ کروائیں۔ یہ آپ کی تعریف سننے کے لیے بے چین ہے۔“ ندانے کہا تھا۔

”اتنی اچھی خوشبو آرہی ہے، یقیناً یہ سبزی بہت ذائقے دار ہے۔“ ڈش میں سے سبزی پلیٹ میں نکالتے ہوئے راسب نے تعریفی نظروں سے بہن کو دیکھا تھا۔

”زبردست۔“ پہلا لقمہ لیتے ہی وہ بے ساختہ بولے تھے جب کہ رجاب کی کانچ جیسی سبز آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

”ندا! اس نے پہلی ڈش ہی اتنی عمدہ بنائی ہے اس کے ہاتھ میں تم سے زیادہ ذائقہ ہے۔“ وہ ندا سے مخاطب تھے جب کہ رجاب کے لبوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی تھی۔

”شاباش! اب کل تمہاری فیورٹ آکس کریم پکی ہے۔“ اس کا سر تھپتھا کر راسب نے مزید اسے خوش کر دیا تھا۔



”لیکن بیٹا! ابھی اپنی پوری توجہ پڑھائی پر دو۔ تمہیں یاد ہے ناں مجھے اس گھر میں ایک ڈاکٹر چاہیے؟“  
 راسب کے تنبیہی لہجے پر اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تھا۔  
 ”مجھے اس دن کا انتظار ہے جب میرے سامنے تم ڈاکٹر راجاب خان بن کر آؤ گی۔“ راسب نے شفقت  
 بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ ”اور ذرا اپنی پڑھائی کے ساتھ ذرا اس نالائق پر بھی توجہ دو۔ آج بھی اس کا  
 سارا ہوم ورک غلط تھا۔“ راسب نے ناگوار نظروں سے مٹے کودیکھا تھا جو منہ لٹکائے اپنی پلیٹ پر جھکا ہوا تھا۔  
 ”کھانے کے بعد اپنا سارا ہوم ورک دوبارہ کرو، کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔ میں چیک کروں گا۔ سمجھے۔“  
 ان کی ہدایت پر رو میل نے بس خفت زدہ نگاہ ان پر ڈالی تھی۔  
 ”آغا جان! یہ آج بھی اسکول نہیں جا رہا تھا۔ بھائی نے زبردستی اسے تیار کر کے وین میں بٹھایا تھا۔“  
 راجاب کی باپ کو شکایت لگانے پر رو میل نے منہ بگاڑ کر گزبھر کی زبان اسے دکھائی تھی۔  
 ”بریاں۔ کھانا کھاؤ۔“ ندانے اس کے سر پر چپٹ لگائی تھی جب کہ راجاب اسی روکتی کھانے کی طرف  
 متوجہ ہو گئی تھی۔

☆.....☆

12 بج چکے تھے۔ جب اسٹریٹ لائٹ کے حصار میں ایک نیکیسی آ کر رکی تھی۔ سیاہ ہینڈ بیگ پکڑے وہ نیکیسی  
 سے اتر اٹھا اور پھر نیکیسی آگے بڑھ گئی تھی۔ بیگ سے پانی کی بوتل نکال کر اس نے بیگ پول کے قریب ہی رکھ دیا  
 تھا اور پول سے پشت نکا کر بوتل سے پانی کے گھونٹ بھرنا ارد گرد کا جائزہ بھی لیتا رہا تھا۔ بوتل کا کیپ لگا کر وہ  
 اسے بیگ میں رکھنے کے لیے جھکا تھا اور جھکے ہی اس نے کچھ فاصلے پر موجود برگد کے پرانے درخت کی  
 جانب نگاہ ڈالی تھی۔ درخت کی کھنی شاخوں تلے نیم تاریکی کا راج تھا۔ اس کے کانوں نے کوئی دھوکا نہیں کھایا  
 تھا۔ گہری خنک خاموشی میں اسے ایک سے دو بار کسی کے لباس کی سرسراہٹیں سنائی دی تھیں۔ بیگ کی زپ بند  
 کرتے ہوئے اس نے اپنی عقابی نظریں چاروں سمت دوڑائی تھیں اور پھر دبے قدموں اس درخت کی جانب  
 بڑھا تھا۔ احتیاطاً دو چار قدم کے فاصلے پر رک کر اس نے دوسری جانب سے کسی حرکت کا انتظار کیا تھا اور اس  
 سے پہلے کہ وہ تنے تک پہنچتا چادر میں چھپا کوئی دوسری جانب سے نکلتا برق رفتاری سے بھاگا تھا۔ اتنی ہی برق  
 رفتاری سے اس چادر میں چھپے وجود کے پیچھے جاتا وہ عقب سے اس کے بھاگتے پیروں پر ایک زوردار ٹھوک لگا  
 گیا تھا جس کے بعد وہ وجود پری طرح لڑکھڑاتا دھڑام سے زمین پر گر چکا تھا اس کے ساتھ ہی فضا میں ایک  
 تکلیف دہ نسوانی چیخ بلند ہو گئی تھی۔ وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔ ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا جو گرنے کے بعد  
 فوراً ہی سر سے اترتی چادر سنبھالتی سرعت سے اٹھی تھی اور پلٹ کر دیکھے بنا گرتی پڑتی وہاں سے بھاگتی چلی گئی  
 تھی۔ حق دق کھڑا وہ تب تک اسے دیکھتا رہا تھا جب تک وہ سڑک کے دوسری جانب عمارت کے زنگ آلود گیٹ  
 کے اندر غائب نہ ہو گئی۔ چند لمحوں بعد پول کی سمت اٹنے قدموں جاتے ہوئے اس نے اسی عمارت کی اس  
 مخصوص کھڑکی کی جانب دیکھا تھا جو کھلی ہوئی تھی مگر وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ ابھی نظروں سے وہ کبھی زنگ آلود  
 گیٹ کو اور کبھی خالی کھڑکی کو دیکھتا رہا تھا۔ اس وقت تک جب تک کوئی گاڑی اس کے لیے سڑک پر نہ رکی۔

☆.....☆

چند لمحوں تک وہ بڑی سی دیکھی میں ابلتی تھوڑی سی دال کو دیکھتی رہی پھر پانی کا گلاس ہاتھ میں پکڑے کچن  
 سے نکل آئی تھی۔ تھکے تھکے انداز میں وہ باہر ہی تخت کے کنارے بیٹھ گئی تھی۔ کمرے سے مشین کی تیز گھر گھر



اس کے دماغ میں چبھ رہی تھی۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے رائے کو پھر سے مشین سنبھالنی پڑی تھی۔ رائے کا یہی ہنر تو گھر کی دال روٹی چلاتا رہا تھا۔ باپ کی طویل بیماری کے دوران حالات بہت دگرگوں نہیں تھے کیونکہ تایا کا ہاتھ ان کے سر پر تھا مگر دو سال پہلے ان کی وفات نے سچ معنوں میں دنیا کی پہچان کروادی تھی اور پھر ماں کی بیماریوں کی شروعات..... ان کی مہنگی دوائیں..... تائی اور ان کی اولادوں نے ہاتھ جھاڑ دیئے ان ماں بیٹیوں کی طرف سے مکمل غافل ہو گئے۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ تائی نے فرمان جاری کر دیا کہ اس کی ماں اب اپنی بیٹیوں کو لے کر بھائی کے پاس جائے۔ وہ اب ان تینوں پر اپنے بیٹے کی کمائی خرچ نہیں کر سکتی تھیں۔ رائے نے ان کے آگے ہاتھ پھیلا کر چھوڑ دیا، محلے سے سب ہی عورتیں اپنے کپڑے اس سے سلوانے لگی تھیں مگر سلائی سے ملنے والی اجرت ماں کے علاج کے لیے ناکافی تھی۔ دراج نے دو سال پہلے میٹرک پاس کر کے کالج میں ایڈمیشن لیا تو صرف تایا کی وجہ سے مگر ان کا اچانک ہارٹ اٹیک اور وفات، اعلیٰ تعلیم کا خواب ادھورا رہ گیا۔ وہ فرسٹ ایئر کے سپر ز بھی نہ دے سکی۔ گھر کی حالت اور ماں کی بیماری نے اسے ایک گارمنٹس فیکٹری تک پہنچا دیا۔ رائے بہت روٹی مگر کڑے وقت کے طویل سلسلے نے دراج کے دل کو سخت کر دیا تھا۔ اس نے رائے کی ایک نہ سنی۔ رائے اس کی جگہ جاب کرنا چاہتی تھی مگر دراج کو معلوم تھا کہ یہ رائے کے لیے بہت مشکل ہو گا۔ ماں باپ کی خدمت میں رائے ہمیشہ چار دیواری میں ہی رہی تھی۔ وہ میٹرک بھی مکمل نہ کر سکی تھی۔ گھر کے اندر وہ اپنی بہن کو اتنے کڑے حالات کا مقابلہ کرتے دیکھتی رہی تھی کہ اب وہ اسے گھر کے باہر دوسرے دوزخ میں جھلتا برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ رائے اس سے عمر میں سات سال بڑی تھی مگر کسی سات سال کے بچے کی طرح معصوم۔ اس میں اور دراج میں بہت فرق تھا۔ رائے کی نظر میں وہ بہت چھوٹی تھی مگر دراج جانتی تھی کہ اس کا بچپن کہیں بچپن میں ہی دفن ہو گیا تھا۔ وہ رائے سے کئی گنا زیادہ گہری سوچ اور گہری نظر رکھتی تھی۔

پانی کے گھونٹ لیتے ہوئے اس نے چونک کر مین گیٹ کی طرف دیکھا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں شاپراٹھائے شیراز اندر داخل ہوا تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی دراج کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔ شیراز کے تاثرات بھی اس پر نظر پڑتے ہی بگڑ گئے تھے۔ دھڑ دھڑ سیڑھیاں پھلانگتا وہ اوپر چلا گیا تھا جب کہ دراج تو پہلے ہی نفرت سے رخ پھیر چکی تھی۔ زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اس بات کو جب گھر کو فروخت کرنے کے معاملے کو لے کر بات اتنی بڑھی کہ اپنی ماں اور دراج کے درمیان ہونی بحث میں شیراز بھی کود آیا تھا اور اتنا کھل کر سامنے آیا کہ دراج نے بھی سارے لحاظ بالائے طاق رکھ دیئے تھے اپنی ماں بہنوں کی حوصلہ افزائی پر شیراز نے کیا کچھ ان بہنوں کو نہیں کہا تھا۔ الزام دھرتے، طعنہ دیتے، ذلت بھرے جملے داغے ہوئے جب شیراز نے اس کی بیمار ماں اور خاموش کھڑی رائے کے لیے بھی زہرا گلنا شروع کیا تو دراج کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس کے جومنے میں آیا وہ جوابی کارروائی میں بولتی چلی گئی۔ اس سے پہلے کہ بات ہاتھ پائی تک پہنچتی رائے نے کسی طرح کھینچ کھانچ کر زبردستی اسے کمرے میں دھکیلا اور باہر سے لاک کر دیا تھا۔ اس وقت وہ اپنی تائی اور ان کی اولادوں سے زیادہ دراج کے تیوروں پر خوفزدہ تھی اگر وہ اسے کمرے میں بند نہ کرتی تو شیراز اسے مارتا یا پھر وہ شیراز پر ہاتھ اٹھا لیتی اور اس کے بعد رائے کو یقین تھا کہ دونوں صورتوں میں ان ماں بیٹیوں کو ہاتھ پکڑ کر نہیں دھکے دے کر گھر سے بے دخل کر دیا جاتا۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ صبر و تحمل کے ساتھ سر جھکا کر تائی اور ان کی اولادوں کی چیخ پکار اور بھڑاس کو سنتی رہتی۔ ان کے گنوائے جانے والے احسانات پر ان سے ہاتھ جوڑ کر معافی بھی مانگتی اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔



تخت سے اٹھ کر وہ کمرے میں رائے کے پاس آ بیٹھی تھی۔ مشین روک کر رائے نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”آپ نے ٹھیک کہا تھا آگنی ہے سونے کا انڈا دینے والی مرغی۔۔۔۔۔ جب ہی تو وہ آوارہ کسی کام نہ کاج کا، اندر باہر کے چکر لگا رہا ہے بھائی کی سیوا کے لیے۔ آخر بھائی کے ٹکڑوں پر ہی تو پل رہا ہے۔ اتنا تو کرنا ہی پڑے گا۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی تھی۔

وہ فجر کی نماز پڑھ رہی تھی۔ جب باہر شور ہوا تھا۔ شاید اچانک آئے تھے یا پھر تائی کو ان کی آمد سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ آوازوں سے تو کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا۔ ”رائے نے کہا تھا۔“

”فجر میں آئے تھے مگر اب تو دن چڑھ آیا ہے۔ فون پر تو بہت مگر مجھ کے آنسو بہا رہے تھے۔ ملنے نہیں آئے آپ کے زرکاش بھائی؟ یا سب کی سن کر ان کی زبانیں اپنے منہ میں ڈال کر آئیں گے۔ دیسے اگر ہمارے خلاف کان بھرے بھی جا رہے ہیں تو مجھے نہیں لگتا کہ اگلے ایک ہفتے تک بھی وہ سیڑھیاں اتر کر ہم تک آسکیں گے۔“

”خاموش رہو، بہت بڑے ہیں وہ تم سے۔ ان کے سامنے ایسی کوئی بات نہ کرنا کہ وہ ہم سے بدظن ہو جائیں۔“ رائے نے ٹوکا تھا۔

”مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کی ماں بہنیں اور بھائی بخوبی یہ کام کر رہے ہوں گے مگر آپ غور سے سن لیں اگر آپ سیڑھیاں چڑھ کر اس سے ملنے خود گئیں تو میں آپ سے بات نہیں کروں گی اور آپ جانتی ہیں میں جو کہتی ہوں وہ کر لی بھی ہوں۔“ اس کی دھمکی پر رائے خاموش رہی تھی۔

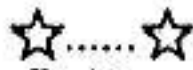
”میں کل سے فیکٹری جا رہی ہوں۔“ اس کی اطلاع پر کپڑے کی تہہ لگاتی رائے چونکی تھی۔

”اب کس کے لیے کام کرنے باہر جاؤ گی؟ نہ ڈاکٹر کی فیس، نہ دواؤں کی اب ضرورت ہے۔“ رائے کا لہجہ نرم تھا۔

”بجلی اور گیس کے آدھے بل جواد پر بیٹھے فرعونوں کو دینے ہیں ہر مہینے۔ کہاں سے آئیں گے اس کے لیے روئے؟“

”فکر مت کرو، اللہ کا شکر ہے سلائی سے اتنے پیسے ہر ماہ بنا جائیں گے۔ دو وقت کی روٹی بھی کسی نہ کسی طرح اس میں پوری ہو رہی ہے اور کیا چاہیے؟“ رائے ٹھنڈی سانس لے کر بولی تھی۔

”مگر میں صرف دو وقت کی روٹی کھانے کے لیے زندہ نہیں ہوں۔ حال تباہ ہو گیا مگر مستقبل کسی قیمت پر تباہ نہیں ہوگا۔ اپنے لیے مجھے سب کچھ چاہیے۔ وہ سب کچھ جو میں حاصل کرنا چاہتی ہوں۔“ اس کے مضبوط لہجے میں جیسے عزم اور چہرے کے تاثرات نے رائے کو سیاکت کر دیا تھا۔ اس وقت دراج اپنی عمر سے کئی سال بڑی نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی اور یہی چمک رائے کو اس سے خوفزدہ کر دیا کرتی تھی۔



چند دنوں کی نزل کو گود میں اٹھائے وہ ندا کے قریب آ بیٹھی تھی۔

”بھابی! یہ اتنی پیاری ہے کہ میرا دل ہی نہیں کرتا اسے گود سے اتارنے کے لیے۔ کالج میں بھی دل نہیں لگتا میرا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کے سارے کام اپنے ہاتھوں سے کروں۔“ بچی کے چہرے کو چومتی وہ بے بسی سے بولی تھی۔

”اب یہ مت کہنا کہ میں تمہارے آغا جان سے سفارش کروں کہ تم کل کالج نہیں جانا چاہتیں۔ بہت غصہ کریں گے وہ پہلے ہی میری وجہ سے تمہاری دو چھٹیاں ہو چکی ہیں۔ تم کالج سے آ کر سارا وقت اسے اپنے ساتھ لگائے رکھو کوئی تمہیں منع نہیں کر رہا۔“ ندا نے نرم لہجے میں اسے سمجھایا تھا۔



”ٹھیک ہے۔“ ناچار دل پر جبر کرتی وہ چونک کر کمرے میں داخل ہوتے راسب کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔  
 ”بس تمہیں یہ ایک کھلونا مل گیا ہے۔ سارا وقت اسی میں لگی رہتی ہو۔ کتابوں کو بھی بھلا دیا ہے۔“ راسب  
 کے ناراض انداز پر وہ چوری بن گئی تھی۔

”حاذق کا فون آیا تھا کل آرہا ہے وہ۔“ کرسی پر براجمان ہوتے وہ ندا سے مخاطب ہوئے تھے۔  
 ”یہ تو اچھی بات ہے۔ پانچ سال بعد وہ یہاں آرہا ہے۔“ ندا بولی نہیں۔  
 ”کل شام کو تاجا جان کی طرف جاؤں گا۔ تم تو جا نہیں سکتیں میں رجا ب کو ساتھ لے جاؤں گا۔“  
 ”آغا جان! آپ چلے جائے گا۔ میں چلی جاؤں گی تو بھابی اکیلی یہاں.....“  
 ”تم سے کسی نے کچھ پوچھا ہے؟“ راسب کے سخت لہجے پر اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔  
 ”یہ بعد میں میرے ساتھ چلی جائے گی۔ وہاں کوئی اس کا ہم عمر نہیں اس لیے جانے سے کتراتا ہے۔“ ندا  
 نے اس کی طرف داری میں کہا تھا۔

”وہاں اس کا کوئی ہم عمر نہیں ہے تو کیا ہوا۔ وہاں سب جان چھڑکتے ہیں اس پر۔ پانچ سال بعد حاذق آرہا  
 ہے۔ اس سے ملنے صرف میں جاؤں۔ یہ اچھا لگے گا؟“ وہ ندا پر برس پڑے تھے۔ جب کہ رجا ب چپکے سے  
 اٹھتی کمرے سے نکل گئی۔ راسب کے غصے سے اس کی جان جاتی تھی۔  
 ”ہزار بار تم سے کہا ہے کہ جتنی بات اس کے سامنے کرنی ہو اتنی ہی کیا کرو۔ ٹھیک ہے کوئی نہ جائے میں تنہا  
 ہی چلا جاؤں گا۔“ ان کا خاندانی جلال بیدار ہو چکا تھا۔ کچھ کہنا اب بے کار تھا سو ندا نہ چاہتے ہوئے بھی  
 خاموش رہی تھیں۔ شوہر کی ایک یہی عادت ان کو کھٹکتی تھی کہ اپنے سامنے وہ کسی کی نہیں سنتے تھے۔

☆.....☆

پول سے پشت ٹکا کر اس نے لائٹر جلایا تھا اور پھر سگریٹ سیگاتے ہوئے رک کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا جو  
 دھیرے دھیرے کچھ رکے رکے قدموں سے اسی جانب آرہی تھی۔ لائٹر جھٹک کر بجھاتا وہ اب بھی اسے ہی دیکھ  
 رہا تھا جو بالکل سامنے آرکی تھی۔ بلا خوف و خطر اس لڑکی کی نظریں اس کی گردن میں سچی زنجیروں سے گزر کر اس  
 کے بازوؤں سے پھسلتیں ہاتھوں میں چمکتی آرائشی چیزوں پر آکر ٹھہر گئی تھیں۔ دوسری جانب وہ بڑے صبر اور  
 خاموشی سے کھڑا بے نیاز بظاہر نظر آرہا تھا۔ لڑکی دور دور سے ہی اس کے گرد ایک چکر کاٹ کر دوبارہ سامنے آرکی  
 تھی اور پھر عجیب نگاہوں سے اس کے شوخ بھڑکتے لباس کا جائزہ لینے لگی تھی اور اسی دوران وہ مکمل یقین کر چکی  
 تھی کہ ارد گرد جو مسکور کن خوشبو پھیلی ہے وہ اسی عجیب مخلوق کے وجود سے پھوٹ رہی ہے۔ دوسری طرف سگریٹ  
 کے گہرے کش لیتا وہ بغور اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرے کے علاوہ سب کچھ گرم چادر میں قید تھا۔  
 ”دور سے نظارے کر کے دل نہیں بھرتا جو دوبارہ یہاں آگئی ہو؟“ ناگوار لہجے میں پہلی بار وہ اس سے  
 مخاطب تھا جو پلکیں جھپکتی اس کے چہرے کو ہی تک رہی تھی۔

”سیدھی طرح نو دو گیارہ ہو جا پیاری۔“ کڑی نظروں سے اسے دیکھتا وہ غرایا تھا۔

”سنو!“ لڑکی بے خوفی سے دو قدم اس کی جانب بڑھی تھی۔ ”کیا تم ”وہ“ ہو؟“

اس کے پر تجسس لہجے سے زیادہ وہ اس کے سوال پر چونکا تھا۔

”وہ کون؟“ اس کے جھڑکنے والے انداز پر جواباً لڑکی کچھ کہتے کہتے رکی تھی۔ شاید زبان سے وضاحت  
 کرنے میں وہ تذبذب کا شکار تھی۔ اس لیے اپنے چادر میں چھپے ہاتھ باہر نکال کر اس نے یک لخت اپنی دونوں



ہتھیلیاں دوبار آپس میں ٹکرائی تھیں۔ دوسری جانب وہ ایک پل کے لیے دنگ ہوا تھا مگر دوسرے ہی پل ایک جھٹکے سے سگریٹ پھینکتے ہوئے وہ جارحانہ انداز میں اس لڑکی کی طرف بڑھتا تھا مگر لڑکی ہوشیار تھی۔ بروقت سر پٹ وہاں سے بھاگتی چلی گئی تھی۔ بمشکل ضبط کے ساتھ اپنی جگہ رکا وہ خونخوار نظروں سے اسے گھور رہا تھا جو زنگ آلود گیٹ کے اندر سے جھانک رہی تھی۔ وہ چاہتا تو با آسانی اسے یہیں قابو کر لیتا مگر اسے ضبط کا مظاہرہ کرنا پڑا تھا کیونکہ وہ لڑکی تو اس کا ایک ہاتھ بھی برداشت کرنے کے قابل دکھائی نہیں دیتی تھی اور پھر وہ اپنے آپ کو بھی کسی مصیبت میں گرفتار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اب بھی گیٹ سے جھانک رہی تھی جب کہ اسے نظر انداز کرتا وہ اس گاڑی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جو قریب آ کر رکی تھی۔

☆.....☆

سلائی مشین ایک طرف کرتی وہ تھکے تھکے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ دراج کے واپس آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ آتے ہی اسے پہلے کھانا چاہیے ہوتا تھا۔ صبح فیکٹری جاتے ہوئے اس نے رائے سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ہرگز زرکاش سے ملنے اور والے پورشن میں نہیں جائے گی۔ دراج بہن کی فطرت جانتی تھی۔ اس لیے صبح جاتے جاتے بھی وعدہ یاد دلاتی گئی تھی۔

زرکاش سے ملنے کے لیے کوئی نہ کوئی آرہا تھا۔ یہ سلسلہ کل شام سے ہی جاری تھا۔ آخر دس سال کے طویل عرصے کے بعد وہ وطن واپس آیا تھا۔ رائے سارا دن کمرے میں سلائی میں مصروف رہی تھی۔ لاشعوری طور پر وہ منتظر ہی رہی تھی کہ اوپر سے اسے کوئی بلانے آجائے یا زرکاش خود ہی تعزیت کے بہانے نیچے آجائے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ رائے کو کسی سے اب اچھائی کی امید نہیں رہی تھی اس لیے زیادہ اس چیز کا اسے دکھ بھی نہیں تھا۔ کل کی دال ایسے ہی رکھی تھی اس میں تھوڑا پانی ڈال کر اس نے ہلکی آنچ پر گرم کرنے کے لیے رکھ دی تھی۔ ابھی وہ آٹا گوندھنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی جب اسے اپنے نام کی پکار سنائی دی تھی۔ ایک پل کو تو اسے اپنی سماعتوں پر شک ہوا تھا مگر جب دوبارہ ناما نوں آواز کے ساتھ ہی اسے کچن سے باہر دیکھنا پڑا تھا۔ فوری طور پر وہ کچن میں کھڑے شخص کو واقعی نہیں پہچان سکی تھی۔

”رائے! کیا پہچانا نہیں مجھے؟“ بھاری گھمبیر لہجے نے رائے کے ہاتھ پیر پھلادے تھے۔ بمشکل چہرے پر مسکراہٹ کھینچ کر لائی وہ اس کی جانب بڑھی تھی۔ رائے کے سلام کا جواب دیتے ہوئے زرکاش نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ رائے کا دل بھرا آیا تھا وہ نظر نہیں اٹھا سکی تھی۔

”کیسی ہو تم اور دراج کہاں ہیں؟“ اس کے سوال پر وہ کچھ بول نہیں سکی تھی۔ سر جھکائے وہ بمشکل اپنے آنسو روکنے کی کوشش میں تھی کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اگر اوپر سے کسی نے زرکاش کے سامنے اسے آنسو بہاتے دیکھ لیا تو سوتا میں سوچی جائیں گی۔ جن میں سے ایک بھی اچھی نہ ہوگی۔

”حوصلہ رکھو، تم اور دراج میری ذمہ داری ہو، میں ہوں یہاں تم دونوں کے ساتھ۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں یہ مت سوچنا کہ تم تنہا ہو۔ چچا، چچی اور ابو کی جدائی کا غم ہم سب کا غم ہے۔ ہم مل کر یہ سارے غم بانٹیں گے۔ یہ میری بد قسمتی ہے کہ میں ان تینوں کا آخری دیدار تک نہ کر سکا شاید میں ہی بہت زیادہ گناہ گار ہوں کہ اپنی اتنی پیاری ہستیوں سے دور رہا۔“ شدید مضطرب اور افسردہ لہجے میں وہ بول رہا تھا۔ رائے کے کان ترس رہے تھے اپنائیت بھرے چند لفظوں کو سننے کے لیے۔ زرکاش نے سر پر ہاتھ رکھا تو دل کو ایک ڈھارس سی ملی تھی۔



”بھائی! آپ بیٹھ جائیے۔“ خود کو سنبھالتے ہوئے رائمہ نے تخت کی جانب اشارہ کیا تھا۔

”میں آپ کے لیے چائے لے آتی ہوں پہلے۔“

”نہیں رائمہ! اپنا ہی گھر ہے بعد میں چائے ہی نہیں کھانا بھی کھاؤں گا۔ تم بیٹھ جاؤ۔“ زرکاش نے اسے بیٹھنے کا اشارہ بھی کیا تھا۔ ایک پل کو وہ کچھ تذبذب کا شکار ہوئی تھی مگر پھر تخت کے دوسرے کنارے پر سنبھل کر بیٹھ گئی تھی۔

”رائمہ! یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب تو نہیں ہے مگر بہت ساری باتیں مجھ تک پہنچی ہیں لیکن میں نے بس ایک طرف کی باتیں سنی ہیں، اس لیے میں صحیح غلط کے بارے میں نہیں جانتا۔“ زرکاش نے چند لمحوں کا توقف کیا تھا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ دراج نے امی اور شیراز سے بدتمیزی کی تھی؟“ زرکاش نے اس کے جھکے سر کو دیکھا تھا۔

”جی ہاں اس نے ایسا کیا تھا جس کے لیے میں نے تائی امی اور شیراز سے معافی مانگی تھی لیکن آپ کو یہ نہیں پتا ہوگا شاید آپ ان وجوہات سے بھی بے خبر ہوں جن کی بنا پر دراج زبان کھولنے پر مجبور ہوئی تھی۔“

”میں تم سے ان وجوہات کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“ زرکاش نے درمیان میں کہا تھا۔

”میں زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ یہ سچ ہے کہ آپ سب کے بہت احسانات ہیں ہم پر، جب تک تایا ابور ہے سب کچھ ٹھیک رہا۔ ان کے بعد سب نے ہی قدم پیچھے ہٹا لیے۔ امی دن بدن بیمار ہوئیں بستر سے جا لگیں۔ ان کے علاوہ معالجے کے لیے مجھے گھر کی ایک ایک چیز فروخت کرنی پڑی تھی۔ آپ خود اندر جا کر چیزیں کن سکتے ہیں۔ یہ تائی امی کا احسان تھا کہ امی کے لیے انہوں نے میرے ہاتھ پر پانچ ہزار روپے رکھے تھے۔ امی دو سال تک بیماری کی حالت میں رہیں۔ پانچ ہزار تو چند دن میں ہی ختم ہو گئے تھے۔ سب کچھ برداشت ہو جاتا ہے مگر اپنوں کی نفرت اور بیزاری نہیں۔ امی کی زندگی میں ہی ہمیں بوجھ قرار دے دیا گیا۔ ہم سے کہہ دیا گیا کہ اس گھر میں اب ہمارا کوئی حصہ نہیں۔ یہ گھر فروخت ہو گیا تو ہمارا ٹھکانا کہاں ہوگا یہ پرواہ کسی کو نہیں۔ دراج سے یہی سب برداشت نہیں ہوا تھا اس گھر میں امی، ابو کی خوشبو ہے۔ یہاں سے ہمیں نکل جانے کا حکم دیا جائے گا تو کیا گزرے گی دل پر یہ محسوس کرنے کا کسی کے پاس وقت نہیں۔“ سر جھکائے وہ لرزتے لہجے میں بولتی چلی گئی تھی۔ دوسری جانب زرکاش بالکل خاموش تھا کیونکہ وہ اپنی ماں کو بہتر جانتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ وہ اپنے دیور کے بیوی بچوں سے شروع سے ہی خار کھاتی ہیں۔

”یہ ٹھیک ہے کہ میرا ارادہ تھا اس جگہ سے نکل کر سب کسی اچھے علاقے میں شفٹ ہو جائیں، مجھے یہاں ایک گھر خریدنا ہی تھا مگر میری نیت یہ بالکل نہیں تھی کہ چچی تم اور دراج کو الگ کر دیا جائے۔ میں تم سب کو اس گھر میں شفٹ کرنا چاہتا تھا جو مجھے خریدنا تھا۔ ہر کوئی یہاں الگ الگ باتیں کر رہا ہے مجھے سمجھ نہیں آتا یہاں حالات اتنے کیوں بگڑ گئے ہیں، مجھے معلوم ہے ان حالات میں میرے گھر والوں کا اہم کردار رہا ہوگا۔ تم شاید یقین نہ کرو مگر چچا کے گزر جانے کے بعد میں نے سب سے ہر بار یہی کہا کہ چچی کا خیال رکھیں۔ مجھے ان کی بیماری کی اطلاع ملی تو میں نے تم سے بھی بات کی تھی۔ امی کو بار بار یہی تاکید کی تھی کہ چچی کے علاج میں کوئی کمی نہ چھوڑیں۔ روپوں کی فکر نہ کریں۔ جس وقت جتنی رقم چاہیے مجھے بتائیں۔“

”بھائی! آپ ان الجھنوں میں خود کو پریشان نہ کریں۔ میری ماں اتنی ہی زندگی لے کر آئی تھیں۔ تائی امی نے جتنا کچھ ہمارے لیے کیا وہ بہت ہے۔ ان کے بس میں جتنا تھا انہوں نے کیا۔“ رائمہ نے مدھم لہجے میں کہا تھا۔



”ہاں وہ تو نظر آرہا ہے۔“ زرکاش کا لہجہ سپاٹ تھا۔ رائنہ چپ رہی تھی۔  
 ”بہر حال اس گھر کو فروخت کرنے کا ارادہ میں پہلے ہی ترک کر چکا تھا۔ تمہارے اور میرے باپ نے مل کر اس گھر کو بنایا تھا۔ ہمارے پاس یہ گھر ان کی نشانی ہے۔“ زرکاش کے قطعی لہجے پر وہ شدید بے یقینی سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”اس گھر پر تمہارا اور دراج کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ باقی سب کا ہے۔“ زرکاش نے مزید کہا تھا۔ ”دراج کہاں ہے؟ کیا وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی؟“

”وہ آپ سے کیوں نہیں ملنا چاہے گی؟“

”اس کے گھر آنے کا وقت ہو چکا ہے بس آتی ہی ہوگی۔“

”کہاں گئی ہے وہ؟“

”وہ جاب کرتی ہے ایک فیکٹری میں۔“

”فیکٹری میں جاب؟“ وہ ششدر رہ گیا تھا۔ ”کب سے جاب کر رہی ہے وہ؟“

”تایا ابو کی وفات کے بعد سے ہی۔“

”مگر اس کی پڑھائی؟“

”وہ زیادہ دن کالج نہیں جاسکی۔ گھر کے حالات ایسے تھے کہ اسے یا مجھے گھر سے باہر نکلنا ہی تھا۔ میری سلائی سے اخراجات پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ امی کی دوائیوں کے لیے زیادہ روپے چاہیے تھے پھر تالی امی نے بھی کہہ دیا تھا کہ مہنگائی بہت ہے۔ بجلی، گیس کے بل کے لیے مجھے دو ہزار روپے ان کو بھی ہر ماہ دینے ہوتے ہیں۔“

رائنہ کے اس انکشاف پر وہ سناٹے میں آ گیا تھا۔ اب اسے سمجھ آ رہا تھا کہ اس کی ماں، بہنیں کیوں کل سے اب تک نیچے آنے سے روکتی رہی تھیں۔ اب وہ اپنی غفلت پر شرمسار بیٹھا تھا۔ دس سال پہلے یہاں سے جاتے ہوئے وہ بہت ذمہ دار نہیں تھا مگر پردیس میں وقت کے ساتھ ساتھ اسے رشتوں کی قدرواہمیت بہت ہو گئی تھی۔ چچا کے بعد باپ کے بھی گزر جانے کے بعد اسے ان کے مقام مل گئے تھے۔ یہ سب اس کی ذمہ داری تھی اور وہ سب کے لیے بہت کچھ اچھا کرنے کے ارادے ساتھ لے کر آیا تھا مگر یہاں سب کچھ ویسا نہیں تھا جیسا اس نے سوچا تھا۔ کچھ بھی کہے بغیر وہ تخت سے اٹھ کر کمرے کی جانب چلا گیا تھا۔ دونوں کمروں کا جائزہ لینے کے بعد اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں۔ کمرے کے باہر کی رائنہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی جو نظر نہیں ملا پارہا تھا۔ اس کے تاثرات بے انتہا سنجیدہ تھے۔

”کیا آپ دوبارہ واپس چلے جائیں گے؟“ رائنہ کے سوال پر زرکاش نے اسے دیکھا تھا۔

”نہیں، ابھی یہاں بہت سے کام کرنے ہیں بہت سی ذمہ داریاں پوری کرنی ہیں۔ مزید غفلت برت کر میں کیا چہرہ دکھاؤں گا روز آخرت اپنے باپ اور چچا کو.....“ بوجھل لہجے میں بولتا وہ رکا تھا اس کی نظروں کے تعاقب میں پلٹ کر رائنہ نے محن میں آئی دراج کو دیکھا تھا۔

”یہ دراج ہے، آپ تو اسے پہچان بھی نہیں پارہے ہوں گے۔“ زرکاش کی حیران نظروں پر رائنہ مسکرائی تھی اور پھر دراج کی طرف بڑھی تھی۔

”بھائی تمہارا پوچھ رہے تھے اور پتا ہے بھائی کہہ رہے ہیں وہ اس گھر کو بالکل فروخت نہیں کریں گے۔“



ہمیں اس گھر سے کوئی بے دخل نہیں کر سکتا۔“ رائمہ کے دے دے لہجے میں خوشی نمایاں تھی۔ اس کی نم آنکھوں سے آنکھوں نے پھر اسے دیکھا تھا جو قریب آ گیا تھا۔

”تم اب فیکٹری نہیں جاؤ گی۔ تمہیں پڑھنا ہے۔“ دراج کے چہرے کی معصومیت اور سنجیدگی نے زرکاش کے دل کو بھنڈا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے باپ اور چچا کے چہرے آ گئے تھے۔

”جو کچھ ہو چکا ہے اور جو غفلت برتی گئی ہے اس کے لیے میں تم دونوں سے معافی مانگتا ہوں۔ میں اب تم دونوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچنے دوں گا۔“ بھینچے لہجے میں زرکاش نے کہا تھا اور خاموشی سے ایک ٹک اپنی جانب دیکھتی دراج کو اس نے سینے سے لگا لیا تھا۔

”جب تک میں زندہ ہوں خود کو یتیم مت سمجھنا، تم دونوں میرا خون ہو۔ شزا اور شذرا سے کسی طور تم دونوں کی اہمیت کم نہیں۔“ بھاری لہجے میں وہ بول رہا تھا مگر دراج کا سارا دھیان اس کے لباس سے پھوٹی مسکور کن قیمت پر فیوم کی مہک پر تھا۔ رخسار کے نیچے دبا اس کے گریبان کے نفیس کپڑے کی قیمت کا اندازہ لگانا اس کے لیے مشکل تھا۔ دھیرے سے پیچھے ہٹتے ہوئے اس کی چمک اٹھنے والی تیز نگاہیں زرکاش کے ہاتھ میں موجود رسٹ وائچ کا برانڈ پہچان گئی تھیں۔ وہ خواب و خیال میں بھی اس برانڈ ڈرسٹ وائچ کو چھونے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ زرکاش، رائمہ سے کیا کہہ رہا تھا اس نے نہیں سنا تھا، سر جھکائے وہ ان دونوں سے دور ہوتی کمرے میں چلی گئی تھی۔

”رواج شاید مجھ سے بھی ناراض ہے۔“ اس کا خاموشی سے چلے جانا زرکاش نے بہت محسوس کیا تھا۔

”ایسا نہیں ہے دراصل وہ پہلی بار آپ سے اس طرح ملی ہے تو بات کرتے ہوئے شرما رہی ہے ورنہ یہ بہت بولتی ہے۔“ رائمہ شرمندہ ہوتی صفائی دینے لگی تھی۔

”تم اسے سمجھا دینا اسے فیکٹری بالکل نہیں جاتا ہے۔“ زرکاش کی تاکید پر اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ ”وہ بہت چھوٹی ہے اس کی عمر پڑھنے کی ہے نوکریاں کرنے کی نہیں۔“ وہ مزید بولا تھا تب ہی سیڑھیوں پر آتی شزا نے زرکاش کو پکارا تھا۔

”بھائی! امی بلا رہی ہیں، ماموں کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ بہن کے ناراض لہجے پر وہ رائمہ سے اجازت لیتا سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا تھا۔

☆.....☆

گیٹ کھولتے ہوئے ندا خوشگوار حیرت سے دوچار ہوئی تھیں۔

”حاذق! تم اتنی اچانک یہاں!.....!“

”بھابی! حاذق نام کی خوشی اچانک ہی آتی ہے اور قسمت والوں کے لیے آتی ہے۔“ شوخی سے بولتے ہوئے اس نے سر جھکایا تھا۔

”جیتے رہو۔“ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتیں ندا کھلکھلائی تھیں۔

”میں نے سوچا خود ہی جا کر آپ سے دعائیں لے لوں اور بھائی جان کو ایک بار پھر ترقی مل جانے پر مبارک باد دے دوں۔“ اس کے شرارتی لہجے پر ندا مزید ہنسی تھیں۔

”وہ ابھی بینک سے نہیں آئے۔ تھوڑا انتظار کر لو اور یہ بتاؤ تم اکیلے آ گئے ہو، ہم تو یہی سمجھے تھے کسی انگریز دلہن کو ساتھ لاؤ گے۔“

”فکر مت کریں، تنہا آیا ہوں مگر تنہا جاؤں گا نہیں۔“ ان کے ہمراہ گھر کے اندر جاتا وہ بولا تھا۔



”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تمہاری شادی ہو جائے گی تو تیا جان اور تائی جان اس آخری ذمہ داری سے فارغ ہو جائیں گے۔ حاذق! تم ذرا جا کر بیٹھو میں بس دو منٹ میں آتی ہوں۔ رو میل مدرسے سے آنے والا ہے اس کے لیے پراٹھا تیار کر رہی تھی۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“

”ہاں ضرور، آپ اپنا کام کر لیں۔ میری فکر نہ کریں۔“ حاذق نے فوراً ہی کہا تھا جب کہ ندا تیز قدموں سے کچن کی طرف چلی گئی تھیں۔

وہ ٹہلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا جہاں ملگجاندھیرا پھیلا تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی سوئچ بورڈ پر ہاتھ بڑھا کر اس نے لائٹس آن کر دی تھیں۔ بے خیالی میں صوفوں کی جانب بڑھتا وہ ٹھٹھک کر رہ گیا تھا۔ آنکھیں چندھیا سی گئی تھیں۔ آف وہائٹ لبادے میں نمایاں ہوتا اس کا دودھیا وجود سرخ کارپٹ پر بے سدھ نظر آ رہا تھا۔ سرخ رنگ کے فلورکشن پر اس کے ریشمی جھمکتے بال بکھرے ہوئے کچھ شریر لٹیں اس کی گردن سے لپٹی تھیں اور کچھ شانے پر اور اس کا خوابیدہ چہرہ..... حاذق پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔ دل کی دنیا درہم برہم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ لابی گھنی پلکوں پر اس کا دل ٹھہر گیا تھا۔ گلابی چہرے کی شفاف جلد پر اس خواب کا سحر چمک رہا تھا جو گھنی پلکوں کے گزر رہا تھا۔ نازک سی کھڑی ناک کے نیچے ترشے لب گلاب کی نازک پنکھڑیوں جیسے گھٹی تھے، گہری سانسوں کے زیر و بم حاذق کی سانسوں کو روک گئے تھے۔ وہ اس حسین ساحرہ کے سحر میں قید ہوتا جا رہا تھا جو اپنے آپ سے بھی غافل تھی۔ قدم قدم پر اس نے حسین چہرے دیکھے تھے مگر یہ چہرہ اس کے جسم و جان کو اپنے طلسم میں جکڑ گیا تھا۔ اس کے نازک وجود میں پورے چاند کی چاندنی گھٹی ہوئی تھی۔ سنگ مرمر جیسے حسین تراشے وجود کے بیچ و خم دنیا سے غافل کر رہے تھے۔ اسے چھونے کی محسوس کرنے کی خواہش شدت سے دل میں جاگی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ رہے ہے حواس بھی کھو بیٹھتا ندا کی تیز آواز نے اس پر طاری سحر کو توڑ دیا تھا۔

”رجاب! اٹھو یہاں سے، جہاں دل چاہتا ہے پڑ کر سو جاتی ہو۔ اٹھو فوراً.....!“ غصے کو بمشکل روکنے کے باوجود انہوں نے انتہائی سخت لہجے میں رجا کو شانوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ عجلت میں انہوں نے رجا کو نیند سے ٹھیک طرح بیدار ہونے کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ وہ نیند میں ڈول رہی تھی۔ جب ندانے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا تھا۔ حاذق کی آنکھیں اس پر ساکت تھیں۔ جس کی نیم واسنر آنکھیں بس ایک لمحے کے لیے حاذق کی جانب اٹھی تھیں۔ سوئی سوئی آنکھوں کے گلابی ڈورے حاذق کا دل سینے سے کھینچ لے گئے تھے۔ وہ ٹھیک طرح اس کے سحر سے آزاد بھی نہیں ہو پایا تھا باوجود اس کے کہ ندا اسے ڈرائنگ روم سے لے جا چکی تھیں۔ وہ اپنے حواسوں میں ہوتا تو یقیناً سمجھ جاتا کہ ندا اسے رجا کے پاس یوں کھڑا دیکھ کر شدید ناگواری میں مبتلا ہوئی ہیں۔

”معاف کرنا حاذق! مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ بے وقوف لڑکی اپنے کمرے سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آگئی ہے ورنہ میں پہلے ہی اسے جگا دیتی۔“ کچھ دیر بعد ڈرائنگ روم میں آتیں ندانے نہ چاہتے ہوئے بھی معذرت کی تھی مگر حاذق نے جیسے سنا ہی نہ تھا۔

”بھالی! یہ رجا پانچ سال میں اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ میں بالکل بھی اسے پہچان نہیں سکا۔“ حاذق کو اپنی ہی آواز اجنبی لگی تھی۔

”لڑکیوں کا پتا ہی کہاں چلتا ہے۔ اچانک ہی قد نکال لیتی ہیں۔“ زبردستی مسکراہٹ چہرے پر لا کر ندا ٹالنے والے انداز میں بولی تھیں اور پھر فوراً ہی باتوں کا رخ بدل دیا تھا۔ کچھ دیر بعد راسب بھی آگئے تھے۔ ان سے باتیں کرتا وہ بالکل غائب دماغ تھا۔ آنکھیں بس دوبارہ اسے سامنے دیکھنے کی منتظر تھیں۔ شدت سے وہ



پھر اس کے دیدار کلمہ نظر تھا۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ جب اس کے بے چین دل کی خواہش پوری ہوئی۔ ڈرائنگ روم میں وہ بھٹکتی ہوئی داخل ہوئی تھی۔ شرمیلی سی مسکان لبوں پر سجائے اس نے حاذق کو سلام کیا تھا اور ندا کے پہلو میں جا چھپی تھی۔ حاذق کے تو دل پر ایک بار پھر قیامت گزر گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے اس کے توبہ شکن جلوے کو اس کم کر گئے تھے مگر اب..... ملنے آسمانی رنگ کے لباس میں سر پر سلیقے سے دوپٹہ جمائے جھکی نظروں سے سامنے آئی وہ جنت کی حور لگ رہی تھی۔ اس کی آواز سماعتوں میں رس کھول گئی تھی۔ حاذق کے لیے بہت مشکل تھا اس کے چہرے سے نظر ہٹانا یا اس سے لائق رہنا، اس کی جھجک اور حیا کو محسوس کرنے کے باوجود وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا سورا سب اور ندا سے باتوں کے دوران وہ اسے بھی مخاطب کرتا رہا تھا۔ اس کی اسٹڈیز کے حوالے سے چھوٹے چھوٹے سوال، جس کے جواب وہ بہت مختصر اور جھینپے انداز میں دیتی اس کی کیفیات اور جذبات سے قطعی انجان اور بے نیاز تھی۔

☆.....☆

آج رات بھی سردی کڑا کے کی تھی مگر پتا نہیں وہ کس مٹی سے بنا تھا، سرد ہواؤں سے بے نیاز معمول کی طرح پول سے پشت لگائے اطمینان سے کھڑا تھا۔

سگریٹ کا آخری کش لے کر بجا سگریٹ کانکڑا پھینکتے ہوئے اس کی نظر سڑک کی طرف اٹھی تھی اور اگلے ہی پل ناگواری سے اس کی ابرو تن گئی تھیں۔ دوسری جانب کچھ فاصلے پر رکتی لڑکی احتیاطاً اس کے تیوروں کا اندازہ لگاتی رہی تھی اور پھر ہاتھ میں موجود ایک تہہ گرم چادر اس کی جانب بڑھا دی تھی۔

”یہ چادر لے لو، بہت سردی ہو رہی ہے۔“ لڑکی کے نرم لہجے نے اسے ایک پل کے لیے حیران کیا تھا۔

”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اگلے ہی پل وہ اکھڑے انداز میں بولا تھا۔

”کیوں؟ کیا تم انسان نہیں ہو؟“

”نہیں۔“ وہ اتنا ہی بولا تھا۔

”مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔“ لڑکی بے اختیار بول گئی تھی۔

”تم یہاں سے جاتی ہو یا نہیں؟“ وہ بگڑے تیوروں سے بولا تھا۔ لڑکی چند لمحوں تک خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

”وہ کون لوگ ہوتے ہیں جو گاڑی میں آتے ہیں؟ تم ان کے ساتھ روز کہاں جاتے ہو؟“

”جہنم میں جاتا ہوں۔ تم ہوتی کون ہو مجھ سے یہ پوچھنے والی؟“ وہ غرایا تھا۔

”کوئی نہیں۔“ اس کے لباس کا دلچسپی سے جائزہ لیتی وہ سرسری لہجے میں بولی تھی۔

دوسری جانب وہ کچھ کہتے کہتے رک کر سڑک کی جانب متوجہ ہوا تھا جہاں سے ایک مریل شخص اسی جانب چلا آ رہا تھا۔

”آگیا میرا خون چوسنے۔“ لڑکی کے زہریلے لہجے پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا تھا مگر لڑکی اس شخص کو ہی گھور رہی تھی جس نے جھٹٹے والے انداز میں لڑکی کا ہاتھ پکڑا تھا۔

”چھوڑ مجھے۔“ لڑکی چینی تھی۔

”گھر چل.....“ مے نکال کر دے مجھے کہاں چھپا کر رکھے ہیں۔“ سرخ آنکھوں والا مریل شخص اسے ساتھ کھینچ لے جانا چاہتا تھا مگر لڑکی ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا چکی تھی۔



”نہیں ہے میرے پاس پیسے، کتنی دولت تو نے کما کر میرے ہاتھ پر رکھی ہے جسے چھپا کر رکھوں گی؟“

”جھوٹ بولتی ہے..... عیار.....!“ دھاڑتے ہوئے اس شخص نے لڑکی کو ایک تھپڑ بھی رسید کیا تھا۔

”میں عیار ہوں اور تو کون ہے؟ پہلے یہ تو معلوم کر، مرد ہے تو جا کر سڑکیں کھود، محنت مزدوری کر اور اگر مرد نہیں ہے تو ناچ کر، تالیاں پیٹ کر روپے کما۔“ لڑکی حلق کے بل چیختی تھی جس پر مریل شخص شدید اشتعال میں آ گیا تھا۔ مغالطات بکتے ہوئے اس نے لڑکی پر تھپڑوں اور لاتوں کی بارش کر دی تھی۔ دوسری طرف وہ جو پول سے ٹپک لگائے کھڑا تھا، بڑے اطمینان اور دلچسپی سے یہ مناظر دیکھتا نئی سگریٹ سلگا چکا تھا۔

مریل شخص اگر تا بڑ توڑ تھپڑوں اور ٹھوکروں کی برسات کر رہا تھا تو لڑکی بھی مزاحمت کی پوری کوشش میں تھی مگر دوسری بار جب وہ زمین پر گری تو دوبارہ قدموں پر اٹھنے کا اسے موقع نہیں ملا تھا۔

”تو صرف یہی زبان سمجھتی ہے۔ دیکھتا ہوں کیسے مجھے روپے نہیں دے گی۔ چل ابھی میرے ساتھ۔“

مریل سے شخص کا سارا دم خم اس کی آواز میں ہی تھا سو دھاڑتے ہوئے وہ اس لڑکی کو گھسیٹ لے جانے کی کوشش میں تھا۔

”تو کون سی شرافت کی زبان سمجھتا ہے۔ مجھے بھی تیری اسی ماں نے جنم دیا ہے جسے صدے دے دے کر تو نے کسی قابل نہیں چھوڑا اور اب میں بھگت رہی ہوں تجھے۔ تو مر کیوں نہیں جاتا۔“ لڑکی چلاتے ہوئے دوبارہ اس شخص کو بھڑکا گئی تھی۔ وہ بل پڑا تھا لڑکی پر۔ اس بار لڑکی نے اپنے بچاؤ کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ بس کراہتے ہوئے لاتیں، ٹھوکریں، سکے برداشت کرتی رہی تھی، کچھ دیر بعد ہی وہ مرنجان مرنج شخص تھک کر رکا اور بری طرح ہانپنے لگا تھا مگر سرخ ابلی آ نکھوں سے اسے گھور رہا تھا جو چہرہ ہاتھوں میں چھپائے زمین پر گٹھڑی بنی پڑی تھی۔

”میں پیسے لے کر جاؤں گا۔ چل میرے ساتھ۔“ وہ شخص پھولی سانسوں کے درمیان چیخا تھا۔ ”تو ایسے نہیں مانے گی۔“ لڑکی کی ڈھٹائی پر اس نے تلملا کر پیر سے چل نکالی تھی۔

”چھوڑ دے اسے۔“ مداخلت کرتی اس آواز پر اس شخص نے رک کر پول کی طرف دیکھا تھا۔ ”یہ مر گئی تو سیدھا جیل جائے گا، وہاں اتنی آسانی سے نشے کی پڑیا نہیں ملنے والی۔ دو دن میں ہی ایڑیاں رگڑتا مر جائے گا۔“ اس تماشے سے وہ اکتا چکا تھا شاید اس لیے مداخلت کرتا اس شخص کو مشورہ دے دیا تھا۔

”تو کون ہے؟ کیا آشنا ہے اس کا؟“ وہ شخص بھڑک کر اس کی طرف بڑھا تھا۔

”میں کیا کہوں، سامنے پڑی ہے خود ہی پوچھ لے اس سے۔“ بے نیازی سے بولتا وہ لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تھا اور اگلے ہی بل سرعت سے اپنی جگہ سے ہٹا تھا اور بروقت ہٹا تھا کہ لڑکی کا پھینکا گیا پتھر زوردار طریقے سے پول سے ٹکرایا تھا۔ وہ بری طرح دنگ رہ گیا تھا جبکہ لڑکی خونخوار نظروں سے اسے دیکھتی دوسرا پتھر اٹھا رہی تھی۔

”اے رک.....“ بلند آواز میں وہ اسے روک گیا تھا۔ ”یہ پتھر اپنے اس نشے کو مار مجھے اگر مارا تو ہاتھ توڑ دوں گا۔ واپس وہیں رکھ پتھر.....!“ اس کی کرخت انداز پر لڑکی پتھر ایک طرف ڈالتی مریل نشے کو گھورنے لگی تھی۔

”آخری بار کہہ رہا ہوں اب روپے میرے حوالے کر دے ورنہ یہیں گڑھا کھود کر دفن کر دوں گا تجھے۔“

مریل آدمی کو پھر دور ہاٹھا تھا۔ جواباً وہ کچھ بھی بولے بغیر گھٹنوں میں چہرہ چھپا گئی تھی۔

”ڈرامہ کرتی ہے میرے سامنے۔“

(جاری ہے)



آسیہ مظہر چوہدری

مکمل ناول

# جس کا عشق

عورت کیا ہے؟ یہ سوال بہت مرتبہ پوچھا جاتا ہے اور دھڑلے سے اس سوال کا جواب دیا جاتا ہے کہ عورت وفا کی صورت ہے، پیار و محبت کی گندھی مٹی ہے، صبر کی دیوی ہے۔ مگر جب یہ پوچھا جائے کہ معاشرے میں





عورت کا کہنا مقام ہے تو ہر طرف سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں اور بس سوال پوچھنے والے کی طرف نظر نہ دیکھا جاتا ہے جیسے اس نے بہت عجیب و غریب نہ سمجھ میں آنے والا سوال پوچھ لیا ہو۔ یعنی اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ سوال پوچھنے والے کو لوگ پاگل سودائی سمجھتے ہیں۔ ہونہر عورت کا مقام یہ کیسا سوال ہے اور دوسری بات کیا مرد عورت سے ایک جیسا انصاف کر پاتے ہیں؟ کیا بیوی کو ماں، بہن، بیٹی جیسا انصاف مل پاتا ہے۔ اس سوال کا جواب بس ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک بہت بڑے ویران صحرا میں ایک سوئی گر کر کہیں گم ہو جائے اور اس کے ملنے کا پتہ کیا نام و نشان تک نہ رہے۔ عورت آج بھی مقام کی تلاش میں ہے انصاف کی تلاش میں ہے کہ شاید مل جائے۔

☆.....☆.....☆

”مے آئی کم ان سر؟“ اس نے ہلکے سے دروازہ کھول کر اندر آنے کی اجازت مانگی تھی۔  
 ”یس کم ان“۔ وہ ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی اس شاندار شخصیت کے مقابل کھڑی ہو گئی۔ اب کے شاندار شخصیت





نے اس کی جانب مسکرا کر دیکھا۔

”جی مس رطابہ! فرمائیں کیسے آنا ہوا؟“ اس شاندار شخصیت کے حامل شخص نے جواباً پوچھا تھا۔ وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔

”سر! فرقان انڈسٹری کی فائل مکمل ہو چکی ہے، آپ دیکھ لیں تاکہ پھر ان کو بھجوائی جاسکے۔“ اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ یہی اعتماد تو اس کا خاصا تھا۔

”ہوں... ٹھیک ہے میں کر لوں گا۔“ شاندار شخصیت نے مصروف سے انداز میں کہا تھا۔

”ٹھیک ہے سر!“ اس نے فائل اس کی جانب بڑھائی جسے اس نے مسکرا کر تھام لیا تھا۔

”اور کچھ؟“ وہ دوبارہ مسکرایا۔

”نہیں سر!“ کہہ کر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ شاندار شخصیت پھر کسی کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے یکدم پیچھے مڑ کر دیکھا، ایسا کرتے ہوئے اس کی خوبصورت آنکھوں میں بلا کی وحشت اور سفاکی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ آفس سے آئی ہی تھی کہ آگے اس کی روم میٹ عیشاء نے اس کو آنے والے فون کے بارے میں بتایا تھا۔

”کیا کہہ رہی تھیں اماں؟“ اس نے ہینڈ بیگ بیڈ پر پھینکا اور واش روم میں گھس گئی تھی۔

”یہی کہ رطابہ آئے تو اسے کہنا فون کر لے۔“ وہ فریش ہو کر باہر نکلی تو عیشاء نے بتایا۔

”اچھا کر لوں گی۔“ وہ بولی۔

”اب جلدی سے آؤ، پیزا برف ہو جائے گا۔“ عیشاء نے مائیکرو سے پزا نکال کر ٹرے میں سجایا اور بوتل

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

”آج پھر فاسٹ فوڈ۔“ رطابہ نے پیزا دیکھ کر منہ چڑھایا تھا۔ عیشاء نے جواباً اسے غصے سے دیکھا۔

”ہاں یہاں نوکروں کی فوج ہے ناں جو گھر کے کھانے پکانے میں ہمہ وقت تیار رہتی ہے، کھانا ہے تو کھاؤ

ورنہ کسی دیسی ہوٹل میں چلی جاؤ۔“ یہ کہہ کر عیشاء نے بے فکری سے پیزا کا پہلا پیس اٹھایا اور کھانے لگی جبکہ

رطابہ نے بھی برے برے منہ بناتے یہی کام سرانجام دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”السلام علیکم اماں! کیسی ہیں آپ؟“ فون کی دوسری جانب اماں تھیں۔

”وعلیکم السلام! ٹھیک ہوں میں نے پہلے فون کیا تھا تو تمہاری کوئی دوست کہہ رہی تھی کہ آفس گئی ہے۔“

اماں نے اسے پچھلے فون کی بابت آگاہ کیا تھا۔

”جی عیشاء نے بتایا تھا۔“ وہ بولی۔

”رطابہ! تم واپس آ جاؤ، چھوڑ دو وہ سب میں بھلا چکی ہوں تم بھی بھلا دو، آ جاؤ رطابہ۔“ اماں نے بے بسی سے کہا۔

”اماں! اس بات کے علاوہ کوئی اور بات کریں۔“ اس نے بات کو ٹالا۔

”رطابہ! تم کیوں نہیں سمجھتی۔“ اماں نے اسے قائل کرنے کی ایک مرتبہ پھر کوشش کی تھی۔

”میں نہیں سمجھوں گی، میری اتنے برس کی محنت پر پانی پھر جائے، قطعاً نہیں، میں اس شخص کو برباد کر دوں



گی۔ اس کے ارادے جان کر اماں کا دل کمزور پتے کی طرح لرز اٹھا تھا۔

”میں نے معاف کر دیا، تم بھی معاف کر دو۔“

”میں ہرگز معاف نہیں کروں گی، آئندہ آپ اس حوالے سے کوئی بات مت کیجئے گا۔“ اس کا ارادہ اٹل

تھا، اماں جان چکی تھیں۔ انہوں نے لرزاتے ہاتھوں سے فون کاٹ دیا تھا۔

”اماں! میں اس شخص کو کہیں کا نہیں چھوڑوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس کا خوبصورت چہرہ کونکے کی طرح

سیاہ اور ہیبت ناک ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

پورے گاؤں میں یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی کہ دتا کمہار کی بیٹی کا رشتہ رحیم چوہدری نے اپنے مٹے کے لئے مانگا ہے، دتا کمہار کے لئے تو یہ بڑی خوش نصیبی والی بات تھی کہ بیٹھے بٹھائے اس کی بیٹی کی قسمت کھل گئی تھی۔ وہ ذات کا کمہار اور بیٹی کا رشتہ چوہدریوں میں، بڑی بات تھی۔ مہر تو یہ سب جان کر ساکت بیٹھی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی اس رشتے کا مقصد کو اور رحیم چوہدری کو۔ ہوا دراصل یوں تھا کہ مہر واپنی چند سہیلیوں کے ساتھ کنویں پر پانی بھرنے گئی تھی اور وہاں آفاق چوہدری اپنے چند غنڈوں کے ساتھ آدھمکا تھا اور اس کی سہیلیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگا تھا۔ مہر کی سہیلیاں تو ڈر کے مارے خاموش ہو گئی تھیں لیکن مہر نے خوب شور مچایا تھا۔ شور مچانے پر آفاق اور اس کے غنڈے فوراً فوج چکر ہو گئے تھے لیکن جاتے جاتے آفاق چوہدری اسے دھمکا گیا تھا کہ وہ اسے کہیں کا نہیں چھوڑے گا اور اس کا عملی ثبوت وہ رشتے کی صورت میں دے چکا تھا۔ مہر تو آنے والے حالات کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں اس کے ساتھ کیا ہونا تھا۔ آفاق چوہدری کے عزائم خطرناک ہی لگ رہے تھے۔ یہ سوچیں اسے لرز اڑتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”جی سر! اوکے میں آتی ہوں۔“ وہ اپنے کیبن میں بیٹھی کسی فائل پر کام کر رہی تھی جب شاندار شخصیت کے حامل شخص نے اسے اپنے آفس آنے کو کہا تھا۔ اپنا کام نمٹا کر اگلے دو منٹ میں وہ آفس میں موجود تھی۔ ”آئیے مس رطابہ، بیٹھے۔“ شاندار شخصیت نے سامنے لگی کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

”جی سر! کوئی کام تھا۔“ اس نے بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

”صرف کام نہیں، بہت ضروری کام مس رطابہ۔“ وہ زیر لب مسکرایا تھا۔

”جی سر کہئے۔“ وہ ہمتن گوش ہوئی۔

”مس رطابہ! میں نے آپ کو اپنے آفس میں صرف آپ کی تعلیمی قابلیت کی بنا پر نہیں رکھا بلکہ آپ کا

اعتماد، محنت، لگن ان سب چیزوں نے مجھے inspire کیا ہے اور یہی چیزیں کسی کاروبار کو چلانے میں اہم ہوتی ہیں۔“ وہ جویا بولا تھا۔

”جی سر! میں سمجھتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”اور آج میں نے آپ کو اسی سلسلے میں بلایا ہے۔“ ”کیا مطلب سر میں سمجھی نہیں۔“ وہ گویا ہوئی۔

”ہماری کمپنی کو ایک بہت بڑا Project ملا ہے اور میں چاہتا ہوں اسے آپ ہینڈل کریں۔“ شاندار

شخصیت نے جس کام کے لئے اسے بلایا تھا اس کی بابت آگاہ کیا تھا۔



”پرسر میں کیسے...؟“ وہ ہڑبڑا کر بولی تھی۔

”دیکھئے مس رطابہ! ایک بہت بڑا پروجیکٹ ہے اگر اسے ہماری کمپنی نے کرایا تو شہرت کی بلندیوں پر اور اگر ناکام رہے تو ایک دم Letdown ہو جائیں گے کیونکہ میں اس پروجیکٹ میں اپنا سارا سرمایہ لگا چکا ہوں۔ اب کے اس نے پوری بات تفصیلاً بیان کی تھی۔

”سر! یہ تو بہت بڑی ذمہ داری آپ مجھے سونپ رہے ہیں۔“

”ہاں مجھے پتہ ہے۔“ وہ دلکشی سے مسکرایا تھا۔

”ٹھیک ہے سر! میں پوری کوشش کروں گی۔“ وہ بھی جواباً پر اسرار سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے بولی تھی۔

☆.....☆.....☆

مہر نہ کچھ کہہ سکتی تھی نہ کر سکتی تھی۔ وہ پوری طرح آفاق چوہدری کے شکنجے میں جکڑ چکی تھی۔ اس لئے بس فقط خاموشی اختیار کر لی تھی، گہری جامد خاموشی۔ بس اسے اتنا بتایا گیا تھا کہ اس دن اس کی شادی ہے وہ تیار رہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے باپ اور چوہدری رحیم کے مابین کیا معاہدے ہوئے تھے۔ اس کے باپ نے کتنے پیسے اس کے عوض لئے تھے۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ بس اسے صرف اتنا پتہ تھا کہ اسے آگ کے دریا میں اتارا جا رہا ہے اور چوہدری رحیم اور اس کا باپ اسے اتارنے میں پیش پیش ہیں۔

☆.....☆.....☆

شام کا وقت تھا۔ آفس کا اسٹاف آہستہ آہستہ گھر کی جانب رواں دواں تھا کیونکہ ورکنگ آورز کلوز ہو چکے تھے اس لئے لوگ اپنے اپنے کام نمٹا کر تقریباً آفس سے نکل ہی چکے تھے لیکن وہ ابھی تک اپنے کیمین میں موجود تھی، گارڈ نے ایک دو دفعہ اس کے کیمین میں جھانکا لیکن اسے کام میں مصروف دیکھ کر واپس چلٹ گیا تھا کیونکہ رطابہ جاتی تو آفس بند ہوتا اس لئے گارڈ ناچاہتے ہوئے بھی انتظار کرنے پر مجبور تھا اور وہ کیمین میں کیوں موجود تھی اس کا راز بھی جلد کھل گیا تھا۔

”ہیلو جی مسٹر رضا! کیسے ہیں آپ؟“ فون کی پہلی گھنٹی پر ہی اس نے فون اٹھالیا تھا جیسے وہ اسی کام کے لئے محو انتظار تھی۔

”میں ٹھیک ہوں مس رطابہ! سوری کسی کام میں بڑی تھا اس لئے تھوڑا لیٹ ہو گیا۔“ اس کا اشارہ فون کی جانب تھا۔

”Its ok مسٹر رضا! کوئی بات نہیں۔“ وہ دھیمے سے مسکرائی تھی۔

”مس رطابہ! یہ کام کافی رسکی ہے سوچ لیں۔“ مسٹر رضا اصل بات کی جانب پلٹا تھا۔ وہ یہ سن کر ہنسی تھی۔

”مسٹر رضا! رسکی کام کا اپنا ہی مزہ ہے۔“ اس کا لہجہ لا پرواہی لئے ہوئے تھا۔

”پرسر رطابہ...“ مسٹر رضا جواباً بولا تھا۔

”مسٹر رضا! سوچ لیں پورا پورا Profit ملے گا اور وہ شیرز بھی گھانٹے کا سودا تو نہیں ہے۔“ اس نے ترپ کا پہلا پتا پھینکا تھا۔

”وہ تو ہے پرسر رطابہ! آپ ایسا کیوں چاہتی ہیں؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔

”مسٹر رضا! آپ آم کھائیں، پیڑ مت لگیں، کچھ باتیں سیکرٹ میں رہتی ہیں۔“ وہ بولی تھی۔ پھر چند ضروری باتوں کے بعد فون ڈسکنیکٹ ہو گیا تھا۔



وہ آفس سے نکل آئی تھی۔ گارڈ نے اس کے جانے پر فوراً آفس بند کیا تھا کیونکہ اسے بھی گھر جانے کی جلدی تھی۔

☆.....☆.....☆

”اری او مہرو، فی مہرؤ“۔ ابا نے گھر میں داخل ہوتے ہی اسے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ وہ آوازیں سن کر باہر نکل آئی تھی۔

”جی ابا!“ وہ مودب سی بولی۔

”یہ دیکھ، چوہدری صاحب نے چیزیں بھجوائی ہیں تیرے لئے“۔ ابا نے بڑا سا شاپر اسے دکھایا جس میں ضرورت کی تمام چیزیں تھیں لیکن اس کا اشتیاق مدہم تھا۔ اس نے بے دلی سے شاپر تھام لیا۔

”ارے سچ سے پکڑناں، قیمتی چیزیں ہیں کہیں ٹوٹ نہ جائیں“۔ ابا نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا تھا۔

”ابا! انسانوں سے قیمتی کوئی شے نہیں جب ان کی کوئی اوقات نہیں تو پھر ان بے جان چیزوں کی کیا اوقات، انسانوں کے دل ٹوٹ جاتے ہیں پھر اگر یہ ٹوٹ جائیں گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا“۔ یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔ اگر رک جاتی تو آنسو اپنی بے وقعتی پر چیخ و پکار کرتے۔ ابا نے آنکھیں گھما کر اسے دیکھا تھا جیسے اس کی ذہنی حالت کو مشکوک سمجھ رہے ہوں۔

”جھلی نہ ہو تو“۔ دتا کہہ مارنے بڑے بڑے ہنگے انداز سے قہقہہ لگایا تھا۔

اس نے کمرے میں آتے ہی شاپر زور سے چار پائی پر پھینکا۔ رنگ برنگی چیزیں شاپر سے نکل کر بڑی دور دور تک پھیلی تھیں اور آنسو ہاں آنسو بھی بڑی دور تک پھیلے تھے۔

☆.....☆.....☆

وہ آج معمول سے پہلے ہی آفس آگئی تھی، آفس نو بجے کھلتا تھا اس لئے ابھی کافی ٹائم تھا، آفس میں اکاؤنٹ کا ہی اسٹاف موجود تھا کیونکہ کچھ لوگوں کی کام کے حساب سے صبح کی ڈیوٹی تھی اس لئے وہ سب صبح ہی آ جاتے تھے۔ وہ بنا ادھر ادھر دیکھے سیدھی اپنے کیبن کی جانب بڑھ گئی تھی۔ اسے آج دواہم کام نمٹانے تھے جس کے لئے اس کی کوششیں شروع ہو چکی تھیں۔

☆.....☆.....☆

وہ مہربانو سے آج مہر آفاق بن گئی تھی۔ اس کا صرف نام ہی تبدیل نہیں ہوا تھا پوری شخصیت ہی بدل گئی تھی، آفاق کی طرف سے صرف وہ اور اس کی ماں شہلا چوہدری نے ہی بارات میں شمولیت اختیار کی تھی۔ رحیم چوہدری نے کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے آنے سے معذرت کر لی تھی۔ غریبوں کی بیٹی بارات کے بغیر بھی آ جانی تو کوئی نہ پوچھتا، یہ سب تو امیروں کا دطرہ ہے۔ حسب نسب کی ہوا غریبوں کو چھو کر بھی نہیں گزری۔ پر امیر اس کے ہنڈولے میں جھولتے رہتے ہیں۔ مہر کسی روبوٹ کی طرح بیٹھی تھی بالکل ساکت پر جب کسی نے چابی گھمائی تو حرکت شروع ہو گئی۔ نکاح سے رخصتی تک وہ کسی روبوٹ کی طرح ہی حرکت کرتی رہی جس کی چابی پہلے دتا کہہ مار کے لیکن اب آفاق چوہدری کے ہاتھ لگ چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

”السلام علیکم مسٹر رضا!“ فون اٹھانے پر اس نے کہا تھا۔

”وعلیکم السلام مسرطابہ! جی کہتے کیسے یاد کیا“۔ مسٹر رضا نے پیشہ وارانہ انداز اپناتے پوچھا تھا۔



”میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔“ وہ جواباً بولی۔

”کب، کہاں؟“ مسٹر رضا نے پوچھا تھا۔

”فائیو اسٹار ہوٹل آج شام پانچ بجے۔“ اس نے جگہ اور وقت ایک ساتھ بتایا۔

”جی ٹھیک ہے میں پہنچ جاؤں گا۔“

”پر مکمل رازداری سے آئے گا کسی کو بھی بھنک نہیں پڑنی چاہئے۔“ اس نے یاد دہانی کرائی تھی۔

”آپ فکر نہ کیجئے کسی کو کچھ علم نہ ہوگا۔“ مسٹر رضا نے یقین دلاتے ہوئے کہا تھا۔

”اوکے اللہ حافظ۔“ اس نے فون ڈسکلیٹ کر دیا تھا۔ وہ اپنے پہلے اہم کام کا آغاز شروع کر چکی تھی۔ اس

کے لبوں پر پراسراری مسکراہٹ نے احاطہ کر لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

حویلی میں مہرو کا کوئی استقبال نہ کیا گیا تھا، شہلا چوہدری ملازمہ کو ہدایت دیتی چلتی بنی تھیں جبکہ وہ ایک جگہ

سرخ چادر میں لپٹی کٹمی سمنائی سی کھڑی تھی۔

”چلو اندر کسی نے پھولوں سے استقبال نہیں کرنا۔“ ملازمہ نے کرخت لہجے میں کہہ کر اس کا بازو کھینچا تھا۔

وہ اس حملے کے لئے تیار نہ تھی اسی لئے بڑے زور سے لڑکھڑائی تھی۔

”ابھی اتنے سے جھٹکے سے لڑکھڑا گئی ہے آگے تو ابھی بڑا کچھ سہنا ہے، تیار کر لے اپنے آپ کو۔“ ملازمہ

ہنستے ہوئے بولی تھی۔ اس کی چپ اب بھی نہ ٹوٹی تھی۔

☆.....☆.....☆

”مس رطابہ! آج آپ کو میرے ساتھ مسٹر واسطی کے ہاں چلنا ہے، تیار رہئے گا۔“ شاندار شخصیت نے

اسے آگاہ کیا تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

”کیا سر؟“ وہ گڑبڑا گئی۔

”کیوں کیا ہوا مس رطابہ؟“ شاندار شخصیت نے بغیر کسی تاثر کے اس سے پوچھا تھا۔

”کچھ نہیں سر! میں تیار رہوں گی“ وہ سنجھل گئی تھی۔

”مس رطابہ! اگر کوئی مسئلہ ہے تو بتائیے۔“

”نہیں سر! ایسی کوئی بات نہیں، وہ دراصل مجھے پرسنل کام سے کہیں جانا تھا۔“

”ہماری میٹنگ پانچ بجے ہے، ابھی کافی ٹائم ہے آپ اپنا کام کر سکتی ہیں۔“ وہ بری طرح پھنس گئی تھی۔

”جی سر!“ وہ اثبات میں ہی سر ہلا سکی تھی۔

”ٹھیک ہے آپ جا سکتی ہیں۔“ وہ جواباً سوچوں میں ڈوبی باہر نکل آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

اپنے کیبن میں جا کر فوراً مسٹر رضا کو فون ملایا تھا۔

”مسٹر رضا! تھوڑی گڑبڑ ہو گئی ہے، آپ ایسا کیجئے چار بجے آ جائیں۔“

”پر مس رطابہ پانچ...“ رضا جواباً بولا۔

”بس کچھ پر اہلیم ہو گئی ہے آپ آجائیے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون فوراً کاٹ دیا تھا۔

”کہاں تک بچو گے میرا کنبہ تمہارے تعاقب میں ہے۔“ وہ زہریلی ہنسی ہنس رہی تھی جس کے زہرنے



اس کا چہرہ تک نیلا کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اسے آفاق کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا، وہ ابھی تک حیران تھی کہ چوہدری خاندان کی اتنی عنایتیں اس پر، دتا کمہار کی بیٹی پر، کچھ تو گڑ بڑ تھی۔ ورنہ رحیم چوہدری اتنا اچھائی کا ڈرامہ نہ رچاتا۔ پر کچھ تو تھا جو مہرو سے چھپا تھا۔ دراصل ہوا یوں تھا کہ آفاق چوہدری ڈرگ کے دھندے میں ملوث تھا۔ جس دن مہرو کی سہیلیوں سے اس کے غنڈوں نے چھیڑ چھاڑ کی تھی اس دن آفاق چوہدری اپنی اسی جیب میں وافر مقدار میں ڈرگز لے کر آیا تھا۔ آفاق اور غنڈوں نے جب اس کی سہیلیوں کے ساتھ بدتمیزی کی مہرو اس جیب کے پیچھے بھاگی تھی اور شور مچانا شروع کر دیا تھا حالانکہ وہ قطعی انجان تھی کہ اس جیب میں ڈرگز ہے پر آفاق چوہدری یہی سمجھا تھا کہ مہرو نے ڈرگز کے پیکٹ دیکھ کر شور مچایا ہے اور اسی بات کے ڈر سے رحیم چوہدری نے دتا کمہار سے پیسوں کے عوض مہرو کا رشتہ مانگا کیونکہ ایک دفعہ مہرو حویلی آجانی تو پھر اس کی زبان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی پر مہرو بے خبری میں ماری گئی تھی، اسے اب بھی اصل معاملے کا کچھ علم نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

”مس رطابہ! کہیں کیوں اتنی ایمر جنسی میں بلایا ہے؟“ وہ دونوں اس وقت فانیو اسٹار ہوٹل میں موجود تھے۔

”مجھے اس کانٹریکٹ کی کاپی چاہئے۔“

”واٹ... آپ کا دماغ تو درست ہے مس رطابہ۔“ مسٹر رضا نے حیران ہو کر کہا تھا۔

”کیوں مسٹر رضا! حیرانی کے غوطے مت کھائیں، میں نے ناقابل یقین بات کہہ دی ہے کیا؟“ اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔

”مس رطابہ! شاید آپ مرنے یا مارنے والی اسٹیج پر پہنچ چکی ہیں، پر میرے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے، میری فیملی کو میری ضرورت ہے ابھی اور آپ جانتی ہیں آپ کن لوگوں کے ساتھ الجھ رہی ہیں۔“ مسٹر رضا رسائیت سے بولے۔

”میں بہت اچھے طریقے سے جانتی ہوں مسٹر رضا! آپ صرف اتنا بتائیں مجھے کانٹریکٹ کی کاپی دیں گے یا نہیں۔“ اب کے اس کا لہجہ درستی لئے ہوئے تھا۔

”اس کاپی کو حاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکی تھی۔

”مطلب یہ مس رطابہ! کہ یہ کانٹریکٹ صرف ہم چار لوگوں کے کمپیوٹر میں mail کی صورت موجود ہے اور یہ میل پاس ورڈ لگی ہوئی ہے، بالفرض اگر میں میل آپ کو send کر بھی دیتا ہوں تو بغیر پاس ورڈ کے یہ open نہیں ہو سکے گی۔“ مسٹر رضا نے تفصیلاً ساری بات گوش گزار کی تھی۔

”مجھے پاس ورڈ کا پتا ہے۔“ وہ جواباً فقط مسکرائی تھی پر مسٹر رضا کا منہ حیرت کے مارے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

آفاق چوہدری تجلہ عروسی میں نشے میں دھست داخل ہوا تھا۔ گرنا لڑکھڑاتا اس کے قریب آیا، وہ سمٹ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہونے والا تھا، اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔



”اب بتا، کہاں بھاگ کے جائے گی مجھ سے۔“ اس نے ایک گندی گالی کے ساتھ مخاطب کیا تھا اور پھر یکدم اس پر پل پڑا تھا۔ پھنر، لاتیں، گھونے برساتا مغلظات بک رہا تھا اور وہ خاموشی سے مار کھاتی جا رہی تھی۔ ”کمیٹی تیرا میں برا حشر کر دوں گا۔“ اس نے اس کے بالوں کو زور کا جھٹکا دیا تھا، اب کے وہ بلبلا اٹھی تھی اور پھر شادی کی پہلی رات اس کی مار کھاتے ہی گزری تھی، انگ انگ جوڑ جوڑ دہائی دے رہا تھا، پروہ کمال ضبط سے برداشت کیے سب کچھ سہتی جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

فائبر اسٹار ہوٹل سے وہ سوا چار نکل آئی تھی۔ آفس ہوٹل سے پندرہ منٹ کی مسافت پر تھا۔ یعنی وہ ساڑھے چار بجے ٹائم پر آفس پہنچ سکتی تھی۔ باہر آتے ہی اس نے ٹیکسی روٹی۔ ”بھائی صاحب! F4 میں اتار دے گا۔“ یہ کہہ کر وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کا آفس F3 میں تھا پروہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتی تھی۔ چھوٹی سی غلطی بھی اس کا بنانا یا کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ ایف فور آ کر وہ پیدل چلتی آفس کی عمارت کی جانب بڑھ گئی تھی۔ اس کا دوسرا اہم کام بھی خاموشی اور سکون سے ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”اری او بنورانی! ابھی تک تیری صبح نہیں ہوئی کیا۔“ وہ پوری رات زمین پر پڑی رہی تھی اس لئے اٹھنے میں دقت ہو رہی تھی۔

”تجھے چوہدرائیں بلا رہی ہیں۔“ اس دن والی ملازمہ دروازے پر کھڑی پیغام دے کر چلتی بنی تھی۔ وہ بمشکل زمین سے اٹھی، اس کے جسم سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ آفاق صبح صبح ہی کہیں جا چکا تھا، بیڈ خالی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی واش روم کی جانب بڑھ گئی تھی، منہ پر دو تین پانی کے چھلکے مارتے ہوئے اپنی شکل کو دیکھا، چہرہ نیلونیل تھا، بے اختیار اس کا دل دھاڑیں مارنے کو چاہا پر اب بھی ضبط کر گئی تھی کیونکہ اب اسے شہلا چوہدری کی عدالت میں پیش ہونا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ آفس کی راہداری میں چلتی اپنے کیمین کی طرف جانے والے راستے پر مڑنے ہی والی تھی کہ شاندار شخصیت کی پکار نے اس کا دل دہلا دیا تھا، وہ یکدم ہڑبڑا کر پٹی تھی۔ ”سر! آپ یہاں۔“ فوراً اس کے منہ سے نکلا۔

”جی مس رطابہ! آپ کہاں سے آرہی ہیں؟“ اس سوال نے اس کے جھکے چھڑا دیئے تھے۔ ”سر! میں نے آپ کو بتایا تھا ناں مجھے کسی رشتہ دار کے ہاں جانا تھا۔“ وہ منجھل کر بولی۔ ”پر آپ تو F4 میں دیکھی گئی ہیں جبکہ آپ کو میرے خیال میں B2 جانا تھا، آپ نے یہ یہی بتایا تھا ناں۔“ اس کا دل چاہا وہ اپنا سر پیٹ لے، وہ اتنی بڑی غلطی کر چکی تھی۔ ”جی سر! پر ٹیکسی والے کو F4 میں کچھ کام تھا، شاید اس نے کسی سواری کو اٹھانا تھا۔ میں وہاں ہی اتر گئی تھی۔“ اس نے جواباً اعتماد سے جواب دیا۔

”ہوں... ٹھیک ہے، آپ میٹنگ میں جانے کی تیاری کیجئے۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا تھا جبکہ رطابہ سوچ رہی تھی کہ اسے منصوبہ کچھ اور مضبوط بنانے پڑے گا۔

☆.....☆.....☆



”لڑکی بس بہت ہو گیا ڈرامہ، اب اپنی اوقات پر آ جاؤ۔“ شہلا چوہدری نے اس کی جانب تنفر بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔

”جی...“ وہ حیرانی سے بولی۔

”کل سے اسے بھی اپنے ساتھ کام پر لگاؤ، مفت کی روٹیاں توڑنے نہیں لائی اسے۔“ وہ ملازمہ کو تنبیہ کرتی کھٹ کھٹ کرتی وہاں سے چلی گئی تھیں۔

”اری بنو تیرے ساتھ یہی سلوک ہونا ہے، اچھی امیدیں مت پال تو کیوں کی بیٹی ہے، ان چوہدریوں میں تیری کوئی جگہ نہیں۔“ ملازمہ نے اسے اپنی طرف سے سمجھایا تھا، وہ بت بنی کھڑی تھی، ساکت و جامد۔

☆.....☆.....☆

میننگ کامیاب رہی تھی۔ دوسری پارٹی کو ان کا کام کافی پسند آیا تھا۔ شاندار شخصیت کے چہرے پر خوشی چمک رہی تھی اور رطابہ کے سینے پر یہ دیکھ کر سانپ لوٹ رہے تھے۔

”مسکراؤ، خوشی منالو پر کب تک مناؤ گے۔“ اس کے لہجے میں زہر بھرا تھا۔

”ارے مس رطابہ! آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں۔“ وہ پاس آیا تو وہ چونک کر پلٹی۔

”آئیے مسٹر واسطی سے آپ کو ملاتا ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا جبکہ اس نے بھی اسی جانب قدم

بڑھا دیئے۔

☆.....☆.....☆

عورت آج بھی انصاف کی تلاش میں ہے، مقام کی تلاش میں ہے کہ شاید مل جائے۔ کچھ عورتیں بے بسی کی چادر اوڑھ لیتی ہیں حالات سے سمجھوتہ کر لیتی ہیں، جو جیسا ہے چلنے دیتی ہیں۔ پر کچھ عورتیں ایسا نہیں کرتیں، وہ اپنے آپ کو حالات کے تابع نہیں کرتیں۔ وہ اپنے مقام کو پانے کے لئے سب کچھ کر جاتی ہیں، جائز، ناجائز، اچھا، برا پر اصل میں انہیں مقام پھر بھی حاصل نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنے مقام سے اور نیچے گر جاتی ہیں، عورت ایک بڑی عجیب شے ہے، محبت کرے تو اپنا سب کچھ نچھاور کر دے پر جب نفرت کرے تو انتقام کی آگ میں جلا کر راکھ کر دے۔

☆.....☆.....☆

مہر پر ظلم و ستم ڈھانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، پورا دن اس سے گدھوں کی طرح حویلی کا کام لیا جاتا اور رات کو آفاق کے حوالے کر دیا جاتا۔ پورے دن کی تھکاوٹ اور رات کو آفاق کی مارا سے کہیں کا نہ چھوڑتی۔ پر اگلی صبح وہ پھر شروع ہو جاتی۔ بس صرف اس پر اتنا رحم کیا جاتا کہ دو وقت کی روٹی پتلے شوربے کے ساتھ دے دی جاتی۔ اس کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ رحیم چوہدری کے پالتو کتے گوشت، دودھ، انواع و اقسام کی اشیاء سے سیر ہوتے تھے پر اسے وہ درجہ بھی نہ مل سکا تھا کہ دو وقت کا کھانا ہی اچھا دے دیا جاتا۔ پر اب بھی صبر کا مادہ اس میں وافر مقدار میں موجود تھا، اب وہ تکلیفوں اذیتوں پر روٹی نہ تھی، بس اپنے اللہ سے معافی اور مدد مانگتی تھی اور ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ اللہ اسے تنہا چھوڑ دیتا، اللہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے، اللہ نے مہر کی سن لی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کو وہ کمرے میں آئی تو آفاق حسب معمول بیڈ پر موجود تھا، وہ دستک دے کر کمرے میں آگئی تھی،



اسے اب آفاق سے ڈر نہیں لگتا تھا، کچھ دن سے اس کی طبیعت گری گری رہنے لگی تھی، پر کام اتنا ہوتا تھا وہ دھیان نہ دیتی تھی۔

”مہر! ادھر آؤ۔“ وہ اس کے کپڑے پر پس کرنے کے لئے نکال رہی تھی جب آفاق نے اسے پکارا تھا، وہ حیران ہو کر پلٹی، کیونکہ وہ اس لہجے کی عادی نہ تھی، آفاق ہمیشہ ہی اسے گالی دے کر مخاطب کرتا تھا، اس لئے اس کا حیران ہونا سجا تھا۔

”جی۔“ وہ پاس آ گئی۔

”بیٹھو یہاں۔“ وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”صبح میں آیا تھا تم دکھائی نہیں دیں۔“ اسے ایک اور حیرانی کا شاک لگا تھا۔ وہ بس گم صم اس کے چہرے کی جانب دیکھتی جا رہی تھی۔

”مہر کیا ہوا؟“ آفاق نے اس کا بازو ہلاتے ہوئے پوچھا۔

”میں آپ کے اس لہجے کی عادی نہیں ہوں اس لئے۔“ وہ سادگی سے بولی تھی اور آفاق نے جواباً نگاہیں شرمندگی سے جھکالی تھیں۔

”مہر! مجھے معاف کر دو۔“ وہ اس کے ہاتھ تھام کر التجائیہ لہجے میں بولا تھا۔

”نہیں آپ ایسا مت کہیں، آپ جیسے بھی ہیں میرے شوہر ہیں، میں نے کبھی آپ کے بارے میں کچھ غلط نہیں سوچا، بس اللہ سے یہی دعا کرتی رہی کہ وہ آپ کو نیکی اور ہدایت کے رستے پر چلائے۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں، بلکہ میں آپ کی مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے ساتھ جا کر رشتے میں باندھا ورنہ آپ دوسرا طریقہ بھی اپنا سکتے تھے۔ آپ شرمندہ مت ہوں مجھے تکلیف ہوتی ہے۔“ وہ اس کے ہاتھ تھامے کہتی جا رہی تھی اور آفاق دم بخود سا اسے سنے جا رہا تھا، کیا وہ اتنا نیک تھا کہ اسے پاکیزہ نیک عورت ملتی، اسے اپنی خوش نصیبی پر ناز ہو رہا تھا اور خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ اس وقت اپنے روم میں موجود تھی اور اس کے آگے اس کا لیپ ٹاپ پڑا ہوا تھا۔ لیپ ٹاپ پر email والا صفحہ اوپن تھا، اس نے inbox میں سے مسٹر رضیا کو کلک کیا، اس کا میٹج اوپن ہو گیا تھا۔ کانٹریکٹ کی کاپی اس کے سامنے تھی۔ بس کامیابی اس سے چند قدم دور تھی، بس صرف پاس ورڈ ڈالنا تھا، پاس ورڈ کس کے نام تھا وہ یہ نام اچھے طریقے سے جانتی تھی اور وہ نام تھا...

☆.....☆.....☆

سب اس کا یا پلٹ پر حیران تھے، آفاق چوہدری کیسے سدھر گیا۔ پر اللہ جسے چاہے نیکی کی ہدایت دے، آفاق چوہدری بھی ہدایت کے رستے پر آ گیا تھا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ آفاق اور اس کے غنڈے آج پھر کسی کا شکار کرنے نکلے تھے اور ان کی نظر دوسرے گاؤں کی الہڑٹیا رگوری پر پڑ گئی تھی۔ گوری اسی گاؤں میں رہائش پذیر تھی۔ باپ گاؤں کا لوہا تھا۔ زندگی غربت بھری گزر رہی تھی پر پھر بھی وہ سب مطمئن تھے۔

آفاق نے گوری کو اٹھوایا تھا اور اسے اپنے اڈے پر لے گیا تھا۔ گوری چلا رہی تھی معافاں مانگ رہی تھی پر آفاق بہہ رہی پر شیطان غالب آچکا تھا، اگلا لمحہ تھا کہ وہ اس کی عزت کی چادر اتار کر پھینکتا، اس وقت گوری



نے ایک ایسی بات کہی تھی کہ آفاق چوہدری وہیں کا وہیں ساکت رہ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”ارے بہن کچھ رطابہ کا سناؤ، خیریت سے ہے ناں، کوئی فون شون آیا گیا۔“ پڑوس والی زینت نے پوچھا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہے، کرتی رہتی ہے۔“ وہ دھیمے سے بولی تھیں۔

”پر بہن ایک بات سمجھ نہیں آتی، لاہور شہر کو چھوڑ کر وہ کراچی اتنی دور کون سی نوکری کرنے گئی ہے۔“ زینت بھی بال کی کھال نکالنے میں ماہر تھی۔

”انتقام کی نوکری۔“ وہ جواباً ہلکے سے بڑبڑائیں۔

”ہیں... کیا کہا؟“ زینت نے اسے بڑبڑاتے دیکھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں، وہاں اسے اچھی نوکری مل گئی ہے۔“ وہ سنبھل کر بولی تھیں اور زینت محض سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

”رطابہ! معاف کر دے انہیں، میں نے معاف کر دیا تو بھی کر دے۔“ انہوں نے دل میں ایک مرتبہ پھر

دہرایا تھا۔

☆.....☆.....☆

”میں دعا کروں گی اگر تمہاری کوئی بیٹی ہو تو وہ میرے جیسی ہو۔“ یہ الفاظ نہیں تھے پگھلا سیسہ تھے جو گوری

نے اس کے کانوں میں انڈیلے تھے، وہ یکدم لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تھا اور کمرے سے فوراً باہر نکل گیا تھا۔ اس کا

وجود آندھیوں کی زد میں تھا۔ گوری کے لفظوں کی بازگشت ابھی بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

”نہیں میری بیٹی نہیں۔“ اس نے اپنے بال مٹھیوں میں بھینچ لئے تھے۔

”کیا ہوا آفاق چوہدری، اپنے پر باری آئی تو عزت کے لالے پڑ گئے۔“ اس کا ضمیر تن کر بولا تھا۔

”گوری نے کچھ غلط کہا کیا؟ نہیں ٹھیک کہا، ذرا فرض تو کرو آج اس جگہ پر اگر تمہاری بیٹی ہوتی تو....“

”نہیں ایسا نہیں۔“ وہ چیخا تھا، ضمیر زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔

”آفاق چوہدری! اس دنیا میں جیسا کرو ویسا بھرو ہوتا ہے، آج اگر تم لوگوں کی بیٹیوں کی عزتیں تار تار کرو

گے تو یاد رکھنا کل کو تمہاری بیٹیاں بھی ہوں گی۔“ وہ پسینے سے تر تھا۔

”میرے اللہ! مجھے معاف کر دے، مجھے معاف کر دے۔“ وہ سجدے کے بل زمین پر گر گیا تھا۔ بے شک

اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

☆.....☆.....☆

”مہرو! آج سے میری بیوی کی حیثیت سے یہاں رہے گی۔“ ڈرائنگ روم میں بیٹھے دونوں نفوس پر اس

نے جیسے بم گرایا تھا۔

”آفاق! تمہاری جرات کیسے ہوئی یہ کہنے کی۔“ رحیم چوہدری اٹھ کر گرجے اور پاس کھڑی مہرو کا دل دہل

کر رہ گیا تھا۔

”تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔“ شہلا چوہدری بھی یہ سن کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”مہرو میری بیوی ہے۔“ وہ ایک مرتبہ پھر بولا۔

”آفاق...“ رحیم چوہدری دھاڑے تھے۔



”تم جانتے ہو، ہم نے تمہاری شادی اس دو ٹکے کی لڑکی کے ساتھ کیوں کی، اگر نہ کرتے تو تم آج جیل میں سڑتے۔“ آفاق جواباً مسکرایا تھا۔

”پرا بابا جان! مہر تو اس بات سے سرے سے ہی لاعلم ہے۔“ یہ سن کر رحیم اور شہلا چونکے۔  
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ مہر و نے ڈرگ کو دیکھ کر شور نہیں مچایا تھا بلکہ اپنی عزت بچانے کے لئے سب کیا تھا۔“ رحیم چوہدری کے سر پر پہاڑ گرا تھا۔  
”اور دوسری بات، مہر و میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔“ اور یہ سن کر شہلا لڑکھرائی تھیں، مہر و اب بھی وہاں کھڑی تھی ساکت و جامد۔

☆.....☆.....☆

”تمہیں اس بچے کو ختم کرنا ہے۔“ شہلا چوہدری تنناتی ہوئی اس کے کمرے میں آئی تھیں۔  
”آفاق ایسا کچھ نہیں ہونے دیں گے۔“ پتہ نہیں اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی کہ وہ شہلا چوہدری کے سامنے بول پڑی تھی۔  
”تم دو ٹکے کی لڑکی، بیچ ذات میرے سامنے زبان چلاتی ہے۔“ شہلا چوہدری نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر بیڈ پر جاگری تھی۔  
”دیکھتی ہوں تمہیں، کیسے اس بچے کو جنم دیتی ہو۔“ وہ دھمکی دیتی کمرے سے باہر نکل گئی تھیں جبکہ وہ اس دھمکی پر لرز اٹھی تھی۔

☆.....☆.....☆

”مس رطابہ کو میرے روم میں بھیجیں۔“ شاندار شخصیت نے پیون کو پیغام بھجوایا تھا۔  
”سر! وہ دودن کی لیو پر ہیں۔“ پیون جواباً بولا تھا۔  
”کیا مطلب؟“

”سر! ان کو اپنے گاؤں جانا تھا، وہ یہی کہہ کر گئی ہیں۔“ پیون نے لاعلمی کا اظہار کیا۔  
”اوکے۔“ پرسوں ان کا پروجیکٹ باقاعدہ شروع ہونا تھا اور رطابہ غائب تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ نام کوئی اور نہیں رحیم چوہدری کا تھا، ہاں رطابہ کا دادا، آفاق کا باپ مہر و کا سر۔ جس نے مہر و اور رطابہ کی زندگیوں میں بھونچال لایا تھا۔ رطابہ کو بے نشان کیا تھا، اس کے باپ کو اس سے چھینا تھا، اس کی ماں کا سہاگ چھینا تھا، ان کو گھر بدر کیا تھا، رطابہ آج انتقام لینے آگئی تھی۔ وہ رحیم چوہدری کو برباد کرنے آگئی تھی کیونکہ شاندار شخصیت کا حامل شخص کوئی اور نہیں رحیم چوہدری ہی تھا۔

☆.....☆.....☆

”آفاق! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے کہیں یہ لوگ ہمارے بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔“ شہلا چوہدری جس وقت سے دھمکی دے کر گئی تھیں مہر و کی جان سولی پرانگی ہوئی تھی، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ شہلا چوہدری کچھ نہ کچھ ضرور کرے گی، اس نے اپنے انجانے خدشوں کا اظہار جلد ہی آفاق کے سامنے کر دیا تھا۔  
”تم گھبراؤ نہیں مہر! میں تمہارے ساتھ ہوں کہیں یا ہمارے بچے کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔“ آفاق کا لہجہ



پر یقین تھا۔ یہ سن کر مہر و کے دل کو ڈھارس ملی تھی۔  
 ”تم پریشان مت ہو۔“ آفاق نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا اور وہ پرسکون ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”رطابہ! پک اپ دی فون۔“ رحیم چوہدری بار بار رطابہ کے سیل پر فون کر رہا تھا۔ رطابہ کا فون سوئچ آف تھا۔ وہ جھلاتا ہوا کمرے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ گھوم رہا تھا۔ پریشانی حد سے سوا تھی، کیونکہ کل ان کا کانٹریکٹ منظور کیا جانا تھا اور اس کانٹریکٹ کی فائل رطابہ کے پاس تھی، اگر رطابہ کل نہ آئی تو رحیم چوہدری سڑک پر آ جاتا کیونکہ وہ اپنا سب کچھ لٹا چکا تھا، وہ دودفعہ خود رطابہ کے ہوشل بھی ہو آتا تھا پروہاں نہ وہ تھی اور نہ اس کی دوست عیشاء۔ آس پڑوس کی لڑکیوں نے بتایا تھا کہ وہ پرسوں ہی بنا بتائے چلی گئی تھیں۔ اب پریشانی اور بڑھ گئی تھی، پر حیرت انگیز طور پر میننگ سے آدھا گھنٹہ پہلے رطابہ واپس آ چکی تھی، حیران کن بات تھی۔

☆.....☆.....☆

”مجھے ہر حالت میں وہ لڑکی یہاں سے غائب چاہئے پر بنا کسی بھی شک و شبہ کے۔“ رحیم چوہدری کی آواز اس تاریک کمرے میں گونج رہی تھی اور گونج کر ہیبت ناک لگ رہی تھی۔  
 ”ہاں ہر کام صفائی سے ہونا چاہئے۔“ اب کے شہلا چوہدری بولی تھیں۔  
 ”ٹھیک ہے چوہدری صاحب! آپ فکر نہ کریں، ہر کام صفائی سے ہی ہوگا۔“ آدمی مودب سا بولا تھا۔  
 ”یہ لورقم، کام پورا ہونے پر پوری ملے گی۔“ چوہدری رحیم نے رقم والا لفافہ آدمی کی طرف پھینکا تھا جسے اس نے کمال مہارت سے پکڑ لیا تھا۔

”ٹھیک ہے چوہدری صاحب۔“ وہ بولا تھا۔  
 ”تم جاسکتے ہو۔“ کمرہ اور تاریک ہو گیا تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
 www.pdfbooksfree.pk

☆.....☆.....☆

”مس رطابہ! مجھے آپ سے ایسی لا پرواہی کی امید نہ تھی۔“ رطابہ اس وقت رحیم چوہدری کے آفس میں موجود تھی۔

”سوری سر! ایمر جنسی میں جانا پڑا اور فائل اتنی قیمتی تھی کہ میں کسی کو دے نہیں سکتی تھی۔“  
 ”ایسی کیا ایمر جنسی تھی؟“

”سر! میری اماں بیمار تھیں اسی لئے مجھے فوراً جانا پڑا۔“ اس کا لہجہ دھیمّا تھا۔

”اوہ... اب کیسی ہیں وہ؟“ رحیم چوہدری نے پوچھا۔

”جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔“ وہ ہلکے سے بڑبڑائی تھی۔

”کیا ہوا مس رطابہ!“ وہ چونک گئی۔

”سر! اب ٹھیک ہیں۔“

”اوکے آپ سب کو آرڈر دیں کہ سب کانفرنس ہال میں جمع ہو جائیں، میں وہیں جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کسی آنے والے فون کی جانب متوجہ ہو گئے جبکہ وہ تیزی سے باہر نکل آئی تھی۔ کامیابی اب چند ساعت پر تھی۔

☆.....☆.....☆

”آفاق بیٹے! تمہاری خالہ نے شہر بلایا ہے ایک رات کے لئے۔“ شہلا چوہدری اس وقت ڈرائنگ روم



میں آفاق کے سامنے والے صوفے پر براجمان تھیں۔

”کیوں بلایا ہے؟“ وہ رکھائی سے بولا تھا۔

”ثانی کا رشتہ آیا ہے اسی سلسلے میں۔“ یہ کہتے ہوئے ان کے لہجے میں دکھ جھلک رہا تھا۔  
شہلا چوہدری کی خواہش تھی کہ ثانی کا رشتہ آفاق کے ساتھ ملے ہوتا پر ایسی نوبت ہی نہ آئی تھی، آفاق خود مہر کو بیاہ لے آیا تھا۔

”تو آپ اور ابا جان کا جانا بنتا ہے میرا کیا کام۔“ وہ ہنوز لا پرواہی سے بولا تھا۔

”بیٹا! تمہارے ابا کو کل اپنے کسی پرسنل کام سے جانا ہے وہ نہیں جاسکیں گے۔ انہوں نے بہانہ بنایا۔

”کون سا پرسنل کام جو مجھے نہیں معلوم۔“ وہ بھی آفاق تھا۔

”اف... کبھی کبھی جھوٹ بولنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔“ انہوں نے دل میں سوچا تھا۔

”کوئی سیاسی کام تھا، اگر نہیں جانا تو صاف صاف بتادو، میں آپا کو منع کر دیتی ہوں۔“ ان کا لہجہ اب کے سخت ہو گیا تھا، آفاق نے جواباً ایک نظر ان کے چہرے پر ڈالی۔

”ٹھیک ہے میں چلا جاؤں گا۔“ کہہ کر اٹھ گیا تھا۔ پیچھے شہلا اپنی کامیابی پر مسکرا رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

آفاق نے اپنے جانے کا اسے بتایا تو وہ پریشان ہو گئی تھی۔ اس کا دل کسی خدشے کے تحت دھڑک اٹھا تھا۔

”آفاق! آپ مت جائیں۔“ وہ رو پڑی تھی۔

”ارے مہر! کیا بچوں کی طرح Behave کر رہی ہو، ایک دن کی ہی تو بات ہے۔“ آفاق نے اسے

حوصلہ دیا تھا۔

”آفاق مجھے لگتا ہے جیسے کچھ ہمارے ساتھ برا ہونے والا ہے۔“ وہ اپنے واہموں کو اب زبان پر لے آئی

تھی۔

”کچھ نہیں ہو گا ڈیر! بس اپنا خیال رکھنا اور ڈرنے کی کوئی بات نہیں، گھر میں ملازم عورتوں کا انبار ہے، دو

تین کو اپنے ساتھ سلا لیتا۔“ آخر میں وہ مسکرایا تھا۔ مہر کا دل اب بھی بے چین تھا، کسی پل قرار نہ تھا، بری

سوچیں اسے کسی آکٹوپس کی طرح اپنے جال میں جکڑے ہوئے تھیں، وہ جتنا سوچتی یہ جال اسے اور مضبوط

جکڑے جاتا، آخر وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی تھی۔

☆.....☆.....☆

”تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟“ یہ رطابہ کے غائب ہونے سے ایک دن پہلے کا وقت تھا، جب وہ اور مسٹر

رضا فانیو اشار ہوٹل میں بیٹھے تھے۔

”یہی سمجھ لیں۔“ وہ شاطر سا مسکرایا تھا۔

”رطابہ کو ابھی بلیک میل کرنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا، سمجھے۔“ وہ پھنکاری تھی۔

”پر رضا ہے جو سب جانتا ہے۔“ رضائے فخریہ کا لڑکھڑے کیے تھے۔

”یو بلڈی چیپ۔“ وہ اسے خونخوار نظروں سے گھورتی ہوئی بولی۔

”اے میڈم! شرافت کی زبان استعمال کرو ورنہ جانتی ہو تم مجھے۔“ رضائے فخریہ کا چولا اتار پھینکا تھا۔

”دو کروڑ۔“ اس نے مطالبہ کیا۔



”بس یا کچھ اور“۔ وہ جواب پاٹ لہجے میں گویا ہوئی۔  
 ”بس مس رطابہ جی!“ وہ تہقہہ لگا کر ہنسا تھا اور رطابہ کانپبل کے نیچے رکھا ہاتھ بڑی تیزی سے کوئی msg کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

”گوری پتر وہ بابا بواب نہیں آیا کیا“۔ اچھو لوہار نے آفاق کی بابت دریافت کیا تھا۔  
 ”نہیں ابا! کافی دن سے نہیں آیا“۔ گوری نے جواب دیا۔  
 ”بڑا ہی نیک بچہ ہے، اللہ صحت اور تندرستی دے اور اسے ہمیشہ خوش رکھے“۔ وہ دعائیں دیتا جا رہا تھا۔  
 ”ہاں ابا! ہر کوئی بدی سے نیکی کی طرف پلٹنے والا نہیں ہوتا پر اللہ جسے چاہے ہدایت دے“۔ وہ مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

آفاق چوہدری کے گوری پر بڑے احسان تھے، پر وہ اب بھی یہی کہتا گوری نے جو احسان اس پر کیا ہے وہ بہت بڑا ہے، وہ گوری کی ہر لحاظ سے مالی امداد کر رہا تھا، اس کے باپ کا شہر کے مہنگے اسپتال میں علاج کروا رہا تھا، گوری نے پھر سے تعلیم سے رشتہ جوڑ لیا تھا، میٹرک کے بعد وہ اسکول چھوڑ چکی تھی، پر اب پھر تعلیم کا سلسلہ بحال ہو گیا تھا، ایسے میں وہ دعائیں نہ سمیٹتا تو اور کیا کرتا۔

☆.....☆.....☆

آفاق اور شہلا چوہدری شہر پہنچ چکے تھے۔  
 آیا اور مانی نے ان کا بھرپور استقبال کیا تھا، آیا کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹے امریکہ میں مقیم تھے اور شوہر بھی آج کل وہاں تھے اسی لئے انہوں نے آفاق کو بلا دیا تھا۔ آفاق کو یہاں آکر کچھ گڑ بڑ کا احساس ہو رہا تھا، بقول شہلا چوہدری کے آج کچھ لوگ ٹانی کا رشتہ پکا کرنے آرہے ہیں، پر یہاں ایسا کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے بار بار خبردار کر رہی تھی۔ اور اس کا یہ خدشہ بھی جلد ہی ثابت ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ہجر کی رات ہم اکیلے کیسے  
 کاٹیں گے، تم نے دل کا  
 دیا جلانے نہیں رکھا  
 نہ کوئی امید دی تم نے  
 نہ کوئی آس بندھائی تم نے  
 پر پھر بھی ہم تیرے انتظار میں ہیں  
 اب دیکھتے ہیں  
 ہمارا انتظار حاصل  
 رہتا ہے یا  
 لا حاصل رہتا ہے

آفاق کے شہر جانے سے مہر کو بیچنی لاحق ہو گئی تھی۔ دن کا کچھ وقت تو وہ ملازمین کے ساتھ کانے لگتی۔  
 پر رات کا سوچ سوچ کر وہ ہلکان ہو رہی تھی۔ ملازموں کے سوا گھر میں کوئی موجود نہ تھا۔ آفاق نے شہر جا کر اس کو



دوسرے فون کیا تھا، وہ اسے تسلیاں ہی دیتا رہا تھا کہ بس وہ صبح آجائے گا، رات کی ہی بات ہے۔ پر وہ یہ نہیں جانتا تھا اکثر گناہ رات کے اندھیرے میں ہی ہوتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

”مجھے منظور ہے، تمہیں کل پیسے مل جائیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور رضا بھی اس کے ساتھ چلتا باہر آ گیا تھا۔

”اوکے مسٹر رضا! good bye“ وہ ہلکا سا مسکرائی تھی، گہری پراسرار مسکراہٹ۔  
 ”اوکے۔“ یہ کہہ کر رضا اپنی کار کی جانب بڑھ گیا تھا جبکہ وہ دوسری طرف اپنی کار کی جانب پڑھی تھی، ڈرائیور آگے تیار تھا، اس کے بیٹھے ہی گاڑی آگے بڑھ گئی تھی، پراچانک فائر کی آواز بڑے زور سے گونجی تھی۔  
 ”مسٹر رضا! good bye“ وہ اب بھی ہلکا سا مسکرائی تھی، پراسراری مسکراہٹ۔

☆.....☆.....☆

آج رات کالی سیاہ تھی۔ آسمان پر بادلوں نے ڈیرہ جمایا ہوا تھا، چاند بھی نہ نکلا تھا۔ مہر کے دل میں اک بے چینی سی لاحق تھی جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ اس کی چھٹی حس بار بار بیدار ہو رہی تھی۔ اس کے پاس جو ملازمہ سوتی تھی وہ آج صبح ہی گاؤں چلی گئی تھی، اس کی والدہ بیمار تھی، باقی ملازم بھی اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے، اس دوران حویلی میں صرف مہر و اور دو چوکیدار ہی بچے تھے۔ ملازموں کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی اور دروازے کھڑکیاں اچھی طرح بند کر لئے تھے۔ آفاق نے آج واپس آنا تھا پر شہلا چوہدری کو اچانک ایک کام یاد آ گیا تھا جس کی بنا پر آفاق کو بھی مجبوراً رکن پڑا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے دل کو بس ایک خدشہ لاحق تھا اور ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
 www.pdfbooksfree.pk

☆.....☆.....☆

یہ دہائی میں بنے ایک لگژری اپارٹمنٹ کا اندرونی منظر ہے۔  
 دو فلپائی اور ایک چینی ملازمہ ایک شخص کو ویل چیئر سے بیڈ پر منتقل کر رہی ہیں، وہ شخص مسلسل ان کا ہاتھ جھٹک رہا ہے پر وہ بے بس ہے، اس کے ناتواں وجود میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ان کو پرے کر سکے، نہ وہ بول سکتا ہے کہ زبان سے ان کو روک سکے، وہ ہر معاملے میں بے بس ہو چکا ہے اور بے بسی سے اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو بڑے واضح دکھائی دے رہے ہیں۔

☆.....☆.....☆

پاس ورڈ اس نے انٹر کر دیا تھا۔ Afaq/R یہ نام تو اس کی رگ رگ میں بسا تھا وہ کیسے اس کو بھول سکتی تھی۔  
 وہ اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ چکی تھی۔ ہاں وہ بہت قریب پہنچ گئی تھی۔  
 اس نے document میں اپنی مرضی کا رد و بدل کر دیا تھا اور یہ سارا رد و بدل رحیم چوہدری کی بربادی سے منسلک تھا۔ اب کے اس کے لبوں پر ایک شاطرانہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔

☆.....☆.....☆

اک تم نے چال چلی تھی  
 اک ہم چال چلتے ہیں

اور



دیکھتے ہیں  
جیت کس کی ہوتی ہے  
کون

مقدر کا سکندر بنتا ہے  
کس کی بازی پلٹتی ہے  
اس شکست کے لئے

تیار رہنا  
جو ہم تم کو دینے والے ہیں  
تمہاری سب چالیں ناکام  
ہونے والی ہیں  
یہ جنون عشق کی  
آگ ہے، جواب  
بھڑک اٹھی ہے  
اپنا بدلہ لینے

کے لئے  
ٹرپ اٹھی ہے  
تم تیار رہنا  
تم تیار رہنا

اک تم نے چال چلی تھی  
اک چال ہم چلتے ہیں

”ہیلو رطابہ! آپ تین دن سے کہاں تھیں؟“ وہ چوتھے دن آفس آئی تھی جب رحیم چوہدری نے پوچھا تھا۔  
”بس سر! گاؤں جانا پڑ گیا تھا۔“ وہ سنجیدہ سی بولی تھی۔

”اوہ... پر بندہ کم از کم اطلاع دے کر تو جاتا ہے۔“ رحیم چوہدری اب کے نرم لہجے میں گویا ہوئے تھے۔  
”اوکے سر! آئندہ خیال رکھوں گی۔“ وہ تابعداری سے بولی تھی۔

”آپ تیار ہیں ناں میٹنگ شروع ہونے والی ہے، Document آپ کے پاس محفوظ ہے ناں۔“ وہ پوچھ رہے تھے۔

”سر! بے فکر رہئے یہ Project آپ کو ہی ملے گا۔“ وہ مسکرائی تھی، زہریلی مسکراہٹ۔

☆.....☆.....☆

”اف... توبہ، ایک تو بندہ غربت میں پس رہا ہے اور ایک قتل و غارت عام ہو رہا ہے۔“ وہ بیڈ پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی جب علیشاء دھپ سے اس کے قریب آ بیٹھی تھی۔  
”کیوں، کیا ہوا؟“ اس نے کتاب سے نظریں ہٹاتے ہوئے پوچھا۔  
”مسٹر رضا، وہ جو چوہدری ٹیکسٹائل اور آفندی ٹیکسٹائل کا ایمپلائی تھا کسی نے اس کا مرڈر کر دیا ہے۔“



علیشاء نے اسے بتایا تھا۔  
 ”اچھا... اوہ کب، مجھے تو نہیں پتا، کب ہوا یہ واقعہ۔“ اس نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا تھا۔  
 ”کل، ویسے حیرت ہے تمہیں نہیں پتا، وہ تو تمہارے آفس کا بھی ممبر تھا۔“ علیشاء نے سوالیہ پوچھا تھا۔ وہ گڑبڑا گئی تھی۔

”میں کل آفس نہیں گئی تھی چھٹی پر تھی، مجھے بھی ابھی سلمیٰ نے کال کر کے بتایا ہے۔“ اس نے بات بنائی تھی۔  
 ”ہوں... چلو اچھا کافی پیو گی، بنالاؤں؟“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔  
 ”ہاں طلب ہو رہی ہے، بنالاؤ۔“ اس نے کہا تھا، علیشاء کافی بنانے اٹھ گئی تھی۔  
 ”جو مجھے بلیک میل کرتا ہے اس کا حشر ایسا ہی ہوتا ہے، چلا تھا مجھے پھنسانے، میرا راز کھولنے، اب بتائے راز۔“ وہ سفاکی کی انتہا پر تھی، وحشت اس کے انگ انگ سے ٹپک رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی، نیند لگتا تھا آج آئے گی نہیں، ڈر سے اس کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آفاق کا فون آیا تھا وہ شہر سے نکل چکے تھے۔ صبح تک حویلی پہنچ جائیں گے۔ اس نے دوبارہ فون کیا مگر فون پاؤر آف تھا۔ شاید چارج ختم ہو گئی ہو، اس نے سوچا اور دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ پتہ نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی، اچانک بڑے زور کا کھٹکا ہوا، وہ یکدم ہڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔  
 ”کک، کون ہے؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہو کر کمرے کے اندر ارد گرد پھیل گیا، اس نے ایک زوردار چیخ ماری تھی اور دوڑ کر دروازے کی جانب بھاگی تھی۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر دروازہ ہنوز مقفل تھا۔  
 ”کھولو دروازہ۔“ وہ چیختی تھی، پر یہاں کوئی ہوتا تو دروازہ کھولتا۔  
 اسی ٹوٹی کھڑکی سے اچانک دو تین لمبے تڑنگے آدمی اس کے کمرے میں کودے، ان کو دیکھ کر اس کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رہ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”رطابہ بی بی! آپ کا کام ہو گیا، اب مجھے میرا معاوضہ دے دیں۔“ فون کی دوسری جانب کوئی آدمی تھا۔  
 ”ہاں ٹھیک ہے تم اپنا پیسہ لے جاؤ۔“ اس نے نپے تلے لہجے میں جواب دیا۔  
 ”پر بی بی ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“ اس کی اگلی بات پر وہ پریشان ہو گئی۔  
 ”کیا مطلب کھل کے بتاؤ۔“ اس نے جھنجھلا کر پوچھا تھا۔  
 ”پولیس انکوائری کر رہی ہے اور انکوائری میں لاسٹ ٹائم یہی بتایا گیا ہے کہ مقتول قتل ہونے سے پہلے آپ کے ساتھ تھا۔“ یہ جملہ دھماکے کی طرح اس کے سر پر گرا تھا۔  
 ”اوہ اچھا میں دیکھ لوں گی۔“ اس نے فوراً فون کاٹ دیا تھا۔ بہر حال رطابہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

گوری کو اس کے چچا زاد نے طلاق دے دی تھی۔ یہ خبر گوری کے لئے سخت صدمے کا باعث بنی تھی۔ جس شادی کو ابھی ہونا تھا وہ ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ گئی تھی۔ گوری کا چچا زاد رشید سے صرف نکاح ہوا تھا، شادی اگلے



ماہ ہونا تھی لیکن بغیر کسی وجہ کے اسے طلاق دے دی گئی اور جب وجہ جاننے کی کوشش کی گئی تو یہ کہا گیا کہ گوری کے گاؤں کے چوہدری کے بیٹے کے ساتھ تعلقات ہیں، وہ ایک بدکردار لڑکی کو اپنی بہو نہیں بنا سکتے۔  
گوری تو اس الزام پر تڑپ اٹھی تھی پر اپنی صفائی میں کچھ نہ کہہ سکی تھی اور پھر ایک ایسا واقعہ ہوا تھا کہ گوری کی پوری زندگی کو بدل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”کک کون ہو، تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ مہر و گھٹی گھٹی آواز میں بڑبڑائی تھی۔  
”چلو ہمارے ساتھ“۔ ایک آدمی نے درستی سے اسے کہا تھا، وہ خوف سے اور گھٹی گھٹی۔  
”میں نہیں جاؤں گی، چھوڑ دیجھے“۔ وہ دیوار کے ساتھ جا لگی تھی۔  
”تمہارے تو اچھے بھی جائیں گے“۔ دوسرے آدمی نے فوراً اس کے منہ پر رومال رکھا اور وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپتی ہوئی پہلے آدمی کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔ دونوں نے اسے کندھے پر اٹھایا اور کھڑکی سے لگی رسی سے باہر کود گئے، رحیم چوہدری کی چال کامیاب ہو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

پورے محلے میں گوری بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصور وار بن گئی تھی۔ لوگوں نے اس کی ذات پر طرح طرح کی باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ گوری کے پورے گھر میں موت سا ساٹا ہر وقت طاری رہنے لگا تھا، نہ گھر کے اندر چین تھا نہ باہر لوگ چین لینے دیتے تھے۔  
گوری کو ایسے وقت میں صرف ایک شخص یاد آیا تھا اور وہ شخص آفاق چوہدری کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

گاڑی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی، شہلا چوہدری اپنے کامیاب پلان پر شاداں و فرحاں تھیں اور دوسری طرف آفاق چوہدری مسلسل مہر و کے نمبر پر ٹرائی کر رہا تھا مگر فون مسلسل پاور آف تھا۔  
”یہ مہر و فون کیوں نہیں اٹھا رہی؟“ اس نے جھنجھلا کر سوچا تھا۔ اس کے چہرے پر اب پریشانی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔

”کیا ہوا بیٹا؟“ شہلا نے چونکنے کی ایکٹنگ کی۔

”کچھ نہیں، بس مہر و کو کب سے فون کر رہا ہوں فون pick نہیں کر رہی“۔ اس نے جواب دیا۔

”اوہ کہیں ہوگی مصروف“۔ شہلا نے کبھی اڑائی۔

”خیریت سے ہی ہو“۔ آفاق کی پر فکر آواز شہلا چوہدری کے تن بدن میں آگ لگا گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”میٹنگ کینسل ہوگئی“۔ یہ انکشاف رطابہ کی ہستی ہلا گیا تھا۔

”کیسے ہوگئی مس ناجیہ، ڈیڑھ گھنٹے میں تو پروجیکٹ سائن ہونا تھا“۔ اسے اپنا سر چکراتا محسوس ہو رہا تھا۔

”ہاں نہیں مس رطابہ، ابھی ابھی جاوید (سیکرٹری) کی کال آئی کہ میٹنگ کینسل ہوگئی، اب next week

ہوگی“۔ ناجیہ نے تو صحیح معنوں میں اس کا دل دہلا دیا تھا۔ اس کو اپنی ساری پلاننگ بھاڑ میں جاتی محسوس ہو رہی تھی۔

”میں اب اور انتظار نہیں کر سکتی“۔ وہ بڑبڑائی تھی۔



”کچھ کہا مس رطابہ؟“ ناجیہ نے اسے بڑبڑاتے دیکھ کر پوچھا تھا۔  
 ”نہیں، ہاں کچھ نہیں۔“ وہ یہ کہہ کر کیبن سے باہر نکل گئی۔ ناجیہ نے نا سمجھی سے اسے دیکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

”مجھے آفاق چوہدری سے ملنا ہے؟“ اس نے چادر کا پلو منہ کے اور آگے کرتے چوکیدار سے کہا تھا۔  
 ”وہ گھر پر نہیں ہیں۔“ چوکیدار نے اسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”دیکھو میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے، پلیز مجھے ان سے ملوادو۔“ اب کے وہ منت بھرے لہجے میں بولی تھی۔

”ارے لڑکی کہاناں کہ آفاق نہیں ہے گھر پر، جاؤ یہاں سے۔“ وہ کرخت لہجے میں بول کر دوسری جانب مڑ گیا تھا کہ اچانک اس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔  
 ”ہیلو صاحب، جی اچھا صاحب۔“ فون کٹ گیا۔  
 ”تمہیں اندر چوہدری رحیم نے بلایا ہے۔“ یہ سنتے ہی وہ بری طرح لڑکھڑائی تھی۔

☆.....☆.....☆

”سر! پلیز آپ یہ سوپ پی لیں آپ کی health کے لئے بہت ضروری ہے۔“ فلپائی ملازمہ اس شخص کی منتیں کر رہی تھی پر وہ شخص اپنی ضد پر اڑا تھا۔  
 ”نن نئی، ہٹ ہٹو۔“ وہ بمشکل دو لفظ بول پایا تھا۔ ملازمہ سر پکڑ کر رہ گئی۔  
 ”مجھے فون کرنا پڑے گا۔“ اس نے سوچا اور ٹرے لے کر باہر نکل گئی۔ اس شخص نے نم آنکھوں سے اسے جاتے دیکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

”بولو لڑکی تمہیں کیا کام ہے آفاق سے؟“ رحیم نے درشتی سے اس سے پوچھا تھا۔  
 ”مجھے آفاق صاحب سے ملنا ہے۔“ اس نے سرسراتے لہجے میں جواباً کہا تھا۔  
 ”وہ گھر نہیں ہے، ویسے تم کہاروں کی بیٹی ہونا۔“ چوہدری رحیم نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا تھا۔  
 ”جی میں دوسرے گاؤں سے آئی ہوں۔“  
 ”اچھا لڑکی یہ بتاؤ تمہیں کیا کام ہے آفاق سے؟“  
 ”وہ مجھے...“ وہ الف تائے پوری کتھاساتی گئی، پر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ کتھا اس کے گلے کا پھندا بن جائے گی، اگر جان جاتی تو...“

☆.....☆.....☆

”السلام علیکم اماں! کیسی ہیں آپ؟“ فون کی دوسری جانب اماں تھیں۔  
 ”وعلیکم السلام! رطابہ کیسی ہو؟“ اماں نے حیرت انگیز طور پر اس مرتبہ کافی نرم و مطمئن لہجے میں حال احوال پوچھا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ یاس سے بولی تھی۔

”کب تک آرہی ہو؟“

”بہت جلد ایک بہت بڑی خوشخبری لے کر۔“



”اچھا، کسی کی بربادی کو تم خوشخبری کہہ رہی ہو۔“ اماں طنز اُٹھتی تھیں۔  
 ”اس خوشخبری کو پانے کے لئے میں نے بہت پاڑ بیٹے ہیں، اب آرام و سکون تو سود سمیت حاصل کرنا ہے  
 ناں یہ تو میرا حق ہے۔“ اس کے چہرے پر مخصوص زہریلی مسکراہٹ ڈرائی تھی۔  
 ”پرائیک بات یاد رکھنا۔“ اور یہ بات اسے ساکت کر گئی تھی۔ کبھی کبھی زندگی میں ایسا ہوتا ہے کہ ہم بہت  
 کامیاب پلان بناتے ہیں اور ان کو پورا کرنے لئے ہر حد پار کر گزرتے ہیں، پرائیک لمحہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر دوسرا  
 بندہ کوئی ایسی انجان، لا تعلق بات جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ ہو، کر دے تو ہمارے پلان منصوبے سب  
 دھڑے کے دھڑے رہ جاتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

”ہیلو سر! جی سر وہ بات نہیں مانتے اور کھانے پینے سے تو ہر وقت لا تعلق ہی رہتے ہیں، اگر زور زبردستی نہ کی  
 جائے تو ایک گھونٹ پانی حلق سے اتارنے کو برا سمجھتے ہیں اور غصہ کی تو آپ نہ ہی پوچھئے تو بہتر ہے سر، ہم ملازم  
 ہیں آپ کے حکم کے تابع ہیں۔“ فلپائنی ملازمہ ٹورینا نے فون کی دوسری جانب بولتے شخص کو کہا تھا۔ فون کی  
 دوسری جانب چند لمحے خاموشی چھا گئی تھی۔  
 ”ہیلو سر!“ وہ دوبارہ مخاطب ہوئی۔  
 ”ہوں۔“ اس شخص نے ہنکارا بھرا تھا۔  
 ”تم جب تک میں وہاں نہیں آ رہا جیسا چلتا ہے چلنے دو، میں پھر وہاں آ کر خود دیکھ لوں گا۔“ وہ بولا تھا۔  
 ”اوکے سر! جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ وہ تابعداری سے بولی تھی اور چند ادھر ادھر کی باتوں کے ساتھ فون  
 ڈسکریٹ ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”مس رطابہ! آپ فکر مت کیجئے، آپ کا رضا کے کیس سے نام ہٹالیا گیا ہے۔“ مسٹراسطی نے اسے فون پر  
 اطلاع دی تھی۔ اس لئے وہ ان کے پاس چلی آئی تھی۔  
 ”کیسے؟“ وہ حیرت زدہ سی گویا ہوئی۔  
 ”رجیم چوہدری نے سب معاملات حل کئے ہیں۔“ مسٹراسطی نے جواباً آگاہ کیا تھا۔  
 ”اوہ اچھا۔“ وہ مطمئن سی بولی تھی۔  
 ”پرس رطابہ کیا آپ مسٹر رضا کے ساتھ وہاں تھیں؟“ مسٹراسطی کا انداز کریدنے والا تھا، وہ بل کھا کر رہ  
 گئی تھی۔  
 ”دیکھیں مسٹراسطی! میں وہاں اس سے ایک بزنس ایشو پر ملنے گئی تھی اور اس کا قتل میرے وہاں سے جانے  
 کے بہت دیر بعد ہوا تھا۔“ اس کا انداز کوفت بھرا تھا۔  
 ”اوہ اچھا۔“ وہ بھی اسی کے انداز میں بولا تھا۔ وہ بے دلی سے اس کے آفس سے نکل آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”اس سب کے بدلے میں تمہیں ہمارا ایک کام کرنا ہوگا۔“ آفاق چوہدری کا باپ کرخت لہجے میں بولا تھا۔  
 ”جج جی کون سا کام؟“ وہ ہکلائی تھی۔  
 ”بتادیں گے مگر اگر اس کام کی بابت کسی کو پتہ چلا تو جج جج تمہاری عزت کی چادر تار تار ہو جائے گی۔“ گوری



کو اس لمحے وہ ایک ذلیل، ہوس زدہ بھیڑیا لگا تھا مگر وہ اس سب میں بری طرح پھنس چکی تھی۔  
 ”اگر وہ یہاں نہ آتی تو یہ سب نہ ہوتا۔“ اس نے اپنے آپ کو ہزاروں مرتبہ کوسا تھا۔ پر وہ جانتی تھی اسے  
 اب رحیم چوہدری کے اشاروں پر مجبورانا چینا تھا اور رحیم چوہدری کو اور کوئی تجربہ ہو یا نہ ہو دوسروں کو اپنے اشاروں  
 پر نچانے کے تجربے پر کافی مہارت حاصل تھی۔

☆.....☆.....☆

”رطابہ! تمہارا باپ زندہ ہے؟“ یہ انجان لا تعلق بات جو اس نے وہم و گمان میں بھی نہ سوچی تھی اماں نے  
 دو منٹ میں کہہ دی تھی۔

”کک کیا، ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس کو لگا جیسے یہ کانوں کا دھوکہ ہو۔  
 ”جو بھی کرنا، اب سوچ سمجھ کر کرنا، اسی بات کی وجہ سے میں ڈرتی تھی، چوہدری رحیم سے کوئی بعید نہیں وہ گھٹیا  
 آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔“ اماں کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”مگر اماں! آپ کو کیسے پتہ چلا اور آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔“ آنسو بے اختیار چھلکنے کو بے تاب ہوئے تھے۔  
 ”مجھے تو پتہ نہیں کتنے سالوں کا پتہ تھا۔“ اماں کھوئی کھوئی بولی تھیں۔

”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں، بس تم اب ذرا اور ہوشیار رہنا۔“ اماں نے یہ کہہ کر فوراً فون بند کر دیا تھا۔  
 جبکہ رطابہ تو یہ سب جان کر ابھی تک بے یقین تھی کہ اس کا باپ زندہ ہے، اس کا دل یکدم پرسکون ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”مس رطابہ! آپ کو پتا تو ہے یہ پولیس اور میڈیا والے رائی کا پہاڑ بنا لیتے ہیں، پر میں نے ان سب کا منہ  
 بند کر دیا۔“ وہ اس وقت چوہدری رحیم کے آفس میں موجود تھی۔

”جی سر! میں آپ کی بہت مشکور ہوں ورنہ میں کہاں کہاں تک خوار ہوتی۔“ اس کا لہجہ سنجیدگی سے پُر تھا۔  
 ”ہوں، مس رطابہ! آپ کچھ کہنے آئی تھیں، آئی تھیں۔“

”جی سر! میں ایک بات پوچھ سکتی ہوں۔“ وہ بولی تھی۔

”جی مس رطابہ پوچھیں۔“ وہ مسکرایا تھا اور رطابہ کو اس کی یہ مسکراہٹ زہر لگی تھی۔

”سر آپ نے Project dealing کینسل کیوں کی؟“ اس نے پوچھتے وقت اپنے لہجے کو لا پرواہ  
 بنانے کی ایک ہلکی سی کوشش کی جس میں وہ کافی حد تک کامیاب رہی تھی۔

”اوہ... مس رطابہ بس کچھ پرسنل میٹرز کی وجہ سے ایسا کرنا پڑا۔“

”پر سر! یہ میٹنگ آپ کے اختیار میں تو نہیں تھی کہ آپ رد و بدل کرتے۔“ اس نے دو ٹوک لہجے میں جواباً  
 پوچھا تھا، چوہدری رحیم مسکرایا تھا۔

”ہاں، بس کچھ باتیں راز ہی رازنی چاہئیں۔“ وہ اس انداز پر تلملا کر رہ گئی تھی۔

”اد کے سر۔“ وہ پھیکا سا مسکرائی اور اجازت لے کر باہر نکل آئی۔

”راز بکھرتے رہتے ہیں، تمہارے سارے راز میں ہی فاش کروں گی، ڈال لو جتنے اپنے کالے کرتوتوں پر  
 پردے ڈالنے ہیں، بے نقاب تمہیں میں ہی کروں گی۔“ یہ کہتی وہ دوسری جانب بڑھ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆



”سر پلیز! تھوڑا سا سوپ ہی پی لیجئے، دیکھیں آپ کی صحت دن بدن ڈاؤن ہوتی جا رہی ہے، آپ کے لئے یہ بہت ضروری ہے، پلیز پی لیجئے۔“ فلپا کئی ملازمہ نے سوپ کا بھرا پیالہ اس شخص کے آگے کیا تھا۔ پروہ شخص چت لیٹا چھت کو گھورے جا رہا تھا۔

”سر دیکھیں! یہ سوپ ہی آپ کی خوراک ہے، اگر آپ یہ نہیں پیئیں گے تو ٹھیک کیسے ہوں گے۔“ ملازمہ نے ایک مرتبہ پھر اپنا سر پٹخا تھا۔ پراگلے پران سب باتوں کا اثر نثار د تھا۔

”میں نے بڑے سر کو فون کیا ہے، وہی اب آپ کو پوچھیں گے۔“ اس مرتبہ اس شخص نے پلکیں جھپکائی تھیں اور بمشکل ایک لفظ بولا تھا۔ فلپا کئی ملازمہ یہ لفظ سن کر ششدر رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”رطابہ! اس مرتبہ کافی ٹائم ہو گیا تم اپنے گاؤں نہیں گئیں۔“ وہ حسب معمول بستر پر لیٹی مطالعہ میں مصروف تھی جب علیشاہ کلینزنگ کریم اپنے ہاتھوں پر ملتے ہوئے اس کے قریب لیٹتے ہوئے بولی تھی۔

”اب ایک مرتبہ ہی جاؤں گی۔“ اس نے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا تھا۔

”کیا مطلب؟“ علیشاہ کو اچنبھا ہوا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ لا پرواہ سا بولی تھی۔

”یہ آج کل تم کن خیالوں میں رہ رہی ہو رطابہ، ہر بات کا ادھورا جواب، بے پرواہ انداز، یہ ہو کیا گیا ہے تمہیں۔“ علیشاہ اس کے انداز پر جھنجھلا کر گویا ہوئی تھی۔

”کیا ہوا ہے مجھے، اچھی بھلی ایکٹو ہوں۔“ اس نے مذاق میں بات مالتے ہوئے کہا۔

”بات کو ٹالو مت، اچھا۔ تم بتانا نہیں چاہتی دوسری بات ہے پر کچھ ہے جو تم مجھ سے بھی چھپا رہی ہو، تم مانو یا نہ مانو۔“ علیشاہ دو ٹوک لہجے میں بولی تھی۔

”اف ایک تمہاری ابھی تک شک کرنے کی عادت نہیں گئی، ہر بات میں بیویوں کی طرح تفتیش شروع کر دیتی ہو۔“ رطابہ نے اس کا ذہن اس بات سے بھٹکایا تھا اور علیشاہ واقعی اس بات سے بھٹک گئی تھی۔ رطابہ نے سکون کا سانس لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”ہم تھوڑی دیر میں حویلی پہنچنے والے ہیں، اس ڈرامے کا اینڈ تیار رکھیں۔“ شہلا چوہدری نے میج ٹائپ کر کے فوراً چوہدری رحیم کو سینڈ کیا تھا جبکہ دوسری طرف آفاق کی پریشانی حد سے سوا تھا۔ اس کے دل میں ابھرنے والے دوسو سے کچھ غلط ہونے کا سگنل دے رہے تھے۔ وہ جلد از جلد مہرو کے پاس پہنچنا چاہتا تھا پر سفر تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ شہلا بیٹے کی بے چینی سے خوب لطف انداز ہو رہی تھیں اور اس وقت وہ ماں نہیں صرف بیوی بن چکی تھیں۔ ایک ظالم، جاہل انسان کی بیوی...

گاڑی شہر کی حدود میں داخل ہو چکی تھی پر چوہدری آفاق کے دل کو بے چینی ابھی تک لاحق تھی۔

☆.....☆.....☆

”مہربانی بی دروازہ نہیں کھول رہیں صاحب۔“ سکیمنہ دوڑتی ہوئی چوہدری رحیم کے پاس آئی تھی۔

”واش روم میں ہوگی۔“ چوہدری رحیم کا انداز لا پرواہی لئے ہوئے تھا۔

”صاحب باہر کے دروازے پر بھی کنڈی لگی ہوئی ہے۔“ سکیمنہ نے ڈرتے ڈرتے پھر بتایا تھا۔



”سیکنہ تمہیں پتہ ہے میں دو دن بعد آج گھر آ رہا ہوں، تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہو؟“ چوہدری رحیم دھاڑا تھا، سیکنہ خوف سے سمٹ کر رہ گئی تھی۔  
”صاحب مہم میں تو“۔ وہ ہکلائی تھی۔

”گارڈز کو بلا کر دروازہ تڑواؤ“۔ چوہدری رحیم نے اگلا حکم صادر کیا تو سیکنہ دوڑتی ہوئی باہر کی جانب بھاگی اور اگلے چند منٹ میں تمام گارڈز دروازہ توڑنے میں مصروف ہو چکے تھے، بھاری دیوہیکل دروازے کو توڑنا اتنی آسان بات تو نہ تھی، پر چند کوششوں کے بعد دروازہ ٹوٹ کر وا ہو گیا اور کمرے کا منظر سب ملازموں کا دل دہلا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک اندھیری گھپ اندھیری کوٹھڑی میں پایا، وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی بے ہوشی کی وجہ سے ذہن ابھی بھی غنودگی میں تھا۔

”یہ میں کہاں ہوں؟“ وہ بڑبڑائی تھی اور چند لمحوں بعد وہ غنودگی سے نکل آئی تھی، یکدم دو دن پہلے ہوا واقعہ پوری فلم کی طرح اس کی آنکھوں میں گھومنے لگا تھا۔

”میں اغوا ہو گئی ہوں؟“ یہ سوچتے ہی اس کا دل بند ہو گیا تھا۔ وہ دروازے کی جانب بھاگی تھی لیکن گھپ اندھیرے میں دروازے کو ڈھونڈنا مشکل تھا، وہ دیواروں کو ٹٹولتی لڑکھڑاتی بالآخر دروازے تک پہنچ گئی تھی۔

”کوئی ہے خدا کے لئے میری مدد کرو، نکالو مجھے یہاں سے“۔ وہ زور زور سے چلاتی دروازے کو کھٹکھٹا رہی تھی لیکن دوسری جانب مکمل ساکت خاموشی ہنوز موجود تھی۔  
”کوئی تو میری مدد کرو“۔ وہ روتے ہوئے زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”مس رطابہ! اگلے ہفتے کو میٹنگ فائل ہے، آپ وقت پر آفس میں موجود رہئے گا“۔ چوہدری رحیم نے اسے فون پر آگاہ کیا تھا۔

”جی سر! میں ضرور پہنچوں گی“۔ پچھلے دو دن سے موکی اثرات کے باعث اس کی طبیعت تھوڑی نا ساز تھی اس لئے وہ آفس سے چھٹی پر تھی۔

”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ چوہدری رحیم نے رسماً پوچھا۔

”جی بہتر ہے سر“۔ وہ بولی۔

”اوکے پھر اگلے ہفتے آفس میں ملاقات ہوتی ہے تب تک آپ چھٹیاں انجوائے کریں“۔ چوہدری رحیم نے مسکراتے ہوئے کہا اور چند کی باتوں کے بعد فون بند ہو گیا۔

”کون تھا؟“ علیشا نے پوچھا۔

”سرتھے آفس سے“۔

”ہوں، آفس آنے کا کہہ رہے ہوں گے“۔

”ہاں یہی کہا ہے“۔

”ویسے رطابہ! تمہارے سر کافی ڈشنگ ہیں“۔ اس نے دوسری بات چھیڑ دی تھی۔



”مطلب؟“ رطابہ بولی۔  
 ”آئی مین تمہارے سر کی جتنی اتج ہے اتنے کے لگتے نہیں ہیں، خود کو کافی مین ٹین رکھا ہوا ہے انہوں نے۔“  
 علیشاء کے لہجے میں متاثر ہونے کی جھلک نمایاں تھی۔  
 ”ہوں...“ وہ بے نیازی گویا ہوئی۔ علیشاء اس کے بیگانہ انداز کو نا سازی طبع کے باعث نظر انداز کر گئی تھی۔

”اچھا تم آرام کرو لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ علیشاء لائٹ آف کر کے روم سے باہر نکل آئی تھی۔  
 ”ارے علیشاء، مس فریجہ کے نوٹس ہوں گے تمہارے پاس۔“ اکناکس ڈپارٹمنٹ کی زئیرا اسے دیکھتے ہی فوراً اس کی جانب آئی تھی۔

”ہاں ہیں پر ابھی نہیں دے سکتی۔“ علیشاء نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نفی میں جواب دیا۔  
 ”کیوں نہیں دے سکتیں؟“ زئیرا نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”روم میں رطابہ آرام کر رہی ہے، وہ جاگتی ہے تو تمہیں دے جاتی ہوں۔“  
 ”اوہ اچھا، ویسے ایک بات پوچھوں؟“ زئیرا کا انداز سرگوشیا نہ سا تھا۔  
 ”پوچھو۔“ علیشاء بولی۔ وہ دونوں چلتے چلتے ہوٹل سے ملحقہ باغ کی جانب نکل آئی تھیں۔  
 ”یہ تمہاری فرینڈ رطابہ کچھ پراسرار عادتوں کی مالک لگتی ہے۔“ زئیرا نے دھیمی آواز میں گوبرافشانی کی تھی۔  
 ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ علیشاء کو تو یہ سن کر پتنگے ہی لگ گئے تھے۔  
 ”مطلب یہ نہ وہ کسی سے ملتی ہے نہ بات کرتی ہے، چلو ہم مانتی ہیں وہ ہمارے ساتھ نہیں پڑھتی پر پھر بھی وہ تمہارے سوا ہوٹل کی کسی لڑکی سے بات نہیں کرتی، آدم بیزار لگتی ہے۔“ زئیرا نے تفصیلاً اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

”مس زئیرا! یہ باتیں تم اس کے سامنے جا کر کہو، پراسرار، آدم بیزار، وہ تمہارا منہ توڑ دے گی۔“  
 ”کیوں توڑ دے گی، میں نے غلط تو نہیں کہا۔“ زئیرا نے تن کر دو بدو کہا۔  
 ”رطابہ جیسی بھی ہے اس کی اپنی زندگی ہے، ہر انسان کی نیپرا لگ ہوتی ہے، کچھ کم گو ہوتے ہیں کچھ باتونی، کچھ اپنے آپ میں رہتے ہیں، کچھ ہر کسی کے معاملے میں اپنی ٹانگ اڑاتے ہیں، کچھ معاملہ فہم ہوتے ہیں، کچھ معاملہ بگاڑتے ہیں، کچھ سمجھدار ہوتے ہیں، کچھ بے وقوف ہوتے ہیں، اب ہم ہر کسی کو ایک ہی صف میں کھڑا نہیں کر سکتے۔“ علیشاء نے جواباً ایک دھواں دھار تقریر کر کے اس کے چھکے چھڑا دیئے، وہ اس کا ردوائی پر بھونچکی کھڑی رہ گئی تھی۔

”کچھ اور کہنا ہے یا میں جاؤں۔“ علیشاء نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔  
 ”نہیں۔“ وہ ہنسنے لگی اور علیشاء اس کے ہوائیاں اڑتے چہرے کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔  
 ”اب کچھ بولنے سے پہلے ہزار دفعہ سوچو گی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دوسری جانب بڑھ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

کمرے کی ابتر حالت دیکھ کر ملازموں کا دل بند ہو گیا تھا۔  
 ”کیا ہوا؟“ چوہدری رحیم خراماں چلتا اس جانب آیا تھا۔



”وہ صاحب مہربانی کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔“ سیکینہ نے ڈرتے ڈرتے اپنی زبان کھولی تھی۔  
 ”واٹ، اوہ مجھے پہلے دن سے ہی پتہ تھا اس نیچ ذات کی لڑکی نے یہی گل کھلانا تھا، بھاگ گئی ہے وہ اپنے یار  
 کے ساتھ، بنا لگا گئی چوہدریوں کی عزت کو۔“ یہ غلیظ الفاظ کہتے ہوئے چوہدری رحیم خود نیچ سے نیچ تر لگ رہا تھا پر  
 اپنے گریبان میں جھانکنا کون پسند کرتا ہے۔  
 ”اغوا نہیں ہوئی نیچ ذات خود بھاگ گئی۔“ رحیم چوہدری کی دھاڑ نے نیچے کھڑے آفاق چوہدری کا دل دہلا  
 دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ریتلی دیوار کی طرح نیچے گرنا محسوس کر رہا تھا اور بالآخر نیچ نیچے گر گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”تمہیں ہمارا ایک کام کرنا ہوگا؟“ چوہدری رحیم کی اس بات پر گوری کا دل بڑی بے ترقیبی سے دھڑکا تھا۔  
 اس نے اپنی پسینے سے تر ہتھیلیوں کو اپنے گرد پھیلی چادر کے اور اندر کیا تھا۔  
 ”لگ، کون سا کام؟“ وہ ہٹکا کر بولی تھی۔  
 ”ہمارے پاس ایک لڑکی ہے جو قید میں ہے، تمہیں اس کے ساتھ رہنا ہے۔“ اس بات پر اس کی رُکی سانس  
 بحال ہوئی۔

”مگر کیوں؟“ اب کے وہ تھوڑا اعتماد سے بولی۔

”وہ امید سے ہے، لڑکی تمہارے دماغ میں بھوسا بھرا ہے کیا؟“ یہ آواز شہلا چوہدری کی تھی۔

”کہاں ہے وہ؟“ اس نے پوچھا۔

”لے چلیں گے تمہیں۔“

”مگر میرے گھر والے کیا کہیں گے۔“

”ہم سب سنبھال لیں گے۔“ چوہدری رحیم نے نخوت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔“ اس نے مثبت جواب دیا پر وہ یہ نہیں جانتی تھی قسمت اس کے ساتھ کیا کھیل  
 کھیلنے والی ہے۔

☆.....☆.....☆

”مم، مم، مم، ماہ۔“ یہ پانچ الفاظ ملازمہ کو ششدر کر گئے تھے۔ وہ حیران سی اس شخص کو تکے جا رہی تھی جس  
 نے دو سال میں پہلی مرتبہ مکمل الفاظ بولے تھے۔

”مہر ماہ یہ کون ہے سر؟“ ملازمہ نے خوشی سے سوالیہ پوچھا تھا۔

”مم، مم، مم، ماہ۔“ یہ الفاظ دوبارہ اس کے منہ سے نکلے تھے۔

”سر کون ہیں یہ بتائیے، اگر ممکن ہو تو میں ان کو یہاں بلا لوں گی۔“ ملازمہ نے اپنی طرف سے مدد کرنی  
 چاہی تھی پر وہ یہ نہیں جانتی تھی اس شخص نے 23 برس بعد یہ مکمل الفاظ بولے ہیں، اگر جان جاتی تو ضرور بے ہوش  
 ہو جاتی۔ کئی باتیں راز ہی رہیں تو زیادہ اچھا ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

”آفاق صاحب کو سخت قسم کا اسٹروک (فالج) ہوا ہے، وہ جسمانی طور پر معذور ہو چکے ہیں۔“ ڈاکٹر جمیل  
 انصاری کے یہ الفاظ پگھلا سیسہ بن کر رحیم چوہدری کے کانوں میں اترے تھے۔  
 ”یہ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ رحیم چوہدری یکدم لڑکھڑایا تھا۔ اس خبر نے اس



کے ہوش و حواس چھین لئے تھے۔  
 ”سوری رحیم صاحب! وہ اپنے بولنے کی طاقت بھی کھو چکے ہیں۔“ ایک اور خبر رحیم چوہدری کے اوپر پہاڑ بن کر ٹوٹی تھی، وہ پاس رکھی کرسی پر ڈھسے سا گیا تھا۔  
 ”مگر یہ کیسے ہوا؟“

”ان کو کوئی بہت سخت قسم کا صدمہ پہنچا ہے یا دیا گیا ہے، آئی ڈونٹ نو پراسٹروک کی وجہ یہی بنا ہے۔“ ڈاکٹر یہ کہہ کر چلا گیا تھا پر رحیم چوہدری کو تپتے صحرا میں کھڑا کر گیا تھا۔  
 ”میں شہلا کو کیسے بتاؤں گا۔“ چوہدری رحیم کے ہونٹ بڑبانے کے انداز میں ہلے تھے۔  
 اور یوں آفاق چوہدری، رحیم چوہدری کی سازش کو جانے بغیر زندہ لاش بن گیا تھا۔  
 مہرماہ اور اس کے ساتھ کی انٹو ڈوری پل میں توڑ کر ہوا میں اچھال دی گئی تھی اور یہ قصہ بھی بغیر حل ہوئے کسی تابوت کی طرح زمین کی گہرائی میں دفن دیا گیا تھا۔  
 یہ کہانی شروع کرنے سے پہلے ہی ختم کر دی گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

گاڑی گاؤں کی حدود سے نکل کر شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ خاموشی سے ان انجانے راستوں کو دیکھ رہی تھی۔ ان نگاہوں میں نہ شوق تھا نہ اشتیاق، بس ایک بے چینی تھی۔ دل بھی الگ سہا سا تھا۔  
 ”پتہ نہیں جہاں میں جا رہی ہوں وہاں کیا ہوگا، کہیں یہ لوگ مجھے کہیں اور تو نہیں لے جا رہے۔“ ایسی لاتعداد سوچیں، وسوسے پورا راستہ اس کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ گاڑی میں ایک عورت اور دو مرد موجود تھے۔ وہ عورت کی موجودگی میں بھی خوفزدہ ہو رہی تھی اور ایسے ہی آنکھ مچولی میں پورا راستہ کٹ گیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے مطلوبہ جگہ رکی تھی۔

☆.....☆.....☆

طبیعت تھوڑی بہتر ہونے پر وہ آج آفس چلی آئی تھی۔ آفس داخل ہوتے ہی اسے پتہ چل گیا تھا کہ چوہدری رحیم آفس نہیں آئے اور مس ناجیہ نے اس کی تصدیق بھی کر دی تھی۔  
 ”سر! دینی گئے ہیں اپنے پرسنل کام سے۔“ مس ناجیہ نے اسے سرسری سا آگاہ کیا تھا۔  
 ”اچھا، پردی میں کون سا کام ہو سکتا ہے، وہ بھی پرسنل۔“ اس نے سوچا، پر کوئی سراہا تھ نہ لگا تھا۔  
 ”کچھ کہا آپ نے مس رطابہ؟“  
 ”نہیں کچھ نہیں۔“ وہ بولی۔

”آپ یہ فائلیں دیکھ لیں پھر میں لے جاؤں گی۔“ مس ناجیہ نے فائلیں میز پر اس کے آگے رکھی تھیں۔  
 ”اوکے میں دیکھ لوں گی، جائیں آپ۔“ یہ کہہ کر وہ فون کی جانب متوجہ ہو گئی جہاں کسی کی کال آرہی تھی۔  
 ”ہیلو، جی کون؟“ اس نے فون اٹھاتے ہی پوچھا تھا۔  
 ”آپ مس رطابہ بات کر رہی ہیں پاکستان سے، سر رحیم چوہدری کی سیکریٹری۔“ فون کرنے والی نے مکمل معلومات لپٹی چاہی تھی۔

”جی میں ہی رطابہ ہوں۔“ وہ بولی۔  
 ”اوکے، دو منٹ ہولڈر نہیں سر آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔ فون پر مسلسل



ہولڈ ٹیون بجنا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھا، نمبر لینڈ لائن تھا۔  
 ”ہیلو رطابہ! میں رحیم چوہدری بات کر رہا ہوں۔“ دو منٹ بعد فون پر رحیم چوہدری کی آواز گونجی۔  
 ”السلام علیکم سر! کیسے ہیں آپ؟“  
 ”فائن مس رطابہ! میں دہائی سے کال کر رہا ہوں۔“  
 ”جی سر! مجھے علم ہو گیا تھا۔“ وہ بولی تھی۔

”ہوں، مجھے آپ کو انفارم کرنا تھا کہ میں دو تین دن تک آ جاؤں گا، مجھے ابھی خان ٹیکسٹائل کا فون آیا ہے، وہ اپنا پروجیکٹ ہمارے ساتھ کرنا چاہتے ہیں اس سلسلے میں آپ دیکھ لیجئے گا۔“ چوہدری رحیم نے فون کی بابت آگاہ کیا تھا۔

”جی سر! ان کی فائلز میرے پاس آچکی ہیں، میں دیکھ لوں گی۔“ اس نے سر ہلایا۔  
 ”ہوں گڈ۔“ چوہدری رحیم ریلیکس سا بولا تھا۔  
 ”کچھ اور سر۔“ اس نے پوچھا۔

”نہیں کچھ نہیں، اوکے بائے۔“ فون کٹ گیا تھا۔ پر رطابہ فون ابھی تک ہاتھوں میں لئے بیٹھی تھی۔  
 ”یہ پہلی دفعہ ہے سر نے مجھے اس جگہ کا نہیں بتایا، ورنہ ہر جگہ کا مجھے علم ہوتا ہے، کچھ تو ہے۔“ وہ سوچے جا رہی تھی۔ اچھے جا رہی تھی پھر یکدم اس کے ذہن میں جھماکا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

”گاڑی آگے نہیں جاسکتی، یہیں اترؤ۔“ ساتھ آئی عورت نے کرخت لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے گاڑی سے اتر گئی تھی۔ تنگ تنگ گلیاں، گندی غلاظت بھری تالیاں یہاں کے مکینوں کی حالت کا بخوبی بتا رہی تھیں، یہ کم درجے کے مزدوروں کے طبقے سے تعلق رکھنے والوں کا محلہ تھا، غربت مفلسی یہاں کے انگ انگ سے ٹپک رہی تھی۔ وہ خاموشی سے ان کے پیچھے چلتی جا رہی تھی۔ دس پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد وہ ایک بوسیدہ سے مکان کے سامنے رکتے تھے۔  
 ”اندر چلو۔“ وہی عورت دوبارہ بولی تھی۔ ان میں سے ایک مرد راستے میں ہی اتر گیا تھا وہ مرد اور عورت کے پیچھے اندر داخل ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”آفاق میرے بیٹے، کیوں مجھے جلا رہے ہو، یہ جلا پا 23 برس میں روز مجھے جلاتا ہے، اب تو معاف کر دو۔“  
 رحیم چوہدری آفاق چوہدری کا ہاتھ تھام کر بولا تھا۔  
 ”اس دکھ میں تمہاری ماں بھی مر گئی، میں اکیلا ہو گیا ہوں، میرا تنا بزنس میرے بعد کون سنبھالے گا۔“ 23 برس گزرنے کے بعد بھی رحیم چوہدری نہ بدلاتھا، وہ کہتے ہیں ناں رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔  
 ”ڈاکٹرز کہتے ہیں تم خود ہی ٹھیک نہیں ہونا چاہتے، تم اپنی ول پاور use ہی نہیں کرنا چاہتے، ایسے مت کرو آفاق، ایسا مت کرو، کچھ اس بوڑھے باپ کا ہی خیال کر لو۔“ آفاق ان سب باتوں پر بغیر کچھ رد عمل ظاہر کئے چپ لیٹا تھا۔

”کچھ تو بولو آفاق۔“ چوہدری رحیم نے اس کا ہاتھ سہلایا۔  
 ”مم، مہر، مم ماہ۔“ یہ الفاظ چوہدری رحیم کے تن بدن میں آگ لگائے تھے، انہیں لگ رہا تھا انہیں آج پھر



نئے سرے سے تپتے صحرا میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔

”تم اس بے غیرت، بیچ ذات لڑکی کو آج بھی نہیں بھولے۔“ چوہدری رحیم نے نرمی کا چولا اتار پھینکا تھا۔

آفاق یہ دیکھ کر عجیب سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے مسکرایا تھا۔

”تم آج بھی اس بیچ لڑکی کی محبت میں پور پور ڈوبے ہو، تم نہیں بدل سکتے آفاق، میں ویسے ہی ٹائم ویسٹ

کرنے نے یہاں آیا ہوں، کچھ حاصل نہیں ہوگا مجھے تم سے، جاؤ بھاڑ میں تم۔“ وہ چیختا چلاتا کف اڑانا چلا گیا تھا۔

آفاق کے ہونٹوں پر اب بھی زخمی مسکراہٹ ہنوز موجود تھی۔

☆.....☆.....☆

”ہیلو! ہاں اشرف مجھے آج شام پانچ بجے ملو۔“

”پر کہاں میڈم رطابہ؟“ اشرف نے پوچھا۔

”کسی پارک میں جو نزدیک ہو۔“

”اوکے میڈم میں آ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

”مجھے کسی طریقے سے اس دہی کاراز جاننا ہے، ہر مہینے میں ان کا دہی کا چکر ضروری لگتا ہے، کچھ تو ہے دہی

میں، شاید مجھے اس انفارمیشن سے کچھ معلوم ہو جائے۔“ وہ سوچتی ہوئی آفس سے باہر نکل آئی تھی۔ اسے جلد از

جلد پارک پہنچنا تھا۔

”ہیلو، ہاں میں پہنچ گئی ہوں۔“ اس نے اشرف کا نمبر دوبارہ ملایا تھا۔

”ٹھیک ہے میڈم! میں بھی دس منٹ میں پہنچتا ہوں۔“ اشرف تا بعداری سے بولا تھا۔

”اوکے۔“ اس نے فون آف کر کے ہینڈ بیگ میں ڈال دیا تھا۔ وہ آفس ٹائم میں باہر نکلی تھی۔ اس لئے وہ

نہیں چاہتی تھی کہ آفس کا کوئی بندہ کال کرے اور اسے یہاں کا معلوم ہو جائے۔ وہ ہر معاملے میں احتیاط برت

رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”ارے بہن، اس مرتبہ رطابہ بٹیا کو فون کئے کافی مہینے نہیں ہو گئے۔“ پڑوسن بوانے پاس بیٹھی اماں سے

پوچھا تھا۔

”بوا دو دن پہلے کیا تھا، ٹھیک ہے۔“ اماں نے سرسری سا بتایا۔

”ہونہہ... وپے ہے بڑی سمجھدار تمہاری بیٹی، کیسے لڑکی ہو کر بھی پورے گھر کی ذمہ داری سنبھال رہی ہے۔“

”جی بوا! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“

”ہونہہ، بس اب جلدی سے اس کے ہاتھ پیلے کر دو۔“

”جی بوا سوچوں گی۔“

”ارے بھئی، اس میں سوچنا کا ہے، شادی تو کرنی ہے ناں۔“ بوانے ہنستے ہوئے کہا۔

”رطابہ مانے گی تو ہی کر سکتی ہوں۔“

”تم ماں ہو اس کی، یہ تمہارا فرض ہے۔“

”جی بوا، اس دفعہ آئی تو میں بات کروں گی۔“



”ضرور کرنا، بیٹیاں جتنی جلدی اپنے گھروں کی ہو جائیں ماں باپ کے لئے اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔“ بوا کی اس بات پر نجانے کیوں اماں کے رُ کے آنسو بہہ نکلے تھے۔

☆.....☆.....☆

”اس کمرے میں سے وہ عورت، تمہیں بھی یہیں رہنا ہوگا، جب تک اس کا کچھ بندوبست نہیں ہو جاتا، اور ہاں کوئی ہوشیاری کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تم انجام جانتی ہو۔“ وہ عورت اسے خبردار کر رہی تھی اور وہ بے بسی سے ہر بات پر سر ہلا رہی تھی۔ اس کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔

”تم بھی ساتھ رہو گی ناں۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

”نہیں، چوہدری صاحب کا حکم ہے صرف تم یہاں رہو گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ بے بسی سے سر ہلا گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”میڈم! خیریت تو ہے، اتنی ایمر جنسی میں بلایا۔“ اشرف مطلوبہ جگہ پہنچتے ہی بولا تھا۔

”ہاں خیریت ہی ہے، تمہیں میرا ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے۔“ وہ مطلب کی بات پر آگئی۔

”جی حکم کیجئے۔“ اشرف نابعداری سے گویا ہوا۔

”تمہیں ایک شخص کا پتہ لگانا ہے جو دئی میں ہے، مجھے اس شخص کی پوری انفارمیشن چاہئے۔“ وہ بولی تھی۔

”وہ تو ٹھیک ہے رطابہ میڈم مگر۔“ اشرف نے یہ سن کر بات ادھوری چھوڑی۔

”اگر مگر چھوڑو، پیسہ جتنا تم کہو گے ملے گا، بس مجھے ہر حالت میں یہ انفارمیشن چاہئے۔“ اس کا لہجہ سختی بھرا تھا۔ اشرف نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے میڈم! آپ مجھے اس شخص کی پوری ڈیٹیل سینڈ کر دیں، میں آپ کی مطلوبہ انفارمیشن آپ تک پہنچا دوں گا۔“

”اوکے گڈ، بس مجھے اب انتظار رہے گا۔“ وہ مسکرائی تھی۔

☆.....☆.....☆

”برس ہا برس بیت گئے، اس انتظار کی سولی پر لٹکتے، پر میرا انتظار لا حاصل ہی رہا۔ اب تو بڑھاپا آ پہنچا آفاق چوہدری، اب تو اس رگ رگ میں بے انتظار کی لوبھی بجھتے دئے کی طرح ہوتی جا رہی ہے، پتہ نہیں کب یہ ٹھنڈا دیا بجھ جائے، مجھے اب اپنی پرواہ نہیں رہی، بس تمہاری بیٹی کی فکر ہے۔ ایک دفعہ تم مل جاؤ آفاق تو تمہاری بیٹی تمہیں سوئپ کر سکون سے مر سکوں، مجھے تو تم سے جدا ہونا پڑا، پر اب اپنی بیٹی سے تمہیں کبھی جدا نہیں ہونے دوں گی، تم دونوں کا ملن ضرور ہوگا آفاق چوہدری ضرور ہوگا۔“ اس سرزمین پر کوئی ایسا بھی تھا جسے آفاق چوہدری کے ملن کا آج بھی انتظار تھا، پروہ کون تھا؟

☆.....☆.....☆

”تم کون ہو اور مجھے یہاں کیوں قید کیا ہے، مجھے چھوڑ دو۔“ گوری کا مہرہ سے پہلا سا مناس جملے پر ہوا تھا۔

”مم... میں گوری ہوں، مجھے یہاں تمہاری دیکھ بھال کے لئے بھیجا گیا ہے۔“ گوری نے اس خوبصورت من موہنی سی لڑکی کو دیکھ کر کہا۔

”اوہ، تم بھی ان کے ساتھ ملی ہو۔“ اس نے جواباً نفرت بھری نگاہوں سے گوری کو دیکھا تھا۔



”نہیں مہر، مجھے تم سے کچھ لینا دینا نہیں، میں بھی مجبوری میں یہاں لائی گئی ہوں۔“

”کیا مجبوری ہے، رحیم چوہدری نے تمہارے ساتھ بھی کوئی کھیل کھیلا ہے کیا؟“ مہر نے زہر خند لہجے میں کہا۔

”میں خود اس کھیل میں پھنسی ہوں مہر۔“ وہ پھر ساری کہانی سناتی گئی اور مہر پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

”میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا مہر، چوہدری رحیم نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ میری شادی آفاق سے کر دیں گے۔“ یہ الفاظ مہر کی پوری ہستی کو ہلا گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

”شش شادی، آفاق سے۔“ چیخ نما آواز مہر کے منہ سے برآمد ہوئی تھی۔

”جی مہر، میں مجبور ہوں، یہی حل میری عزت پر لگا داغ دھوسکتا ہے، جن کی وجہ سے لگا ہے، میں ان سے شادی نہیں کرنا چاہتی پر اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔“ گوری کا لہجہ بے بسی لئے ہوئے تھا۔

”جو کچھ میں تمہیں بتانے جا رہی ہوں یہ سب جان کر بھی تم آفاق سے شادی کر لو گی۔“ مہر کے لبوں پر اذیت بھری مسکراہٹ ڈرائی تھی۔

”کیا مطلب، آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔“ گوری نے تاجی کے عالم میں اسے دیکھا۔

”تمہیں پتا ہے عورت کی سب سے بڑی بے وقوفی کیا ہوتی ہے، وہ مرد پر جلدی اعتبار کر لیتی ہے، اور پھر جب وہی اعتبار ٹوٹتا ہے ناں تو عورت کو بڑی شدت سے اپنی اوقات یاد آتی ہے کہ مرد کبھی بھی عورت کو اعتبار کے قابل نہیں سمجھتا۔“ وہ لحظہ بھر کوری تھی۔

”تم جانتی ہو، تم آج جس عورت کے سامنے بیٹھی ہو وہ کون ہے؟“ مہر نے سوالیہ لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

”نہیں۔“ گوری کا سر نفی میں ہلا، وہ مسکرائی تھی۔

”یہ عورت جو تمہارے سامنے بیٹھی ہے یہ میرا آفاق ہے۔“ یہ الفاظ اب کے گوری کی پوری ہستی کو ہلا گئے تھے، گوری جواباً پھٹی پھٹی نگاہوں سے مہر کو دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”ہیلو، جی چوہدری صاحب، آپ کا شک صحیح نکلا، وہ لڑکی گڑبڑ ہے۔“ اشرف نے اپنی مخصوص تابعداری اپناتے چوہدری رحیم کو آگاہ کیا تھا۔

”اوہ تو میرا اندازہ ٹھیک نکلا، اس لڑکی پر مجھے اسی دن شک ہو گیا تھا جس دن وہ اچانک بغیر کوئی اطلاع دیئے غائب ہوئی تھی، پر یہ لڑکی چاہتی کیا ہے؟“ چوہدری رحیم پرسوج انداز میں بڑبڑایا تھا۔

”چوہدری صاحب! اس نے مجھے دبئی کی معلومات کے لئے ہار کیا ہے، وہ آپ کا راز جاننا چاہتی ہے۔“ اشرف نے ایک اور معلومات دان کی۔

”کہیں یہ آفاق کی بیٹی تو نہیں، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، ان دونوں نے تو نہر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی، نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔“ چوہدری رحیم زندگی میں پہلی مرتبہ اتنے برے طریقے سے گھبرایا تھا۔

☆.....☆.....☆



”آپ آفاق چوہدری کی بیوی ہیں؟“ گوری نے سرسراتی آواز میں پوچھا تھا۔

”ہاں، میں ہوں مہر آفاق“۔ وہ نچی سے مسکرائی تھی۔

”لیکن آپ یہاں کیوں اور اس حالت میں؟“ گوری کو یہ جان کر سخت صدمہ پہنچا تھا۔

”گوری بیچ ذات کی عورت جب اونچی ذات کے مرد سے محبت کرتی ہے تو پھر اس کا نتیجہ ایسا ہی نکلتا ہے“۔

اس کے لہجے میں ٹوٹنے کا بچ کی کرچیوں کی چھین تھی۔ گوری نے دکھ سے اسے دیکھا تھا۔

”تو آپ کا مطلب آپ کی یہ حالت آفاق چوہدری نے کی؟“ گوری نے بات ادھوری چھوڑی۔

”نہیں آفاق نے نہیں کی، وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے گوری، پہلے جو کچھ ہوا وہ کرنے والا آفاق کوئی

اور تھا، میں تو ایک غلط فہمی کے نتیجے میں ان کی زندگی میں آئی تھی۔ تمہارے واقعہ نے انہیں بدل دیا۔ تم نے انہیں

بددعادی بھی کہ تمہاری بیٹی بھی میری جیسی ہو، اس کے بعد وہ بدل گئے، انہوں نے میرا خیال رکھنا شروع کر دیا اور

اولاد کی خوشخبری سن کر تو وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگے لیکن چوہدری رحیم کی بد نظر ہماری خوشیوں کو کھا

گئی۔ میں نے آفاق سے جنون کی حد تک عشق کیا ہے گوری جو مرنے کے بعد بھی کم نہ ہوگا“۔ یہ سب سن کر گوری

کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی جسے اس نے بمشکل اپنے اندر اتارا تھا۔ پر نہ مہر جانتی تھی اور نہ گوری کہ مہر کا جنون

عشق اس کی بیٹی کا جنون انتقام بن جائے گا۔

☆.....☆.....☆

”یہ رحیم چوہدری نے مجھے اتنی ایمر جنسی میں کیوں بلوایا ہے، وہ بھی اپنے گھر۔ اس کا لہجہ مجھے عجیب سا کیوں

لگ رہا ہے، کچھ تو ہے، کہیں اسے میرے کھیل کا پتہ تو نہیں چل گیا“۔ ابھی پندرہ منٹ پہلے اسے چوہدری رحیم کی

کال موصول ہوئی تھی۔ وہ سوچ سوچ کر بلکان ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے وہ Documents بھی اپنے ساتھ

رکھے، یہ بھی چوہدری رحیم نے ساتھ لانے کو کہے تھے۔

”ایسا کیا ہو سکتا ہے“۔ کوئی سیرا ہاتھ آ کے نہ دے رہا تھا، لایعنی سوچیں کسی وحشی ناگ کی طرح اسے بار بار

ڈستی جا رہی تھیں۔ رطابہ نہیں جانتی تھی اس دفعہ اس کی چال اس پر لٹی پڑ چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

میٹنگ کا دن دو دن بعد کا طے تھا، اس نے اپنا ضروری سامان پیک کر لیا تھا اور ہوشل کے چار جزو وغیرہ بھی

پے کر دیئے تھے۔ اس کا برسوں کا خواب بس پورا ہونے والا تھا۔ چوہدری رحیم کی بربادی بس نزدیک تھی اور یہ

سوچیں اسے کافی خوش و مطمئن کر رہی تھیں۔

”رطابہ! تم مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو؟“ علیشاء اس کے جانے کا سن کر افسردہ تھی۔

”ارے بھئی، میرا گاؤں تمہارے لئے ہمیشہ حاضر ہے، تم وہاں آتی جانی رہو گی اور ہمارا رابطہ بھی رہے گا،

میں بھی تم سے ملنے آتی رہوں گی“۔ رطابہ نے اسے دلاسا دیا تھا۔ حقیقتاً وہ خود بھی افسردہ تھی۔

”رطابہ! میری بہت اچھی دوست“۔ یہ کہتے ہی علیشاء اس کے گلے لگ گئی تھی، آنسو دونوں کے گالوں کو بھگو

رہے تھے۔

”علیشاء تم مجھے بھی پریشان کر رہی ہو، ایسے میں کیسے جاسکوں گی“۔

”آنسوؤں پر اپنا اختیار کب ہوتا ہے، یہ تو کبھی بھی چھلک آتے ہیں“۔ علیشاء دکھ سے بولی تھی۔

”اوہ... مس علیشاء تو فلسفہ بھی بولنے لگی ہیں“۔ رطابہ نے مذاق میں کہہ کر دکھی لہجے کو زائل کیا۔



”جی آپ کے ساتھ رہنے کا نتیجہ ہے۔“ علیشاء نے ہولے سے شرارت کی، رطابہ تہقہہ لگا کر رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”ہاں سنو، بچے کے ساتھ ہی اس لڑکی کو مار دینا، کیا نام ہے اس کا، ہاں گوری، وہ ہمارے لئے مصیبت بن سکتی ہے اس لئے اس کا مرنا بہت ضروری ہے، میں کچھ دنوں کے لئے آفاق کو لے کر دیہی جا رہا ہوں، اس لئے مجھ سے کوئی رابطہ مت کرنا، تمہارے پیسے تمہیں مل جائیں گے۔“ یہ کہہ کر چوہدری رحیم نے فون کاٹ دیا تھا۔

”غریب لڑکیاں کتنی جلدی شادی جیسے جال میں پھنس جاتی ہیں، آلی بڑی میرے بیٹے سے شادی کرنے والی، پہلی والی غلطی میں دوبارہ دہراؤں گا کیا، اتنا پاگل سمجھ رہا ہے مجھے۔“ وہ تہقہہ لگا کر ہنسا تھا اور اس لمحے وہ بہت ہیبت ناک لگ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

مہر اور آفاق کے گھر ایک بہت ہی خوبصورت سی بچی نے جنم لیا تھا جس کا نام گوری نے رطابہ رکھا تھا۔ اس لمحے مہر کو بڑی شدت سے آفاق کی کمی محسوس ہوئی تھی۔

”کہاں ہو آفاق، دیکھو تمہاری بیٹی تمہیں ڈھونڈ رہی ہے، تمہارے لمس کے لئے بے تاب ہو رہی ہے، اب تو آ جاؤ میرے لئے نہ سہی اپنی بیٹی کی خاطر ہی آ جاؤ۔“ دل سے فریادیں نکل رہی تھیں پر شنوائی نہ تھی۔ دل کی فریادیں دل میں ہی دب کر رہ گئی تھیں۔

”مہر! رطابہ نے نین نقش آپ کے اور رنگت باپ کی چرائی ہے۔“ گزرتے دنوں میں مہر اور گوری ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئی تھیں۔ دوستی کا رشتہ پروان چڑھتے چڑھتے بہنا پے میں تبدیل ہو گیا تھا۔

”گوری تم میری رطابہ کا بہت خیال رکھنا، دیکھو اس دنیا میں میرے علاوہ اس کا کوئی نہیں، صرف ایک تم ہی ہو جس پر میں بھروسہ کر سکتی ہوں۔“ وہ اس سے وعدہ لے رہی تھی یاد دے رہی تھی، گوری سمجھ نہ سکی تھی۔

”مہر یہ آپ کیسی خوفزدہ کر دینے والی باتیں کر رہی ہیں، خدا نخواستہ آپ کو کچھ ہو تو نہیں گیا جو آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔“ گوری نے دہل کر کہا تھا۔

”گوری اگلے وقت کل کسے پتا ہوتا ہے، بس اپنی تسلی کر لینا چاہتی ہوں، اللہ میری رطابہ کا نصیب اچھا کرے، اس کے نصیب میں کبھی رحیم چوہدری جیسا شخص نہ آئے، چوہدریوں کا خون ہے، بس اگر ہو سکے تو اسے اپنے باپ سے ملو ادینا اور ایک اور بات تم آفاق سے شادی کر لینا گوری۔“ آخری لفظ گوری پر بجلی کی طرح گرے تھے۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مہر، پہلے تو میں لاعلم تھی، اب سب کچھ جان کر تو میں کبھی نہیں کر سکتی، آپ ایسی باتیں نہ کریں۔“ وہ ہچکچلا کر بولی تھی، مہر نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

”چوہدری صاحب بیٹی ہوئی ہے اس عورت کے گھر۔“ یہ اطلاع اسی کرخت لہجے والی عورت نے دی تھی۔

”اوہ۔“ رحیم چوہدری نے ہونٹ سیٹھڑے۔

”ٹھیک ہے، آج رات میں اگلا کام ہو جانا چاہئے۔“ چوہدری رحیم نے حکم دیا۔

”جی جیسا آپ نے کہا ہے ویسا ہی ہوگا۔“ وہ عورت بولی تھی لیکن دوسری طرف دروازے کے پیچھے چھپ کر کھڑی گوری کے پاؤں سے زمین سر کی تھی۔



”مجھے بھی مارنا چاہتے ہیں۔“ اس کی زبان لڑکھرائی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی مہر کے کمرے میں آئی تھی۔  
 ”مہر! ہمیں یہاں سے جلدی نکلنا ہوگا، وہ ہم تینوں کو مار دیں گے۔“ اس نے مہر کو جھنجھوڑا تھا۔ لیکن مہر کے  
 ساکت وجود میں کوئی حرکت نہ ہوئی تھی۔ اس نے دوبارہ ہاتھ چھوا، مہر کا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا، مہر مر چکی تھی، جنون  
 عشق کی اس کہانی کا ایک باب مکمل ہو چکا تھا۔  
 ”مہر، انھیں مہر۔“ اس نے پوری طاقت سے مہر کو جھنجھوڑا تھا، پر مہر خاموش لب لئے پڑی تھی۔  
 ”مہر...“ وہ دھاڑیں مار مار کر رونی لگی۔

☆.....☆.....☆

وہ ہوشل سے باہر آئی تو اس نے اماں کو فون ملایا تھا۔  
 ”السلام علیکم اماں!“  
 ”وعلیکم السلام! کیسی ہو رطابہ؟“ فون کی دوسری جانب اماں گوری تھی۔  
 ”ٹھیک ہوں اماں! ابھی رحیم چوہدری کے گھر جا رہی ہوں، اس نے بلایا ہے۔“ اس نے بتایا۔  
 ”اوہ اچھا دھیان سے جانا، وہ بڑا شاطر آدمی ہے۔“ گوری نے اسے آگاہ کیا تھا۔  
 ”جی اماں! جانتی ہوں، بس ایک بات کھٹک رہی ہے، میٹنگ پرسوں ہے لیکن بلا آج رہا ہے، کچھ سمجھ نہیں آ  
 رہی۔“

”چلو وہاں جا کر ہی معلوم ہوگا، بڑھا کیا گل کھلا رہا ہے۔“ گوری کا لہجہ تلخ تھا، وہ مسکرائی تھی۔  
 ”بڑھا تو نہ کہیں، جوان لگتا ہے ابھی تک تو۔“ رطابہ ہنستے ہوئے بولی۔  
 ”سیاہ کر تو توں کے مالک خود کو جوان ہی سمجھتے ہیں۔“ گوری بھڑکی۔  
 ”اچھا اماں! اب واپس آ کر آپ کو کال کروں گی۔“  
 ”ٹھیک ہے ہر کام سوچ سمجھ کر دھیان سے کرنا۔“ اماں نے دوبارہ یاد دہانی کروائی تھی۔  
 ”جو حکم پاس۔“ وہ بولی۔  
 ”جیتی رہو۔“

”اماں ایک منٹ، آپ کو ایک اور اہم خبر بھی دینی ہے۔“  
 ”وہ کیا۔“

”ابوزندہ ہیں اور دبئی میں مقیم ہیں۔“  
 ”اوہ، یہ تو خوشی کی خبر ہے۔“ گوری خوشی سے بولی۔  
 ”جی، اب آپ تیاری کیجئے۔“ اس کی شرارت کی رگ پھڑک اٹھی تھی۔  
 ”کیا مطلب؟“

”ارے دلہن بننے کی۔“ اس نے ہنستے ہوئے شگوفہ چھوڑا۔  
 ”ٹھہر بد تمیز لڑکی۔“ اماں نے ڈانٹ پلائی، اس نے فوراً فون کاٹ دیا۔

☆.....☆.....☆

”میرے اللہ میری مدد کر، کوئی راستہ بتا یہاں سے نکلنے کا، تو ہی میری مدد کر سکتا ہے۔“ گوری بنے پریشانی  
 سے دعا مانگتی تھی۔ یہ ڈھلتی شام کا وقت تھا۔ اسے رات سے پہلے پہلے یہاں سے نکلنا تھا ورنہ وہ اور بھی رطابہ



زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتیں۔ اس نے مہر سے وعدہ کیا تھا وہ رطابہ کو کچھ نہ ہونے دے گی اور اس نے یہ وعدہ پورا کرنا تھا۔ مہر کی موت کی خبر ابھی تک کسی کو نہ ہوئی تھی۔ اس نے بے بسی سے مہر کو دیکھا، آنسو چھم چھم اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ وہ اتنی بے بس و مجبور تھی۔ اس نے ننھی رطابہ کے منہ میں فیڈر دیا اور خود اس کمرے کے چاروں طرف نگاہیں گھمانے لگی، یہ کمرہ پوری طرح بند تھا، اچانک اس کی نظر چھت کے بالکل ساتھ لگے روشن دان پر پڑی تھی۔

☆.....☆.....☆

”ہیلو السلام علیکم سر!“ رخشی نے فون اٹھاتے ہی کہا تھا۔ یہ آفاق چوہدری کی نئی ملازمہ تھی جو کچھ دن پہلے ہی رکھی کی گئی تھی۔

”ذرا آفاق کے قریب فون لے جاؤ۔“ اس حکم پر وہ فون آفاق کے پاس لے گئی، آفاق حسب معمول چت لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔

”سر! آپ کا فون ہے۔“ رخشی نے فون اس کے کان کے ساتھ لگایا۔

”ہیلو ڈیر آفاق! کیسے ہو، تمہیں ایک خبر دینی تھی اور وہ خبر یہ ہے کہ تمہاری بیٹی زندہ ہے۔“ آفاق چوہدری یہ سن کر تڑپا تھا۔

”مہر ماہ۔“ وہ بڑبڑایا۔

”ہا ہا ہا، آگے تو سنو ڈیر سن، تمہاری بیٹی کو میں مارنے والا ہوں، پر ایک احسان تم پر کر رہا ہوں، تم پہلی اور آخری دفعہ اپنی بیٹی سے مل سکتے ہو، کل تم پاکستان آؤ گے اور پرسوں اپنی بیٹی کی لاش کے پاس بیٹھ کر روؤ گے۔“ چوہدری رحیم زور زور سے قہقہے لگاتا ہنس رہا تھا اور یہ قہقہے آفاق چوہدری کی جان نکال رہے تھے۔

”نن نہیں نن۔“ آنسو بے اختیار چھلکتے جا رہے تھے اور ان آنسوؤں کا سد باب کوئی نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ ہوشل کے گیٹ سے باہر نکل آئی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر ایک الوداعی نظر اس ہاسٹل کے دروازے پر ڈالی، آنسو کا ایک ننھا سا قطرہ اس کی آنکھ سے ٹپکا تھا۔ جس جگہ ہم رہتے ہوں وہاں کی بے جان چیزیں بھی ہم سے مانوس ہو جاتی ہیں۔ جو جگہ چھوڑتے وقت ہمیں بڑی شدت سے یاد آتی ہیں۔ اس نے آنسو کا ننھا قطرہ اپنی پور سے صاف کیا اور ہوشل کی دائیں جانب چلنے لگی۔ پتہ نہیں آج اس کا دل کیوں خالی خالی لگنے لگا تھا۔ جیسے اس میں کوئی امنگ ہی نہ رہی ہو، بچپن سے لے کر جوانی تک کا وقت اس نے یہ خواب سوچتے ہوئے گزارا تھا اور آج جب وہ خواب پورا ہونے کا وقت آیا تو اسے اپنا آپ خالی لگنے لگا۔

”کیا میں نے ایک نارمل زندگی گزاری ہے؟“ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ پر جواب کی سنوائی نہ ہو سکی تھی۔ کبھی کبھی کچھ سوال اتنے مشکل ہو جاتے ہیں کہ ان کے جواب ہمیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے یا ہم ڈھونڈنا ہی نہیں چاہتے۔ یا اگر ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو اس ڈر سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں کہ شاید یہ جواب ہمیں دکھ کے علاوہ اور کچھ نہ دے۔

زندگی بے مقصد نہیں گزاری جاسکتی، گزارنے کے لئے کسی مقصد کی ضرورت ہوتی ہے اور رطابہ نے جو مقصد چنا تھا اب اس میں اسے کامیابی ہونے والی تھی یا ناکامی یہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی اور کچھ باتوں کا نہ جاننا ہی اچھا ہوتا ہے۔ وہ دل میں اپنی زندگی کے تانے بانے بنتی ہوئی چلتی جا رہی تھی اور اس کا یہ چلنا چوہدری رحیم کی



بھیجی پراڈو کی بدولت اچانک رکا تھا، اس نے سنبھل کر ایک نظر ڈرائیور پر ڈالی اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

☆.....☆.....☆

یہ اس کمرے کا واحد روشن دان تھا جو بغیر آہنی سلاخوں اور جالی کے تھا۔ گوری کے اندر یکدم پھرتی ابھری تھی۔ اسے جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا۔ روشن دان کافی اونچا تھا۔ وہ بغیر کسی سہارے کے اوپر نہیں چڑھ سکتی تھی۔ اس نے کمرے کے چاروں طرف نگاہیں گھمائیں، وہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھی جس کی مدد سے وہ روشن دان تک پہنچ سکے اور آخر کار اسے وہ گویہ مقصود مل ہی گیا، کمرے کے ایک کونے میں اسے لکڑی کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھی دکھائی دی تھی۔ وہ تیزی سے سیڑھی کی جانب لپکی اور اسے وہاں سے اٹھا کر روشن دان کے بالکل نیچے والی جگہ پر رکھا۔ اس پوری سیڑھی میں صرف چھ اسٹیپ تھے جس کی مدد سے وہ اوپر چڑھ سکتی تھی۔

اب اگلا مرحلہ رطابہ کو اٹھانے کا تھا۔ اس نے رطابہ کو اپنے سینے سے لگایا اور ایک بڑے دوپٹے کی مدد سے اسے اپنے ساتھ باندھ لیا۔ وہ پوری طرح تیار تھی۔ اس نے اک الوداعی نظر نرم آنکھوں سے مہر پر ڈالی اور سیڑھی کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے پہلے اسٹیپ پر قدم رکھا ہی تھا کہ سیڑھی پوری طرح لڑکھرائی، وہ خوف سے نیچے اتر آئی۔ ”کیا کروں، میں یہاں رہی تب بھی موت اور اس سیڑھی سے گری تب بھی موت، کیوں نہ اس سیڑھی کو ہی آزمایا جائے۔“ یہ سوچ کر اس نے ہمت سے دوبارہ قدم بڑھایا اور دھڑکتے دل کے ساتھ وہ چوتھے اسٹیپ پر پہنچی ہی تھی۔ اس چوتھے اسٹیپ اور پانچویں اسٹیپ کے درمیان کافی بڑا خلا تھا۔ رطابہ کو اس نے مضبوطی سے پکڑا جو اس سارے کھیل کو اپنی بڑی بڑی نگاہوں سے خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ اللہ کا نام لے کر وہ پانچویں اسٹیپ پر پہنچ ہی گئی۔ اس کی رگی سانس بحال ہوئی تھی پر دروازے کے پیچھے ہونے والے شور نے اس کا دل مسمیٰ میں دبوچ لیا تھا۔ اسے یوں لگا وہ کھڑے قدموں کے ساتھ پوری کی پوری نیچے گرنے والی ہے۔

☆.....☆.....☆

دی انٹرنیشنل ایئر پورٹ کی گہما گہمی اپنے عروج پر تھی۔ لوگ اپنی اپنی فلائٹس کے انتظار میں انتظار گاہوں میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ایسے میں رختی آفاق چوہدری کی ویل چیئر ہسٹری ایئر پورٹ کے داخلی دروازے سے داخل ہوئی۔ آفاق چوہدری سر جھکائے اس کے ساتھ گھسٹا جا رہا تھا۔ سر جھکائے پتہ نہیں وہ کس سوچ میں گم تھا۔ آنسو تو بہہ بہہ کر پتہ نہیں کب کے سوکھ چکے تھے۔ اب رونا چاہتا بھی تو رو نہیں سکتا تھا جیسے سب اختیارات کی طرح یہ اختیار بھی اس سے چھین گیا تھا۔ وہ بے بسی کی آخری انتہا پر کھڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

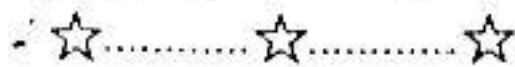
چوہدری رحیم کے کارندے زور زور سے دروازہ پیٹ رہے تھے اور وہ آخری سیڑھی پر کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ اس کی ہمت ٹوٹی جا رہی تھی، پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

”دروازہ کھولو ورنہ ہم دروازہ توڑ دیں گے۔“ کرخت خوفناک آوازیں اس کے کانوں کے پردے چیر رہی تھیں۔

”مم، مم مجھے ہمت کرنی ہوگی۔“ وہ بڑبڑاتی تھی اور کوشش کرتی روشن دان کے منہ کے قریب پہنچ گئی تھی۔ دروازہ ابھی تک بے دردی سے پٹا جا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے رطابہ کو اپنے سینے سے الگ کیا اور روشن دان کے باہر نئی سلیب پر لٹا دیا، وہ خود بھی دھان پان سی تھی۔ اس لئے اسے باہر نکلنے میں کوئی مشکل نہ ہوئی تھی۔ ابھی



اس کا دایاں پیر کمرے کے اندر ہی تھا کہ دروازہ چٹکھاڑتی آواز کے ساتھ زمین بوس ہوا تھا۔  
 ”پکڑو جلدی وہ بھاگ رہی ہے۔“ اس نے جلدی سے پاؤں باہر نکالا اور رطابہ کو لیتی نیچے کود گئی۔ وہ  
 انجانے راستوں پر بھاگتی جا رہی تھی کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ چوہدری رحیم کے بندے اس کا اتنی آسانی سے پیچھا  
 چھوڑنے والے نہیں۔ بھاگتی بھاگتی نجانے وہ کہاں نکل آئی تھی۔ رات کے اس پہر اسے جنگلی جانوروں کی  
 آوازیں اور بہتے تیزیانی کے شور کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یعنی وہ کسی ایسی جگہ تھی جہاں آبادی کے آثار تھے۔  
 اس نے ارد گرد نظریں گھمائیں، دور سے اسے ننھی سی روشنی کی رمت دکھائی دی۔ وہ تیزی سے اس جانب چلنا  
 شروع ہو گئی۔ اسے جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئی ہوگی کہ آگے سے آتے وہی کارندے  
 اسے دکھائی دیے۔ خوف سے اسے اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے آؤدیکھانہ تاؤ اور اٹھے قدموں بھاگنا  
 شروع کر دیا۔ پیچھے وہی کارندے اس کے تعاقب میں تیز تیز بھاگتے آرہے تھے۔ وہ بھاگتی نہر کی طرف  
 نکل آئی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور آنکھیں بند کرتے ہی گہری نہر میں کود گئی۔



”ولیکم مائی ڈیر سن! آج تم کتنے سالوں بعد اس گھر میں آئے ہو، تمہارا تو شاندار استقبال ہونا چاہئے۔“  
 رحیم چوہدری اس کے سامنے بیٹھا چپک رہا تھا۔ آفاق نے نفرت بھری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔  
 ”غصہ نہیں مائی ڈیر! ابھی تو تمہیں میں بڑی خوشخبری سے ہمکنار کرنے والا ہوں، تمہاری بیٹی بس آتی ہی ہو  
 گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے اسے تڑپا رہا تھا۔

”سر! میڈم رطابہ آچکی ہیں۔“ اس خبر پر آفاق نے سر اٹھا کر چوہدری رحیم کو دیکھا۔  
 ”نورا اندر بلاؤ، کہیں دیر نہ ہو جائے۔“ وہ مکروہ ہنسی ہنسا تھا۔ گارڈ واپس مڑ گیا تھا۔  
 ”تم سوچ رہے ہو گے میں تمہاری وجہ سے اسے معاف کر دوں گا، تو یہ تمہاری بھول ہے۔“ رحیم چوہدری  
 پھنکارتے ہوئے گر جاتا تھا۔

”صحیح کہا تم نے۔“ رطابہ ہنستی ہوئی اندر داخل ہوئی۔  
 ”سیاہ کر تو اتنی جلدی نہیں مٹتے۔“ وہ مسکراتی ہوئی اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی، ابھی وہ باپ کو دیکھ کر  
 کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے اک نگاہ غلط بھی آفاق کی طرف نہ ڈالی تھی۔  
 ”اوہ تو رطابہ آفاق آچکی ہیں۔“ چوہدری تہقہہ لگا کر بولا تھا۔

”رطابہ آفاق تو کب کی تمہیں برباد کرنے آچکی تھی، تم ہی نادان نکلے۔“ وہ طنزیہ پھنکاری تھی۔  
 ”اوہ گڈ، پر آج ہی رطابہ یہاں سے لاش کی صورت جائے گی۔“ یہ کہتے ہی چوہدری رحیم نے جیب سے  
 گن نکالی اور اس پر تانتے ہوئے بولا۔

”مجھے موت سے مت ڈراؤ چوہدری رحیم، موت دینے والے تم نہیں ہو۔“ اس کے لہجے میں اطمینان ہی  
 اطمینان تھا۔

”مرنے سے پہلے اپنے اس ناکارہ باپ سے مل لو، برسوں کی محبت کا ملن کر رہا ہوں باپ بیٹی کا۔“ چوہدری  
 رحیم کا لہجہ تنک آمیز تھا۔ رطابہ بڑی بے بسی سے باپ کی جانب پلٹی تھی۔ برسوں سے ملنے کا خواب پورا بھی ہوا تھا  
 تو کس سبب پر۔

”ابو میرے ابو، آپ کہاں تھے۔“ وہ بلبلاتی آفاق کے کشادہ سینے سے ٹکرا گئی تھی۔ آفاق نے لرزتا ہاتھ اس



کے سر پر رکھا تھا۔

”تم، مجھے، معاف، کر، کر دینا رطابہ بیٹی۔“ انتہائی دقت سے جملہ بولا تھا۔

”مجھے کوئی گلہ نہیں ابو! بس ایک خواہش ہے، اگر آپ مانیں تو آپ میری گوری ماں سے شادی کر لیجئے گا، وہ بہت اکیلی ہیں آپ کے بغیر، وہ آج بھی آپ کے انتظار کا دیپ جلائے بیٹھی ہیں، ان کا دیپ روشن کر دیجئے گا اور اپنی اس بدنصیب بیٹی کو معاف کر دیجئے گا جو آپ کے کسی کام نہ آسکی۔“ وہ خشکی ہوئی پیچھے ہٹی اور چوہدری رحیم کو گھورنے لگی۔

”تمہیں آج حساب دینا پڑے گا رحیم چوہدری، میرا، میری ماں کا، میرے باپ کا اور گوری کا تمہیں حساب دینا ہوگا۔“ یہ کہہ کر اس نے وہ پیپرزنکا لے اور ایک ایک کر کے اس کی جانب اچھال دیئے۔ چوہدری رحیم اب کے پیچھے پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”تم ایک بات بھول گئے چوہدری رحیم، میں بھی تمہاری پوتی تھی، بھلا کیسے تمہیں نہ ہرانی۔“ وہ ہنسی تھی، وہی زہر لی مسکراہٹ...

”دیکھو، ان پیپرزنکو تم اپنی ساری پراپرٹی، بزنس سب کچھ یتیم خانے کے نام کر چکے ہو۔“ رحیم چوہدری بری طرح لڑکھڑایا تھا۔

”تت، تم۔“ وہ پاگل سا اس کی جانب لپکا۔

”ابھی ٹھہرو، تم اپنا دینی والا بزنس دیوالیہ کر چکے ہو۔“ ایک اور دھچکا لگا تھا، وہ پورے قد سے زمین پر گر ا تھا۔

”میں تمہیں ایسا ہی دیکھنا چاہتی تھی، جھکا ہوا، بے بس، کمزور۔“ اس نے نفرت سے اس پر تھوکا اور ویل چیئر

کی جانب بڑھی، وہ یہاں سے جارہی تھی اپنے باپ کے ساتھ جہاں ان تینوں نے مل کر رہنا تھا۔

”ٹھاہ۔“ اچانک فائر کی آواز آئی، آفاق نے رطابہ کی طرف دیکھا اور ساکت رہ گیا، رطابہ خون میں لت

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

پت پڑی کراہ رہی تھی۔

”بیٹی۔“ آفاق اس کے قریب گر گیا تھا۔

”یہی لفظ سننا چاہتی تھی ابو، اب میں پرسکون ہو گئی ہوں۔“ رطابہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند چکی تھی۔

جنون عشق کا دوسرا اور آخری باب بھی پھٹ چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

عورت آج بھی مقام کی تلاش میں ہے، انصاف کی تلاش میں ہے، پر نہ تو مقام مل سکا اور نہ رطابہ کو انصاف، زبردستی مقام حاصل کرنے کی جدوجہد میں رطابہ خود بکھر گئی۔ یہ کہانی رطابہ کی نہیں، نہ مہر کی، یہ کہانی عورت کی تھی۔ اس کے جنون کی تھی اور اس جنون نے اس عورت کی جان لے لی تھی۔ عورت آج بھی انصاف کا، مقام کا کشلول اٹھائے کھڑی ہے کہ شاید یہ کشلول بھر جائے، اس مرد کے معاشرے میں عورت کا مقام بلند ہو جائے۔

☆.....☆.....☆

چوہدری رحیم کو عدالت نے پھانسی کا حکم سنایا تھا۔ آفاق گوری کے پاس لوٹ گیا تھا۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا پر پھر بھی اک کبی، اک کسک باقی رہ گئی تھی۔ رطابہ جیسی آج بھی گنتی لڑکیاں اس معاشرے میں موجود ہیں، جو اپنے جائز حق، مقام کی تلاش میں ہیں۔ شاید ان کو رطابہ نہ بننا پڑے۔ ان کو اپنا مقام مل جائے۔

☆.....☆.....☆



عائشہ مری

ناولٹ

# سپیکر

کل پھول بھی نکھرے نکھرے تھے  
کل ان میں آپ کا عکس بھی تھا

کل ہلکی ہلکی بارش تھی  
کل سرد ہوا کا رقص بھی تھا.....





کل باہل پر سے گالے تھے  
 کل سپاند پہ انہوں پہرے تھے  
 پتھر سے آپ کی یادوں کے بڑی دیر سے دل  
 میں ٹھہرے تھے  
 کل یادیں اب بھی ابھی تھیں  
 اور کل تک یہ نہ بھی تھیں  
 کل تم بہت یاد آئے تھے  
 کل یاد بہت تم آئے تھے  
 ڈائری کے اوراق بدلتے نظم کی چند سطروں پر  
 اس کی نگاہیں ٹھہر سی گئیں۔ مایا کی بینڈ رائٹنگ میں

کبھی یہ نظم، اس کی آنکھوں کے پردے پر اس کا عکس  
 جھلکانے لگا۔ اسے سوچنا آج بھی اس کے لیے کتنا  
 تکلیف دہ تھا، ہر بار کی طرح اس بار بھی اسے یاد کرنا  
 اسے نئے سرے سے مضطرب کر گیا۔ کمرے میں  
 اسے ٹھن سی ہونے لگی۔ ڈائری ٹیبل پر الٹ کر وہ  
 اوپن ٹیرس پر نکل آیا۔ اس ٹھن سے بچنے کا فی  
 الوقت یہ ہی طریقہ اسے مناسب لگا لیکن باہر آ کر  
 بھی اس کا اضطراب کم نہ ہوا۔ اس کے اندر جیسے  
 ویرانیوں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا کوئی ہلچل اسے اب  
 بھٹی نہ لگتی کوئی خوش کن بات اب اس کے لبوں پر





بے چین اور دماغ منتشر تھا۔ بیڈ پر بے سدھ ہوتے  
اس کے لبوں پر فقط ایک ہی نام تھا، ”مایا“۔

☆.....☆

مایا ملک سے دس سال بعد اس کی ملاقات بس  
ایک اتفاق تھا۔ جس نے اس کی لائف کے معنی ہی  
بدل دیئے۔ اب تک وہ جس حال میں جی رہا تھا  
سراسر خود کو بیوقوف بنانے کے مترادف تھا۔ دراصل  
جینا اور خوش رہنا تو اس نے اب جانا تھا یا پھر وہ تھی  
ہی ایسی شخصیت کی مالک۔ اسے اپنا ماضی صرف ایک  
برا خواب لگنے لگا۔ مایا کے سنگ وہ مسکرا نے لگا تھا۔  
بدلنے لگا تھا مگر یہ وقت اتنا مختصر ہوگا اس بات کا قطعی  
اندازہ نہ تھا۔ جلا کر راکھ کر دینے والا۔ بھلا ان کا  
ملاپ کیوں کر ممکن تھا۔ اس جلتے شعلے نے اس  
پروانے کو جلا کر راکھ کر دیا بھسم کر دیا اس کے خواب  
چھین لیے اور وہ اڑنے کی جاہ لیے تڑپ تڑپ کر مر  
گئی تھی مایا اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔

☆.....☆

پچھلے کچھ دنوں سے وہ ایک کیس کے سلسلے میں  
کافی بڑی تھا۔ آج چونکہ کیس کی سماعت تھی وہ کورٹ  
سے واپسی پر سیدھا گھر لوٹا تھا۔ تھکا دینے والے  
شیڈول اس کے اعصاب پر بھی اثر کرنے لگے۔  
صغریٰ سے کافی کا کہہ کر وہ روم کی جانب بڑھنے لگا  
مگر راستے میں اس کے قدم تھم گئے اسٹڈی کے ان  
لاک ڈور سے اندر کا منظر واضح تھا۔ سات سالہ بچی  
بک شیلف کے پاس اسٹول رکھ کر اس پر چڑھے  
شیلف میں نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ ارد گرد  
سے بے نیاز، معصومیت بھرا انداز اسے رکنے پر مجبور  
کر گیا۔ ننھے ہاتھوں سے بھاری کتابوں کو باری  
باری کھولتے نہ جانے اسے کس چیز کی تلاش تھی۔ چند  
بل رک کر اسے دیکھتے ناچار اسے گلا کھنکار کر اسے  
متوجہ کرنا پڑا مگر اسے اندازہ نہ تھا مخاطب اس افتاد  
کے لیے تیار نہ تھا جیسی اس کی آواز پر وہ توازن برقرار

مسکراہٹ نہ بکھیرتی۔ ہر وقت جیسے اس پر پر مژدگی  
کی کیفیت طاری رہتی۔ یہ سب اس کا اپنا تو کیا دھرا  
تھا۔ تو اب پشیمانی کیسی؟ کیسا دکھ؟ اسے خود سے اب  
قطعی ہمدردی نہ تھی۔ زندگی جیسے اس سے روٹھ چکی  
تھی۔ فقط سانس کی ڈور بندھی تھی۔ بے بسی ایسی ہی  
ہوتی ہے شاید۔ وہ خود کو چاہ کر بھی اس کیفیت سے  
نکال نہ پا رہا تھا۔ وہ ابھی پلٹنے ہی لگا تھا کہ مومی دروازہ  
ٹاک کر کے اندر چلی آئیں۔

”ہاشم! جاگ رہے ہو؟ آفس جانا ہے تمہیں  
کیوں اپنی نیند کے دشمن بنے پھر رہے ہو۔“ اس کی  
سوچی آنکھیں دیکھ کر فکر مندی سے بولیں۔

”کہاں مام! اب تو نیند بھی ہم سے روٹھ چکی  
ہے۔“ وہ یاسیت سے کہنے لگا۔

”چلو اپنی دوا لے کر تم آرام کرو۔ کام کا پریش  
زیادہ ہو تو پرسکون نیند بھلا کہاں آتی ہے۔“ وہ کہہ کر  
پلٹنے لگیں کہ کچھ یاد آنے پر رک کر کہنے لگیں۔

”اور ہاں کل مایا کی پہلی برسی ہے اچھا ہوتا اگر تم  
بھی چلتے آیا کوڈھارس ملتی۔“ ماما کی بات پر جیسے  
اسے سانس رک رک کر آنے لگی، ہر پل اس کے ذکر  
پر اس کی کیفیت کم و بیش ایسی ہو جاتی۔ احساس جرم  
تھا یا وہ بھولی بسری محبت جو اس کے دل کے نہاں  
خانوں میں اب بھی آباد تھی۔ چند پل لگے اسے خود کو  
تارل کرنے میں۔

”نہیں مام! میرا وہاں کیا کام۔ جو لوگ بچھڑ  
جاتے ہیں ان کے لیے آنسو نہیں بہاتے صرف  
دعاؤں کی جاتی ہیں۔ میں اس کے لیے ضرور دعا  
کروں گا اور ویسے بھی کل میری ایک کلائنٹ سے  
ضروری میٹنگ ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ صفائی  
دینے لگا۔

”اوکے فائن، اب تم آرام کرو۔“ بدقت مسکرا کر  
کہتے وہ باہر نکل گئیں۔ جب کہ وہ بے جان ہوتے  
قدموں کے ساتھ بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ دل اب بھی



نہ رکھ پائی اور دھڑام سے اسٹول سے نیچے گر گئی۔  
بھاری کتابیں ہاتھ لگنے سے اس پر باری باری  
آگریں۔

”اوہ گاڈ!“ سامنے کا منظر اس کی توقع کے  
برعکس تھا۔ وہ اپنی مسکراہٹ چھپائے اس کی سمت  
بڑھا۔

”نگی تو نہیں۔“ اسے بازو کے سہارے اٹھاتے  
وہ پوچھنے لگا۔ جب کہ اس کی بات پر اس کے آنسو  
گال پر لڑھک گئے۔

”افوہ اب رونا نہیں۔“ کہنے کے ساتھ اس کی  
نظریں اس کی چھلی کہنی پر جا پڑیں جس پر کھرچ اور  
خون کے نشان واضح تھے۔ غصے کی جگہ ایک دم  
شرمندگی نے لے لی۔

”دیکھو مایا! اب رونا نہیں میں بینڈج کر دوں گا  
پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اسے اٹھا کر باہر  
صوفے پر لے آیا۔

”صغریٰ بوا جلدی سے فرسٹ ایڈ باکس لے  
آئیں۔“ بوا سے کہہ کر وہ چوٹ کا معائنہ کرنے لگا۔  
اتنے میں بوا باکس لے آئیں۔ پٹی کر کے وہ اس  
کے مقابل صوفے پر بیٹھ گیا۔

”امی کہتی ہیں کہ جب کوئی تکلیف میں ہو تو اس  
کے لیے دعائیں مانگنی چاہیے میں دعا والی کوئی  
کتاب ڈھونڈ رہی تھی۔“ پہلے کی نسبت اب وہ کافی  
بااعتماد اور نڈر لگ رہی تھی۔

”سیریسلی.....! ویسے تمہاری امی کہاں ہیں اور  
آپی۔“ اچانک کچھ کمی محسوس ہونے پر وہ بولا۔

”ہاسپٹل.....!“ اس کی بات پر وہ ٹھنک گیا اس  
وقت مایا سے کچھ پوچھنا اس نے مناسب نہ سمجھا۔  
تبھی شام کو مام کے لوٹتے وہ ان کے سر ہو گیا۔

”پھپھو گاؤں سے یہاں آئی ہوئی ہیں اور  
ہاسپٹل میں ہیں اور آپ نے مجھے بتانا تک  
ضروری نہ سمجھا۔ ویسے ایڈمٹ کون ہے سب ٹھیک

تو ہے مام۔ کچھ ہے جو آپ مجھ سے چھپا رہی  
ہیں۔“ ان کے چہرے کے تاثرات بھانپ کر وہ  
قیاس کرنے لگا۔

”تھنک مائی سن! بس تم بڑی تھے اس لیے میں  
نے ڈسٹرب کرنا ضروری نہ سمجھا۔“

”نو مام! آپ شاید یہ بات نہیں جانتیں بٹ  
میں آپ کو بچپن سے جانتا ہوں آپ کو جھوٹ بولنا  
تو بالکل نہیں آتا۔“ وہ انہیں شانوں سے تھامے  
کہنے لگا۔

”زویا کے دل میں سوراخ ہے شریانوں کے  
تنگ ہونے کے سبب خون جمنے لگا ہے۔ ہارٹ بلڈ  
سرکولیشن نہیں کر پا رہا۔ ڈاکٹر نے فوراً سرجری کرنے  
کو کہا ہے۔ فردوس آپا بھی کافی ڈسٹرب ہیں سمجھ  
نہیں آرہا کہ کریں تو کیا۔“ بیڈ پر بیٹھ کر آہستہ سے  
وہ کہنے لگیں۔ ان کے الفاظ اس پر ہتھوڑا بن کر  
برسنے لگے ایک پل کو تو وہ کچھ بول ہی نہ پایا مگر  
جب بولا تو الفاظ بکھر کر ادا ہونے لگے۔

”کب ہے..... سرجری۔“

”ڈاکٹر نے اگلے ماہ تک کی مہلت دی ہے  
پیسوں کا انتظام ہونے پر فوراً آپریشن کرنا پڑے  
گا۔“ وہ بھیکے لہجے میں بتانے لگیں۔

مام کافی disappointed لگ رہی تھیں۔

”اس اوکے مام! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ زویا  
کو کچھ نہیں ہوگا۔ ٹرسٹ می۔“ وہ ان کے قدموں  
کے پاس بیٹھا ان کا ہاتھ تھامے تسلی دینے لگا۔ جس  
پر فقط وہ اثبات میں سر ہلایا کر رہ گئیں۔ آپریشن کے  
لیے ایک خطیر رقم درکار تھی۔ اگلے روز اس نے  
ہاسپٹل جا کر ساری انفارمیشن لی۔ رقم کے متعلق  
فردوس بیگم کو دلا سہ دلا کر اس نے بینک میں لون کے  
لیے اپلائی کیا۔ کہنی کے آج کل خسارے کے دن  
تھے۔ وہاں سے کچھ ملنا مشکل تھا۔ اس نے شہر سے  
باہر بنا اپنا پلاٹ تک بیچ دیا۔ وہ باقاعدگی سے



ہاسپٹل جانے لگا تھا۔ زویا کی حالت دن بدن بگڑنے لگی اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔ زویا کی تکلیف اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ پھپھو اس کی بے حد مشکور تھیں لیکن اس کے اندر جیسے ویرانیاں اترنے لگیں۔ زویا کو کھونے کا احساس بے حد تکلیف دہ تھا۔

☆.....☆

”آپی کب واپس آئیں گی ہاشم بھائی؟“ مایا اس کا کندھا جھنجھوڑنے لگی۔ تو جیسے وہ ہوش کی دنیا میں واپس لوٹ آیا۔

”جلد، بہت جلد۔“ بھیکے لہجے میں وہ کہنے لگا۔  
”آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے ماموں اور ڈاکٹر کی باتیں سن لیں ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ اب آپ کبھی ٹھیک نہیں ہوں گی آپ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ بہت برے ہیں۔“ سات سالہ مایا اب باقاعدہ رونے لگی تھی۔

”یا گل ایسا نہیں ہوگا۔ تمہاری آپی ضرور آئیں گی آئی پر امس۔“ اس کے ننھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے وہ اس سے زیادہ خود کو سلی دینے لگا۔

”اچھا چلو میں نے تمہارے لیے کچھ اسٹوری بکس لی ہیں۔ یہ دیکھو۔“ وہ فوراً رونا بھول کر کتابوں میں مگن ہو گئی۔

ہاشم اب اس کا پہلے سے بھی زیادہ دھیان رکھنے لگا تھا۔ وہ اپنی آپی سے بہت مانوس تھی شاید اس لیے زویا کی حالت اس کے لیے بہت تکلیف کا باعث تھی۔ وہ جتنا ہوتا اس کی ضرورتوں کا پورا خیال رکھتا مایا بھی اب اس سے کافی ایچ ہو گئی تھی۔ دن تیزی سے گزرنے لگے۔ گزرتے دنوں آپریشن کا دن بھی آ گیا۔ سب کی بے شمار دعاؤں اور آنسوؤں کے باوجود سرجری کے دوران زویا زندگی کی بازی ہار گئی۔ زندہ رہنے کی امید جیسے دم توڑ گئی۔ پھپھو نے رورور کر برا حال کر لیا۔ کچھ کم خراب حالت اس کی بھی نہ تھی۔

وہ مایا سے نظریں بچاتا رہا اس کے معصوم سوالوں کے جواب دینے سے قاصر تھا۔ سب کی نشانی اور حوصلہ آمیز جملے بھی اس کا غم کم نہ کر سکے۔ دو دن سے اس نے ایک نوالہ تک نہیں کھایا تھا۔ وہ خود کو جیسے فراموش کر بیٹھا ہو۔ خود کو بھلا کر جینا اس نے سیکھ لیا تھا مگر کب تک.....؟

ناشتے کی ٹرے جوں کی توں رکھی تھی۔ تبھی مایا دروازہ کھول کر اندر چلی آئی صوفے پر وہ آکر بیٹھ گئی۔

”آپی تو چلی گئی ہاشم بھائی پر اگر آپ نے بھی کچھ نہ کھایا تو پھر کہیں آپ بھی ہمیں چھوڑ کر چلے نہ جائیں۔ پلیز کچھ کھالیں ہاشم بھائی۔“ معصومیت سے کہے الفاظ پر وہ بے یقینی سے اس صابر بچی کو دیکھنے لگا۔

”ہوں!“ محض اتنا کہہ کر اس نے مایا کے ماتھے پر لب رکھ دیے۔

”آپ کے ہاشم بھائی آپ کو چھوڑ کر کبھی نہیں جائیں گے پر امس۔“ اس کے فقط اتنا کہنے پر ہی وہ خوش ہو گئی۔

☆.....☆

وہ اب خود کو بدلنے لگا تھا۔ وہ اسے خوش رہ کر دکھانا چاہتا تھا۔ اس کی معصوم مسکراہٹ اس کے لیے بیش قیمت تھی۔ جس سے وہ کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے دوبارہ آفس جوائن کر لیا تھا۔ شام کو اکثر وہ اسے پارک گھمانے اور آسکریم کھلانے لے جاتا، شام کو گھر واپس لوٹتے اس نے پھپھو کو مایا سے کہتے سنا۔

”اب ہمیں چلنا ہوگا عظمت بھائی، آپ نے ہمارے لیے جو کچھ کیا۔ میں شاید ہی تمام عمر یہ قرض نہ چکا پاؤں گی۔“ پھر اگلے روز پھپھو مایا کو لے کر چلی گئیں۔

☆.....☆



عدالت کے اہم کام کے سلسلے میں پچھلے چار دن سے وہ اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ آج اس کی واپسی تھی۔ واپسی پر گھر لوٹنے کے بجائے وہ آفس چلا گیا۔ رات کو تقریباً گیارہ بجے اس کی واپسی ہوئی۔ گھر پر اندھیرے کا راج تھا۔ کوٹ اور بیگ شرفو کو پکڑا کر وہ اسٹڈی کی سمت چلا آیا۔ خلاف توقع اسٹڈی کی لائٹ آن تھی۔ اس وقت یہاں کسی کے آنے کا امکان تو نہ تھا۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے سب سے پہلے اس کے دماغ میں یہی خیال آیا۔ اندر داخل ہو کر سامنے اسٹول کے پاس کھڑی سی گرین سوٹ میں ملبوس وہ ریک پر نہ جانے کیا رکھ رہی تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز پر بے ساختہ پلٹی۔

”پچھلی بار آپ کی شرارت پر میں گر گئی تھی۔ پر اب یہ پاسیبل نہیں ہاشم بھائی۔“ مسکرا کر کہتے وہ اسٹول سے اتر گئی۔ چہرے پر ننھے چمکتے پسینے کے قطرے بالوں کی ڈھیلی چٹیا گالوں پر پڑنے والا ڈمپل، وہی جھیل جیسی کالی گہری آنکھیں اسے دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔ زبان نے بمشکل حرکت کی۔

”زویا.....!“

”افوہ آپ شاید میرا نام تک بھول گئے۔“ اب کی بار اس کے انداز میں خفگی نمایاں تھی تبھی دروازہ کھول کر مچلیں آئیں۔

”اچھا ہوا ہاشم تم آگئے۔ مایا سے تم مل چکے ویسے تمہاری پھپھو تمہاری منتظر ہیں۔“

”کب آئیں پھپھو؟“ ان کے سوال پر اس نے کہا۔

”کل شام کو ہی سرفراز لینے گیا تھا۔ میں نے تمہیں ٹیکسٹ تو کر دیا تھا۔ فون تو تم اٹینڈ کرتے نہیں۔ اپنی دے ڈرتو کر لیا نا تم نے؟“

”جی۔“ جواب میں اس نے فقط اتنا ہی کہا۔

”او کے تم فریش ہو کر آ جاؤ۔ فردوس آپا کتنی بار

تمہارا پوچھ چکی ہیں، آ کر ان سے بھی مل لینا۔“ می کہہ کر جا چکی تھیں۔ جیسی وہ پلٹا مایا اسی کی منتظر تھی۔

”آپ اتنے ان رسپانسبل تو نہ تھے ہاشم بھائی! پتا ہے مائی آپ کی وجہ سے کتنی اپ سیٹ رہتی ہیں۔“ وہ تھکن کا بہانہ کر کے فوراً وہاں سے چلا آیا۔ ساری رات سبز کپڑوں میں ملبوس سراپا اس کے حواس پر چھایا رہا۔ سلپنگ پلزلے کر وہ آنکھیں موندھے لیٹ گیا۔ صبح ناشتے پر خاصی گہما گہمی تھی ماما پاپا کے علاوہ پھپھو اور مایا کی موجودگی اتنے عرصے بعد خاصی رونق لگی تھی۔

”ماشاء اللہ میری مایا بیٹی تو خیر سے کافی بڑی اور سمجھدار ہو گئی ہے ابھی کچھ سال پہلے تو دو چوٹیاں تک نہیں بنتی تھیں تمہاری۔“ عظمت صاحب اس کے سر ہاتھ پھیرتے محبت سے کہنے لگے اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی آج چونکہ سنڈے تھا ناشتے کے بعد وہ لان میں ٹہلنے آ گیا۔ آج اس کا بھی آف تھا۔ سنڈے کو زیادہ تر اس کی کوشش ہوتی کہ فیملی کو ناٹم دے۔ لان میں وہ یوں ہی ٹہلنے لگا۔ بھی مایا اس کے پیچھے چلی آئی۔

”افوہ حد ہے ہاشم بھائی! مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ آپ مجھ سے کترار ہے ہیں۔“ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”نہیں..... نہیں تو۔“ وہ جیسے ٹپٹا گیا۔

”ایکچو نکلی اتنے عرصے بعد تمہیں دیکھ کر کافی سر پرانز ہوں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ صفائی دینے لگے۔

”ہاں آپ تو زویا آپنی کے بعد جیسے ہمیں بھول ہی گئے۔ کیا آپنی کے بعد سارے تعلق ختم ہو گئے ہم سے آپ کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ آپ نے ایک بار بھی ان دس سالوں میں چکر نہ لگایا بس ماموں اور مائی بھی کبھار فارمیٹی کے لیے آ جاتے ہیں۔“ وہ افسردگی سے کہنے لگی۔



”تم بھی تو مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔“ نہ جانتے ہوئے بھی وہ گلہ کر بیٹھے۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

ہاشم بھائی! واقعی کتنا بدل گئے تھے۔ اپنے عمر سے خاصے بڑے دکھائی دینے لگے۔ بالوں میں چمکتی سفیدی، فریم لیس گلاسز اور چہرے پر حزن رقم تھا۔ مایا کو دیکھ کر افسوس ہونے لگا۔ زویا کے بغیر زندگی کتنی منتشر تھی۔ وہ دکھ سے سوچنے لگی۔

”اب میں آپ کو چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گی آئی پر اس۔“ اس کی بات پر کتنی دیر وہ کچھ بول ہی نہ سکے۔

☆.....☆

اسفندیار پھوپھا نے اسلم نامی شخص کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کیا۔ وہ شخص فراڈ نکلا اور ایک روز ان کی تمام جمع شدہ رقم اور بینک سے ایک خطیر رقم لون لے کر فرار ہو گیا۔ بینک کے کاغذات پر چونکہ اسفندیار کے سائن تھے۔ لون ان کے نام سے لیا گیا تھا تو پولیس نے انہیں حراست میں لے لیا۔ ان کا گھر بینک کے قبضے میں چلا گیا۔ رقم انہوں نے چونکہ گاؤں کے چوہدری ملک وجاہت سے ادھار لے رکھی تھی یہ کیس انہوں نے ہی اس کے خلاف درج کروایا تھا۔ اسلم جیسے مشکوک شخص کے ساتھ کام کر کے ان کی نیک نامی پہلے ہی مشکوک ہو چکی تھی۔ جب سب نے مدد کرنے سے انکار کر دیا پولیس انہیں لے جا چکی تھی پھپھو نے روتے ہوئے عظمت صاحب کو کال کر لی۔ عظمت صاحب عارضہ دل کے مریض تھے ڈاکٹر نے انہیں لمبا سفر کرنے سے منع کیا تھا۔ سوانہوں نے اپنے ڈرائیور کو انہیں لینے بھیج دیا۔ بہن کے حالات ان کے لیے بہت تکلیف کا باعث تھے ہاشم کو بھی یہ سب جان کر بہت افسوس ہوا۔ رات کو ٹیرن پر کھڑے سگریٹ پیتے اس کا دھیان نہ جانے کس سمت تھا کہ مایا دبے پیر چلتی ریلنگ کے

پاس اس کے برابر چلی آئی۔

”کتنی بری بات ہے آپ چکے چکے اسموکنگ بھی کرتے ہیں۔ اس ناٹ فینر ہاشم بھائی۔“ وہ چونکے۔

”تم سے یہ کس نے کہا کہ میں چھپ کر اسموکنگ کرتا ہوں۔“ رخ موڑے بغیر جواب دیا گیا۔

”اور نہیں تو کیا ورنہ اتنی رات کو یہاں ٹھنڈ میں آپ تھوڑی ناپیتے۔“ اپنے تئیں اس نے پتے کی بات کی۔ دانستہ وہ اس کی سمت دیکھنے سے گریز کرنے لگے۔

”ہاشم بھائی! کیوں آپ اپنی لائف کو مشکل بنانے پر تلے ہیں۔ جسٹ تھرو دس۔“ کہہ کر اس نے سگریٹ ان کے ہاتھ سے لے کر پھینک دی وہ ہکا بکا دیکھتے رہ گئے۔

”واٹ نان سینس از دس۔ تمہیں کیا لگا تمہاری اس اسٹوپڈ حرکت سے میں رک جاؤں گا نیور، اینڈ ہاؤ ڈیریو، ہوش میں آؤ مس مایا اب تم نیکی نہیں رہی جسٹ گرو اپ۔ ایسی اسٹوپڈ حرکتیں تمہیں سوٹ نہیں کرتیں۔“ اس نے پہلی بار ہاشم کو یوں غصے میں دیکھا تھا۔ آنکھوں میں بے یقینی سموئے وہ انہیں دیکھنے لگی۔

”آپ واقعی بہت بدل گئے ہیں ہاشم بھائی! آپ نے پہلے کبھی مجھ سے اس طرح لی ہو نہیں کیا۔“

نہ چاہتے ہوئے اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔ کہہ کر وہ رکی نہیں تیزی سے وہاں سے نکل آئی۔ جب کہ وہ ندامت سے اپنا سر تھام کر رہ گئے۔

☆.....☆

صبح آفس کے لیے نکلتے وقت وہ انہیں لان میں تنہا بیٹھی دکھائی دی۔ بیگ اور لیپ ٹاپ سرفراز (ڈرائیور) کو تھما کر ریٹ واچ دیکھتے وہ اس کی سمت چلے آئے۔

”گڈ مارننگ آنجل!“ وہ اس کے سامنے رکھی



جیر پر آ بیٹھے اس نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔  
 ”اوہ تو لنل آئبل ناراض ہیں ہم سے۔“ وہ  
 اسے تنگ کرنے کی خاطر بولے۔  
 ”میں آپ سے ناراض نہیں ہوں بس آپ سیٹ  
 ہوں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”اور تمہارے اسچر سیٹ ہونے کا میری اسموکنگ  
 سے کیا کنکشن؟“ وہ نا جھبی سے پوچھنے لگے۔  
 ”آپ ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں کیا۔ آپ کو اپنے  
 سوا کسی کی پروا نہیں۔ ہاشم بھائی یہاں نہیں کب  
 سدھریں گے آپ۔“ وہ مایوسی سے کہنے لگی۔  
 ”تم پہلی لڑکی ہو جو مجھے کہہ رہی ہو کہ میں بگڑا ہوا  
 ہوں ورنہ آج تک تو مجھے صرف تعریفیں ہی سننے کو ملی  
 ہیں۔“ وہ واقعی حیران تھے۔

”اچھا اوکے، اب تم آگئی ہو تو تم ہی مجھے سدھار  
 لینا۔“ وہ فوراً ہار مانتے بولے۔  
 ”سیر۔ سلی.....! تو آپ آئندہ اسموکنگ نہیں  
 کریں گے، وعدہ کریں۔“ وہ جھٹ سے مطلب پر  
 آئی۔

”اوکے بابا! کوشش کروں گا پر وعدہ نہیں۔“ اس  
 کے کہنے پر بھی وہ خوش ہو گئی۔ اسے اور کیا چاہیے  
 تھا۔ دن بھر اس کی دلکش مسکراہٹ اس کے آنکھوں  
 کے پردے پر چھائی رہی۔ اپنے لیے کسی کا اتنا فکر  
 مند ہونا اسے اچھا لگنے لگا تھا۔

آج وہ آفس سے جلدی لوٹا آیا۔ بابا نے واپسی  
 پر مایا کے لیے کالج کے ایڈمیشن فارم لانے کو کہا تھا۔  
 شام کو لاؤنج میں بیٹھے وہ ایڈمیشن فارم کے متعلق  
 ڈسکس کر رہے تھے۔

”پری میڈیکل میں ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں ہاشم  
 بھائی! گاؤں کے لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی  
 ہوں۔ بابا کی بھی یہی دیش تھی اور میں ان کا خواب  
 ضرور پورا کروں گی۔“ وہ اپنے ایڈمیشن فارم کو  
 لے کر کافی ایکسائیڈ تھی۔ اس کے پچھلے نمبرز بھی

کافی شاندار تھے اسے پڑھنے کا جنون کی حد تک  
 شوق تھا وہ اس کے بچپنے پر مسکرا دیے۔ وہ اپنی  
 اسٹڈیز کو لے کر بہت کریزی تھی۔ دن میں چھ سے  
 آٹھ گھنٹے وہ کتابوں کو چانتی۔ اسے ہر حال میں  
 اسکا لرشپ حاصل کرنا تھا جس کے لیے وہ اتنی تنگ  
 و دو کر رہی تھی۔

☆.....☆

”سنو لڑکی! خود پر تھوڑا ترس کھا لیا کرو۔“ ہاشم  
 شام کو اس کے روم میں آئے۔ کتابیں پھیلانے ان  
 پر سر رکھے وہ اونگھ رہی تھی۔ ان کی آمد پر وہ شرمندہ سی  
 ہو گئی۔

”سو سوری تھوڑی نیند آگئی بس۔“ آنکھیں مسلتے  
 معصومیت سے کہا۔

”اچھا ویسے کھانا کھا لیا۔“ ان کی بات پر زبان  
 دانتوں تلے دبا کر اس نے اپنے سر پر چپت ماری۔  
 ”سوری وہ بھی بھول گئی۔“

”پتا تھا مجھے۔“ انہوں نے ٹیبل پر رکھا باکس  
 آگے کیا۔

”پیزا آڈر کیا تھا سو چائل کر کھائیں گے۔“  
 ”تھینکس۔“ پیزا کا بائٹ لیتے وہ بولی۔

”خود پر اتنا پریش مت ڈالو اسکا لرشپ کوئی اتنی  
 تو ضروری نہیں اور پھر تمہاری پوزیشن تو ویسے بھی  
 اسٹرونک ہے۔“ وہ اسے سمجھانے لگے۔

”آپ کو نہیں پتا اس مائی ڈریم میں کسی کے  
 احسان کے بوجھ تلے نہیں رہنا چاہتی میں اڑنا چاہتی  
 ہوں بلند یوں کو چھوٹنا چاہتی ہوں میرا اپنا نام ہوگا۔  
 اپنا ایج ہوگا یہ تب ہی یاسمیل ہے جب یہ سب میں  
 اپنی مدد آپ کے تحت کروں ویسے بھی ماموں اور  
 آپ نے جو کچھ کیا، کیا وہ کم تھا جو اپنی اسٹڈیز کو لے  
 کر تبھی میں آپ پر بوجھ بن جاؤں۔“

”آئی ڈونٹ بلیو تم ایسا بھی سوچ سکتی ہو۔ تم نے  
 ہمیں یوں ایک پل میں غیر کر دیا۔“ وہ تاسف سے



بولے۔

”ایم سوری ہاشم بھائی! پر میں اپنوں کی نظروں میں گر کر بلند نہیں ہونا چاہتی اس لیے آپ جیسا سوچنا چاہیں آپ کی مرضی۔“ کہہ کر وہ دوبارہ کتاب کھول کر بیٹھ گئی۔

چند پل یوں ہی بیت گئے تبھی اس وقت مایا کو سمجھانا انہیں دنیا کا مشکل ترین کام لگا تھا مگر وہ اس کی خودداری کے معترف ضرور ہوئے تھے۔

☆.....☆

رات کو بہت بارش برسی تھی۔ صبح ہر چیز نکھری نکھری تھی۔ برسی بارش بالکل اس کے اندر کی عکاسی کر رہی تھی۔ زویا کی تصویر تھامے کتنی دیر وہ اسے دیکھتے رہے۔ تصویر کو دیکھنے میں اتنے مگن تھے کہ مایا کے آنے کا احساس تک نہ ہوا۔

”آپ اب بھی زویا آپ سے بہت محبت کرتے ہیں نا؟“ مایا کو دیکھا تو انہوں نے فوراً فوٹو فائل میں رکھ دی۔

”محبت کرنا تو بہت آسان ہوتا ہے پر نبھانا مشکل۔ دس سال کسی کی محبت میں خود کو فراموش کر دینے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ اب آپ کو نہیں لگتا آپ کو آگے لائف بڑھانی چاہیے۔ کب تک آپ اس طرح اپنے ساتھ اپنوں کو دکھ دیتے رہیں گے۔“ اس کی بات پر وہ اچنبھے سے اسے دیکھنے لگے۔

”اپنوں کو دکھ اور میرا کیا، میرے دکھ کا کسی کو اندازہ ہے۔ مایا کہنا بہت آسان ہوتا ہے۔ پر میری جگہ پر خود کو رکھ کر دیکھو سب اپنے آپ سمجھ آ جائے گا۔“ ان کی بات پر وہ بالکل خاموش ہو گئی۔

”اچھا ویسے کیوں آئی تھیں تم کام تھا کیا؟“ وہ پوچھنے لگے۔

”ایک چوکی آپ کی ڈائری میں میں نے ایک نظم لکھی سوچا آپ کو شاید اچھی لگے۔“

”اور اگر نہ لگے۔“ بے ساختہ انہوں نے کہا۔

”ایم شیور، آپ جب اسے دیکھیں گے مجھے مس ضرور کریں گے اپنی دے میں چلتی ہوں۔“ وہ پلٹنے لگی۔

”اور ہاں ہاشم بھائی! ایک اور بات جو لوگ پھڑ جاتے ہیں ان کے لیے آنسو نہیں بہاتے بلکہ ان کے لیے دعائیں کی جاتی ہیں۔ آپ زویا آپنی کے لیے دعا کریں آپ کو سکون ملے گا۔“ اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ زویا کے لیے دعا کر کے وہ واقعی خود کو ماکا پھلکا محسوس کرنے لگے تھے۔ یہ سب کرنا نبھانے کیوں انہیں اچھا لگنے لگا تھا۔

☆.....☆

زویا کے جانے کے بعد جیسے وہ ہنسنا مسکرانا بھول گئے تھے۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے کسی سے سچی محبت کی تھی اسے کھونے کا درد ہر شے سے بڑھ کر تھا۔ زویا کے علاوہ کبھی وہ کسی لڑکی کو لے کر سپر لیس نہ ہوئے تھے شاید اب اس کی ضرورت نہ تھی انہیں زندہ رہنے کے لیے کسی بہانے یا وجہ کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے لیے ہر چیز سے بڑھ کر ان کا کیریئر تھا ایک کامیاب وکیل بننے کے لیے انہوں نے بہت جدوجہد کی تھی تب جا کر انہیں یہ مقام ملا تھا۔ مام اب بھی اکثر انہیں لڑکیوں کی تصاویر دکھاتیں مگر اس کی توجہ اس جانب نہ تھی پر مایا سے مل کر وہ بدلنے لگے تھے۔ وہ مسکرانے لگے تھے۔ خوش رہنے لگے تھے اس کی بچکانہ حرکتیں، اس کا انداز سب اسے بھلا لگنے لگا۔ مایا کی شاید ہی کوئی بات اسے بری لگتی۔ وہ محفلوں سے گریزاں رہتا۔ حد درجہ لاپرواہ بندہ اب مایا کے معاملے میں اپنی احساس ذمے داری پر خود حیران رہ جاتا۔ اسے کالج پک اینڈ ڈراپ کرنا، کبھی لائبریری تو کبھی اسٹڈیز کے معاملے میں اسے گائیڈ کرنا، مایا کے ساتھ وقت بیتنے کا احساس تک نہ ہوتا۔ مایا کی بات



کو رد کرنا تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

☆.....☆

اس روز بھی وہ ساڑھے پانچ بجے تھکا ہارا گھر لوٹا کہ مایا نے اسے جالیا، چاہنے کے باوجود وہ اسے منع نہ کر پایا۔ حالانکہ اس وقت اسے چائے کی شدید طلب تھی۔ مارکیٹ جا کر اس نے پوری مارکیٹ کھنگال ڈالی پر اسے مطلوبہ چیز نہ ملی۔ تبھی طارق روڈ کے ایک بوتیک جا کر اس نے ہاشم کے لیے سویر قسم کا سوٹ پسند کیا۔ وہاں سے نکل کر اس کا رخ سیلون کی طرف تھا۔

”کافی ٹائم ہو گیا اب گھر چلیں۔“ ریسٹ وایج دیکھتے انہوں نے بیزاری سے کہا۔

”افوہ آپ روز فری تھوڑی ہوتے ہیں کم آن۔ ان کے بالوں کا نیچرل ڈائی کریں اور کنگ بھی کسی نیولک کی جوائنٹ سوٹ کرے اور یگ بھی لگیں۔“ ہاشم کے منع کرنے کے باوجود اس نے اپنی ضد پوری کروا کر ہی دم لیا۔ اپنے نئے لک کو دیکھ کر وہ پہچان ہی نہ پائے ”سپر“ وہ بچوں کی طرح خوش ہونے لگی۔

”تین گھنٹے کی انتھک محنت کا نتیجہ ہے میں نے کہا تھا آپ اتنے بھی بوڑھے نہیں۔ جتنا show کرتے ہیں۔ ویسے مایا نے کہا تھا کل آپ کو لڑکی والے دیکھنے آرہے ہیں۔ میں نے سوچا اس طرح امپریشن اچھا پڑے گا۔“ وہ اپنی کامیابی پر بے حد خوش تھی۔ وہ ٹھٹھک کر اسے دیکھنے لگے۔

”واٹ ڈویو مین، یہ سب تم نے مام کے ساتھ مل کر، ڈیم اٹ، مام کی بات تو چلو اور ہے بٹ یو، سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم ایسا کیسے کر سکتی ہو۔ میں نے تمہیں کیا سمجھا اور تم کیا لکھیں اوروں کی طرح مطلبی، سیلفش میں نے کم از کم تم سے یہ اسپیکٹ نہیں کیا تھا۔“ اس کی حرکت پر انہیں واقعی دکھ پہنچا۔ جیسی گھر پہنچ کر بنا کچھ کہے وہ اپنے کمرے میں بند

ہو گئے مام کو اس نے ان لوگوں کو بلانے سے منع کر دیا۔ وہ اب مایا کو فیس نہیں کرنا چاہتا تھا مگر کب تک اگلی شام وہ اس کے سامنے تھی۔

”آپ اتنی جلدی ہم سے بیزار ہو گئے ہاشم بھائی! آپ کو مجھ سے چپنے کی ضرورت نہیں میں نے ماموں سے کہہ دیا ہے اب ہم آؤٹ ہاؤس میں رہیں گے۔“ انہوں نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔

”ایم سوری ہاشم بھائی مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ آپ میری حرکت سے ہرٹ ہوں گے۔ ورنہ کبھی میں ایسا نہ کرتی میں واقعی بہت اسٹوپڈ ہوں۔“ انگلیاں آپس میں مسلتے وہ واقعی شرمندہ لگ رہی تھی۔

”اٹس اوکے۔“ انہوں نے فقط اتنا ہی کہا تھا وہ ان کے سینے سے لگ گئی۔

”آپ کی مایا بہت بری ہے ہاشم بھائی پلیز آپ جو سزا دینا چاہیں دیں پر پلیز مجھ سے ناراض مت ہوں۔“ ہاشم کی سانس رکنے لگی۔ وہ اس کے پاس تھی اس کے دل کی حالت عجیب ہونے لگی۔ اس نے مایا کو دونوں شانوں سے تھام کر خود سے الگ کیا۔

”میری مایا دنیا کی سب سے اچھی لڑکی ہے۔ دیکھو اب رونا نہیں میں تم سے ناراض ہو ہی نہیں سکتا۔“ ان کی بات پر آنسو صاف کر کے وہ دل سے مسکرا دی۔

”ہینکس ہاشم بھائی!“ وہ نجانے کیا کہنے لگی مگر اس کی نگاہیں اس کے ڈمپل والی مسکراہٹ پر ٹھہری گئیں۔ ساری رات وہ نم پلکیں اور ڈمپل والی مسکراہٹ اسے مضطرب کرنے لگیں وہ اپنی اس کیفیت کو کوئی نام نہ دے پایا۔

☆.....☆

اسفندیار کے کیس کے سلسلے میں عظمت صاحب



آج کل کسی وکیل کی تلاش میں سرگرم تھے اس سلسلے میں ہاشم نے اپنے کو لیگ سے بات بھی کر لی تھی۔ پیر کو کیس کی پہلی پیشی تھی پھپھو کی دعا میں طویل اور سجدے لمبے ہونے لگے۔ مایا بھی پریکٹسنگ کے سبب کالج سے لیونہ لے سکی۔ ان روز و شب میں پہلی پیشی گزر گئی۔ اگلی تاریخ ایک ماہ بعد تھی پھپھو نے طویل قیام کے پیش نظر اور مایا کے کہنے پر آؤٹ ہاؤس میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ عظمت صاحب بھی آمادہ نہ ہوتے اگر مایا نے ضد اور پھپھو نے اس کی حمایت نہ کی ہوتی۔ سنڈے کو جاگنگ سے واپس لوٹتے وہ گیٹ پر ٹھٹھک کر رک گیا سامنے بلیک ٹاپ اور جینز پہنے ننھے کبوتر کو دونوں ہاتھوں میں لے کر پیار کرتی مایا کھڑی تھی کس قدر معصومیت اور سادگی تھی اس کے انداز میں وہ کتنی ہی دیر محویت سے اسے دیکھتا رہا۔ ٹپ ٹپ بارش کی بوندیں اسے ہوش کی دنیا میں واپس لے آئیں۔

”اندر چلیں ہاشم بھائی ورنہ ٹھنڈ لگ جائے گی۔“ مایا کے متوجہ کرنے پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ بارش رفتہ رفتہ تیز ہونے لگی۔ مایا اندر جا چکی تھی مگر وہ کتنی ہی دیر بھگتا اسے سوچتا گیا۔ مایا کے لیے اس کے دل میں موجود جذبات بدلنے لگے تھے۔ اسے پہروں بیٹھ کر سوچنا اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ پر یہ اعتراف کرتے نہ جانے کیوں وہ اپنے آپ سے بھی جھجھک جاتا۔ بارش میں بھگنے کے سبب شام کو اسے موسمی نزلہ و بخار نے آلیا بخار اور درد سر کے سبب اس نے ڈنر پر آنے سے منع کر دیا۔ شرفو سر شام ہی ڈاکٹر کو لے آیا۔ ڈاکٹر کے نسخے کی دوائے بھی خاطر خواہ افاقہ نہ کیا۔ مایا نے جب سنا فوراً دوڑی چلی آئی۔

”ویسے اس موسم میں میری ایسی حالت ہو جاتی ہے اب کی بار آپ نے یہ اپنے سر لے لی۔“ ان کا بخار چیک کرتے وہ فکر مندی سے کہنے لگی۔

”بس معمولی سا بخار ہے دوا میں نے لے لی۔ تھوڑا آرام کر لوں ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ وہ نقابست سے کہنے لگے۔

”ہاں وہ بھی کر لینا پہلے یہ سوپ پی لو۔“ مانی سوپ کا پیالہ لے کر آئیں۔

”مام کچھ تو رحم کریں مجھ سے سوپ وغیرہ نہیں پیا جاتا۔“ وہ ناگواری سے کہنے لگا۔

”لائیں ماما مجھے دیں میں پلاتی ہوں۔“ سوپ لے کر وہ اسے پیچ لے کر پلانے لگی۔ سلکی لیئرز میں کٹے بال کندھے پر ایک جانب پھیلائے اور ج کاشن کے لباس میں ملبوس وہ اس وقت بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ ماما مسکراتے ہوئے پلٹ گئیں۔ مایا بھی تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے جا چکی تھی مگر اس کے اندر جیسے ویرانیاں گھر کرنے لگیں۔ زویا کے بعد اب مایا کو کھونے کا حوصلہ اس میں نہ تھا۔ پھوپھا کے واپس آتے ہی یہ لوگ گاؤں واپس لوٹ جاتے اس طرح تو وہ مایا کو شاید ہمیشہ کے لیے کھود دیتا۔ پھوپھا کسی قیمت پر مایا کو اس کے سپرد نہ کرتے اور مایا کے بغیر رہنا اب جیسے ناممکن تھا۔ یہی پل تھا جب اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ ماموں تو اس کی خواہش جان کر ساکت رہ گئے۔

”کیا فردوس آپا اس رشتے پر رضامند ہوں گی۔“ مام نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

”یہ میرا ہیڈک نہیں میں نے صرف آپ کو اپنی پسند سے آگاہ کیا ہے۔“ عظمت صاحب کو سمجھ نہ آیا کہ کہیں تو کیا لیکن جب فردوس بیگم نے یہ سنا تو جیسے ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

”مانا کہ بھائی صاحب! ہاشم آپ کا اکلوتا بیٹا ہے پر مایا بھی میری بچی ہے کیسے اسے جان بوجھ کر اندھے کنویں میں دھکیل دوں کیسے اپنی سترہ سالہ بچی آپ کے چالیس سالہ بیٹے سے بیاہ دوں۔ بلاشبہ ہاشم میرا بھتیجا ہے پر سچ مانیں آپ کے منہ سے یہ سن



کر مجھے بہت ٹھیس پہنچی ہے بتائیں اگر مایا آپ کی بیٹی ہوتی تو کیا آپ تب بھی یہی فیصلہ کرتے؟“ ان کی بات پر عظمت صاحب خاموش ہو کر رہ گئے۔ مام نے جب پجوشن اسے بتائی تو وہ جیسے ضد پر اڑ گیا۔

”میں یہ سب نہیں جانتا مام! میں اگر شادی کروں گا تو صرف مایا سے اینڈ دیش آل، اور اگر آپ کے لیے یہ پاسبیل نہیں تو فائن آئیندہ اس گھر میں اس ٹاپک پر کوئی بات نہیں کرے گا۔“ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکل آیا مام اپنا سر تھام کر رہ گئیں جب کہ عظمت صاحب کی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

☆.....☆

”مجھے یقین نہیں آرہا عظمت بھائی ایسا کیسے سوچ سکتے ہیں آج اگر میں بے بس ہوں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ میری مجبوری کا اس طرح فائدہ اٹھائیں۔“ مایا کو یہ سب سن کر شدید دھچکا لگا تھا۔

”میں ابھی ہاشم بھائی سے اس بات کا پوچھ کر آتی ہوں ایم شور انہیں اس سب کے متعلق کچھ علم نہ ہوگا۔“ وہ اٹھ کر جانے لگی ممانے اس کی کلائی تھام کر اس اقدام سے روکا۔

”ہرگز نہیں یہ سب ہاشم کی خواہش پر ہوا ہے۔“ ممانے کے انکشاف پر وہ ششدر رہ گئی۔ اگلے ہی پل وہ ہاشم کے کمرے میں اس کے روبرو تھی۔

”یہ سب کیا ہے ہاشم بھائی ماموں نے جو کہا کیا وہ سچ ہے۔“ وہ راکنگ چیئر پر بیٹھے تھے کہ اس کے داخل ہونے پر رک کر اس کی سمت دیکھنے لگے جو بالکل اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”ریلیکس آرام سے بیٹھو دراصل میں خود تم سے یہ سب ڈسکس کرنا چاہتا تھا۔“ سامنے صوفے کی جانب اشارہ کر کے وہ آرام سے کہنے لگے۔

”اسپاسمیل ہاشم بھائی! آئی ڈونٹ بلیو آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ آپ کو اپنے بڑے بھائی کی طرح سمجھا اور آپ.....!“ وہ بے یقینی سے کہنے لگی۔

”جسٹ لسٹن ماما! میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جس سے تمہارے اعتماد کو ٹھیس پہنچے۔ میں زویا سے واقعی محبت کرتا تھا پر وہ سب اب ایک بھولا بسرا خواب بن کر رہ گیا ہے۔ اب میں تم سے محبت کرتا ہوں تمہارے علاوہ اور کسی کے بارے میں، میں تصور بھی نہیں کر سکتا ٹرسٹ می۔“ وہ اسے شانوں سے تھام کر کہنے لگے۔ اس کی آنکھوں میں تنفر کی جگہ خوف سا پھیلنے لگا۔ اس کی گرفت سے خود کو چھڑا کر وہ وہاں سے تیزی سے نکل آئی۔ جن رشتوں پر اس نے سب سے زیادہ اعتبار کیا تھا انہوں نے اس کے اعتبار کو کرچی کرچی کر دیا۔ اس وقت وہ صرف تنہا رہنا چاہتی تھی۔ بے شمار آنسو تکیے کو بھگونے لگے۔ صبح ناسازی طبعیت کے باعث اس نے کالج جانے سے منع کر دیا۔ اس وقت وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اسفندیار کے کیس کی سماعت میں صرف چند دن رہ گئے تھے ان پر فراڈ کا کیس ثابت ہو چکا تھا تمام ثبوت اور گواہ ان کے خلاف تھے بچنے کا صرف ایک راستہ تھا کہ وجاہت چوہدری یہ کیس واپس لے لے عظمت صاحب چوہدری کو مطلوبہ رقم دینے پر تیار تھے۔

”مگر انہوں نے ایک شرط رکھی ہے مایا وہ یہ کہ میں تمہاری شادی ہاشم سے کرادوں۔“ فردوس بیگم کی بات پر وہ تو جیسے دنگ رہ گئی۔ اس کے نزدیک بابا کی رہائی اہم تھی پر ماموں کی خود غرضی پر اسے بہت رنج ہوا۔

”اور آپ نے کیا کہا؟“ وہ افسردگی سے پوچھنے لگی۔



”میں نے انہیں ہاں کر دی اور میں کرتی تو کیا۔  
بھائی صاحب کے پہلے ہم پر بہت احسان ہیں۔  
رہنے کے لیے چھت سے لے کر تمہاری تعلیم، ہر  
مشکل وقت میں انہوں نے ہمیں سہارا دیا ہے۔ اور  
پھر کیا کمی ہے ہاشم میں۔“ وہ دکھ اور بے یقینی سے  
انہیں دیکھنے لگی۔

”تو آپ نے سودا کر لیا میرے خوابوں کا میری  
خواہشوں کا میری زندگی کا۔“

”نہیں میری جان ایسا کچھ نہیں ہے اور پھر اس  
طرح تمہارے سارے خواب پورے ہوں گے اب  
اگر حالات کٹھن ہیں تو اچھا وقت بھی ضرور آئے گا۔  
سمجھنے کی کوشش کرو یہ سب میں نے تمہارے لیے کیا  
ہے ہمارا گھر بار سب چھن چکا ہے اور اب کوئی مدد  
کرنے کو بھی تیار نہیں۔ تمہاری تعلیم تمہارے خواب  
پورے ہونے کا اب یہی ذریعہ ہے۔“ وہ اسے  
سمجھانے لگیں۔

”آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں ہیں میں  
ایسے شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی جسے ہمیشہ  
میں نے اپنا محرم سمجھا ہو۔ ہاشم بھائی ہمیشہ زویا کے  
حوالے سے میرے لیے اہم ہیں اور رہیں گے۔ اس  
سے آگے کچھ نہیں۔“ اس نے سختی سے ان کی بات رد  
کر دی۔

”مایا میری جان مان جاؤ۔ اسی میں سب کی  
بھلائی ہے۔ کیا تم اپنے خوابوں سے دستبردار ہو سکتی  
ہو۔ نہیں نا تو پھر میرا فیصلہ تسلیم کر لو اپنے لیے  
میرے لیے اپنے بابا کے لیے۔“ ان کی بات پر وہ  
مزید کچھ بول ہی نہ پائی بس گرم آنسو گال کو  
بھگونے لگے۔

شام کو ہاشم تقریباً چھ بجے گھر لوٹا وہ پورچ میں  
کھڑی اس کی منتظر تھی۔

”مبارک ہو بالا آخر اپنی سازش میں آپ  
کامیاب ہو گئے۔ آپ نے ماما کو تو کونینس کر لیا مگر

میں مگر کبھی آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ کبھی نہیں  
ہاشم بھائی! آج سے پہلے میری نظر میں جو آپ  
کا مقام تھا سب گر کر چور چور ہو گیا۔ زمین بوس  
ہو گیا۔ مٹی میں مل گیا۔ آج سے میرے ہاشم بھائی  
میرے لیے مر چکے۔ آپ نے میرے خوابوں کا  
خواہشوں کا سودا کیا یہ سودا آپ کو بہت مہنگا پڑے  
گا۔ آپ پچھتا نہیں گے تمام عمر۔ سکون کے لیے  
ترپیں گے آپ مگر پھر بھی خالی ہاتھ رہیں گے۔ جس  
تکلیف سے میں گزری میری دعا ہے وہ آپ پر بھی  
گزرے۔ پل پل اذیت میں رہ کر آپ کو میری بے  
بسی کا اندازہ ہوگا اور ایسا ضرور ہوگا۔“ کہہ کر وہ رکی  
نہیں تیزی سے اندر چلی گئی۔ جب کہ وہ گم صم اپنی  
جگہ ساکت رہ گئے۔

☆.....☆

مایا کا بہت بری طرح زروس بریک ڈاؤن ہوا  
تھا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکی۔ پھر مایا بھی چلی گئی  
اسے چھوڑ کر اس کے لیے تمام عمر کی ناتھائیاں چھوڑ  
کر کتنی مشابہ تھی وہ زویا سے بالکل اسی کی مانند  
اسے تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ آج ایک سال ہونے کو  
آیا تھا۔ اسے پکھڑے وہ اس کی قبر پر بیٹھا اپنی  
قسمت پر ماتم کناں تھا اس کے ہاتھوں نے اس کی  
پلکوں سے معصوم خواب چھین لیے۔ کاش وہ ایسا نہ  
کرتا تو آج مایا زندہ ہوتی اس کے خواب زندہ  
رہتے۔ کاش اسے کبھی محبت ہی نہ ہوئی ہوتی اور  
نجانے کتنے کاش تھے جو پچھتاوے بن کر اسے  
ڈسنے لگے وہ نم پلکوں سے اس خاک کو دیکھنے لگا  
جس کے سپرد اس کی متاع حیات تھی وہ متاع  
حیات جسے خود اس نے اپنے ہاتھوں سے اس مٹی  
کے سپرد کیا تھا۔ ساری فساد کی جڑ یہی محبت تھی۔  
وہ محبت جو لازوال ہے جو امر ہے۔ باقی سب تو  
مایہ ہے۔

☆.....☆



ثناء كنول اللہ دتہ

افسانہ

# لیپوینہ نور





نہیں تو۔“

”اچھا آپ چل کر سو جائیں چلیں چھوڑیں انہیں۔“ حمیرا نرمی سے کہتی ہوئی انہیں ان کے کمرے میں لے گئی تو وہ دونوں بڑبڑا کر رہ گئیں۔ وہ جیسے ہی کمرے سے نکلی وقار اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ٹیس پر لے گیا۔ مغرب کا وقت ہو رہا تھا سورج غروب ہو رہا تھا وقار نرمی سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

”حمیرا! تم جانتی ہو، غروب ہوتے وقت سورج سرخ کیوں ہو رہا ہے؟“ حمیرا اسے دیکھنے لگی تو وہ مسکرا کر بولا۔

”اس لیے کہ وہ اپنے دن سے دور ہو رہا ہوتا ہے۔ اسی دکھ میں وہ سرخ ہو جاتا ہے۔ اور جانتی ہو رات کو چاند روشن کیوں ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنی رات سے مل رہا ہوتا ہے۔ جس طرح رات چاند کے بغیر ادھورا ہے اور سورج دن کے لیے ضروری ہے اسی طرح تم میرے لیے۔ تمہاری موجودگی میرے لیے آکسیجن کا کام کرتی ہے۔“

وہ محبت سے بولا تو حمیرا ایک دم شرمائی پھر وقار بولا۔

”تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو؟“

”میری محبت کا مجھے نہیں پتا بس اتنا پتہ ہے کہ تمہارے بغیر میں مرجاؤں گی کیوں کہ میں تم سے ہی زندہ ہوں۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے مڑی اور سیڑھیاں اترتی چلی گئی، جب کہ وقار کھل کر مسکرا دیا۔

☆.....☆

ڈاکٹر علی کے صرف دو بیٹے تھے۔ بڑا اسحق چھوٹا رفیق، اسحق کی شادی حناء سے ہوئی جن کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا وقار تھا۔ جب کہ رفیق کی صرف ایک بیٹی حمیرا عروش تھی۔ جس کی پیدائش پر صائمہ کا (اس کی ماں) انتقال ہو گیا تھا۔ اور بیوی کے غم میں رفیق بھی چل بسے۔ تب حناء نے ماں کی طرح حمیرا عروش کی پرورش کی اسے بے حد محبت دی۔ اپنی بیٹی مانا، حمیرا اور وقار کی محبت دیکھ کر گھر والوں نے ان کی بات پکی

وہ جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا ہمیشہ کی طرح وہ صوفے پر بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ جب کہ ثانیہ اور ثانیہ کسی شو پر پر بری طرح بحث کر رہی تھیں اور امی ہاتھ میں تسبیح اٹھائے پڑھ رہیں تھیں۔ وہ سب کو سلام کرتا صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا اور جب معمول حمیرا جلدی سے اٹھ کر اس کے لیے پانی لے آئی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے گلاس تھام لیا پھر اسے چڑانے کو امی سے بولا۔ حالانکہ وہ کبھی چڑتی ہی نہیں تھی وقار پھر بھی کوشش کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔

”امی! یہ حمیرا کوئی کام نہ کرے تو مجھے بتائیے گا میں اس کی خوب خبر لوں گا۔“

”ارے نہیں بیٹا! میری حمیرا جیسی بیٹی اور بہو اللہ سب کو دے۔ سارا دن میرے ساتھ چن میں گزار دیتی ہے۔ کبھی سالن بنا رہی ہے، کبھی صفائی کر رہی ہے سچ میرے جیسا خوش قسمت کوئی نہ ہوگا۔ جب کہ ثانیہ اور ثانیہ کو بس ٹی وی دے دو اور کچھ نہیں ارے میں کہہ کہہ کر تھک جاتی ہوں پر یہ کسی کام کو ہاتھ تک نہیں لگاتیں۔ آخر کو اگلے گھر بھی جانا ہے خوب نام روشن کریں گی ماں کا۔“ حناء بیگم تو بھری بیٹھیں تھیں۔ اس کے چھیڑتے ہی شروع ہو گئیں جب کہ باتوں میں مصروف ان دونوں نے بے اختیار ماں کو دیکھا ثانیہ بولی۔

”امی! ایسا تو نہ کہیں رات کو برتن کس نے دھوئے تھے۔“

”اور صبح کو چائے کس نے بنائی تھی۔ آپ ہماری تعریف کبھی نہیں کرتیں۔“ ثانیہ بولے اور ثانیہ چپ رہے یہ ممکن تھا اسے بھی اپنی بنائی چائے آگئی جبکہ حناء بیگم کا پارہ بڑھتا دیکھ کر حمیرا نرمی سے بولی۔

”امی! جب ان پر ذمے داری پڑے گی تو خود کام کریں گی۔“

”ارے بیٹا! آتا ہوگا تو کریں گی جب کہ آتا ہی



کردی۔ وقار نے جاب کے لیے دیئی جانا تھا۔ اس کے آنے کے بعد ان کی شادی طے پائی۔ حمیرا صرف گھر بھر کی لاڈلی نہیں تھی بلکہ پورا خاندان ننھیال سب اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ اسے جو بھی کام بتا دیا جاتا بغیر کسی ناگواری کے کرتی ہمیشہ سب کی ہاں میں ہاں ملائی اور غلط بات پر ٹو کے بغیر نہ رہتی۔

☆.....☆

وہ گھر داخل ہوا تو بے حد خوش تھا کیوں کہ اسے دیئی میں جاب مل گئی تھی۔ وہ حناء بیگم کے گلے میں بازو ڈال کر خوشی سے بتانے لگا تو حمیرا جو وہیں پر تھی جلدی سے اٹھ گئی۔ دو نفل شکرانے کے ادا کرنے کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو بے اختیار اس کے آنسو بہہ نکلے۔ منہ پر ہاتھ پھیر کر وہ مڑی تو وقار جو کب سے اسے دیکھ رہا تھا نرمی سے بولا۔

”اس لمحے پر قربان میرا دل میری جان جس لمحے وہ دیکھتا ہے مجھے فرصت نکال کر“

”کب آئیں گے آپ وقار؟“ وہ بولی تو وہ بولا۔

”جلدی بارات لے کر آؤں گا۔ انتظار کرنا۔“ وہ مڑا تو حمیرا بے اختیار بولی۔

”جلدی آئے گا آپ کی حمیرا آپ کا انتظار کرے گی۔“ وہ مڑا اور مسکرا کر واپس چلا گیا۔ جب کہ بہت ضبط کے باوجود ایک آنسو پلکوں کی باڑھ پھلانگ کر نکلتا چلا گیا۔ پھر اگلے دن کی فلائٹ سے وہ دیئی چلا گیا۔

☆.....☆

وقت رک سا گیا تھا۔ دن تھم سے گئے تھے ایک سال اسے دس صدیاں لگ رہی تھیں اور پھر بلا آخر وقار کا فون آیا۔

”ہیلو حمیرا! تمہارا وقار آ رہا ہے۔“

”کب؟“ وہ بولی۔

”اگلے ہفتے آئی لو یو۔“ اور پھر ہفتہ اسے مہینہ لگنے لگا گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ وہ

اپنے دوست اکرام کے ساتھ بیٹھا تھا جب اکرام بولا۔

”یار! تو پرسوں جائے گا اور کل فرسٹ اپریل ہے یعنی اپریل فول۔“ اس کی بات پر وقار پر سوچ انداز میں بولا۔

”اپریل فول۔“ اور پھر مسکرا دیا۔ کل اس کی بارات تھی اس کا برسوں کا دیکھا خواب پورا ہو رہا تھا وہ بے یقینی سے اپنے ہاتھوں پر بجی مہندی کو دیکھتی تو کبھی گھر کو وہ اس قدر خوش تھی کہ حد نہیں۔ بھی اس کا فون بڑ کرنے لگا، انجان نمبر تھا اس نے حیرت سے اوکے کیا۔

”ہیلو! مسٹر وقار کا ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے اور وہ ہم میں نہیں رہے۔“ اور فوراً بند کر دیا۔ اس نے فون بند کر کے ایک نظر وقار کو دیکھا جو مسلسل مسکرا رہا تھا پھر بولا۔

”دیکھا بن گئی نا اپریل فول، اب میں کل گھر جا کر اسے حیران کر دوں گا۔“ وہ مسکرایا۔

”لیکن یار.....“ اس کا دوست اکرام پریشان سا بولا۔

”چھوڑ یار! مجھے پیکنگ کرنی ہے چل میری مدد کرو۔“ دوسرے ہی دن وہ خوشی خوشی گھر پہنچا تو ساکت رہ گیا سامنے ہی حمیرا سفید کفن پہنے پڑی تھی اس کے ہاتھ سے بیگ چھوٹ گیا وہ بھاگ کر اس کے پاس پہنچا۔ وہ جا چکی تھی بہت دور اس کے ہاتھوں پر اپنے نام کی مہندی دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ حناء بیگم غم سے نڈھال ہو لیں۔

”کل اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا ہائے میری بچی۔“ اس نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا اور اس کے بغیر جینے کے تصور سے ہی مر گئی تھی۔ اس کا چھوٹا سا مذاق چھوٹا سا اپریل فول اس کی جان لے گیا تھا۔ اس کی زندگی برباد کر گیا تھا۔ وہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی ساری خوشیاں گنوا بیٹھا تھا۔ یہ اپریل فول ایک زندگی لے گیا تھا۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا کہ اب رونا مقدر ہی ٹھہرا تھا۔

☆.....☆



یاسمین آفریدی

افسانہ

# اعتباردار





میں ہوں لاریب آج میری شادی ہے مگر اس سے نہیں جس کے میں نے خواب دیکھے بلکہ اس سے جس کا میں کئی روز پہلے تک نام بھی نہیں جانتی تھی۔ کتنا عجیب لگتا ہے تا یہ سب، محبت کسی سے اور شادی کسی اور سے مگر میں پھر بھی بہت خوش ہوں کیونکہ میرے مالک نے اسی میں میری بہتری جانی ہے اور میں اس کے لیے اپنے مالک کی شکر گزار ہوں۔ کبھی کبھی کچھ رشتے نہ بننا ہی بہتر ہوتا ہے کیونکہ کبھی ایک ہی رشتہ ہمیں بہت سے رشتوں سے دور کر دیتا ہے۔

میں نے جس سے محبت کی اس نے مجھے بہت چاہا اتنا کہ اس کی شدید چاہت اور محبت نے مجھے ہر لمحہ آزمائش میں ڈالا مجھے صرف پریشانیوں میں گھیرے رکھا۔

میں گھر کی سب ہی بیٹیوں سے بڑی ہوں اسی لیے ہر کوئی مجھے چاہتا ہے چاہے وہ میرے چاچو ہوں، تایا ہوں یا ان کے بچے ہوں۔ گھر کے سب ہی لوگ مجھے بات بات پر چھیڑتے تاکہ میں بھی ان سب کو جواب دوں۔ ان میں سے ایک میرے تایا کے بیٹے بھی تھے۔ علی جنہیں میں نے ہمیشہ بڑا بھائی سمجھا مگر یہ بھول گئی کہ جنہیں ہم بھائی مانتے ہیں ضروری نہیں وہ بھی ہمیں بھائی کی نظر سے دیکھیں۔

خیر یہ تو تھے میرے تایا کے بیٹے ان سب کزنز میں میرے دو کزن اور بھی تھے۔ میرے چچا کے بیٹے حیات اور پھپھو کے بیٹے حمزہ۔ جو مجھ سے زیادہ بس سال ڈیڑھ سال بڑے تھے۔ نہ جانے ان کے دل میں میرے لیے کس طرح کی پسندیدگی تھی یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے، ان دونوں میں اور علی میں ایک فرق تھا۔ علی کی میں نے ہمیشہ عزت کی اور حیات، حمزہ کو اکثر کھری کھری سنا بھی دیتی۔ ان سے دوستی ہونے کے باعث کافی فرینک تھی۔ اتنی کہ وہ ہر بات ہر مسئلہ مجھ ہی سے شیئر کرتے، میں انہیں برا بھلا بھی کہہ دیتی تو بھی وہ دونوں خاموشی سے سنتے۔ انہی بہتے کھیلتے دنوں میں علی کی کال موصول ہوئی۔ انہوں

نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے چاہتے ہیں اور ہم دونوں کی شادی ہو ایسا گھر والے چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں صاف انکار کر دیا اور کہا۔

”میں تو آپ کو اپنا بڑا بھائی سمجھتی تھی، میں نہیں جانتی گھر والوں کی کیا مرضی ہے، وہ کیا چاہتے ہیں جب گھر والے مجھ سے اس موضوع پر بات کریں گے میں جب سوچوں گی اس بارے میں۔ فی الحال میں ایسا کچھ نہیں سوچتی۔“ ان کو اتنا روڈ جواب دینے کے بعد بھی میرے اندر کوئی ملال نہ تھا مگر گزرتے دنوں میں، میں علی کے بارے میں کافی حد تک سوچنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا میں نے غلط کیا اور میں نے سوری کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنے رویے کے لیے معذرت ظاہر کی تو علی نے بھی خوش اسلوبی سے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور پھر کچھ ہی دنوں بعد چاچو اور چاچی نے حیات کے نکاح کا اعلان کر دیا۔ سب ہی خوش تھے میں بھی بہت ایکسائٹڈ تھی۔ میرے دوست کا نکاح ہو رہا تھا اور ان ہی دنوں مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں بھی علی سے محبت کرنے لگی ہوں۔ اسی لیے میں نے فوراً ہی علی سے اپنی محبت کا اظہار کر ڈالا۔ اب تک سب کچھ بظاہر بہت اچھا چل رہا تھا۔ میں اسے اور بھی خوش تھی مگر کہیں بہت گڑبڑ ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی جلد بازی کے فیصلے ہماری ذات پر بہت بڑا بوجھ ڈال دیتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے کچھ ہی دن میں ہو گیا تھا۔

حیات سے اب بھی میری پہلے جیسی ہی دوستی تھی۔ وہ حمیٰ کی باتیں اکثر مجھ سے کرتا اور میں بہت مزے سے سنتی مگر کہیں ہماری دوستی کو بہت غلط نام دیا جا چکا تھا۔

☆.....☆

حیات کے نکاح کو سال گزر چکا تھا اور میں ان دنوں علی کے بدلے بدلے سے کافی پریشان تھی۔ پھر ایک دن حیات کی کال اور اس سے اگلے ہی دن حمزہ کے میسج نے مجھے غصہ دلا ڈالا تھا۔



حیات کی جس وقت کال آئی میں اپنے سیکنڈ ایئر کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھی۔ میں نے کال ریسیو کر کے بڑے ہی مصروف انداز میں ہیلو کہا۔  
”لاریب! کیسی ہو؟“ دوسری طرف سے حیات کی آواز تھی۔

”جیسی پہلے تھی حسین، خوب صورت، خوب سیرت تم بتاؤ کیسے فون کیا؟“ میں نے شرارتی انداز میں جواب دے کر اس کے فون کرنے کا جواز جاننا چاہا۔

”میں نے کچھ بات کرنی تھی تم سے ضروری بات ہے تم مصروف ہو؟“ حیات نے میری مصروف سی آواز سن کر پوچھا۔

”ہاں پڑھائی میں مصروف تھی۔ تم کہو کیا کہنا ہے میں سن رہی ہوں۔“ میں نے بکس سائیڈ میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔  
”پلیز تم ناراض نہ ہونا اور نہ غصہ۔“ حیات نے تاکید کی۔  
”ایسی کیا بات ہے؟“ میں پورے دھیان سے اس کی بات سننے لگی۔

”میں تمہاری شادی کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ میں تنگ آ گیا روز کے لڑائی جھگڑوں سے، میں نے ہمیشہ تم سے محبت کی تمہیں چاہا اور آج بھی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ حیات کی بات نے میری بولتی بند کر ڈالی تھی۔ مجھے ایک دم بہت شدید غصہ آیا تھا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا اپنے بارے میں نہیں اپنی منکوہ کے بارے میں سوچو، خیر آج کے بعد تمہارا اور میرا کزن کے علاوہ کوئی رشتہ نہیں، مجھ سے دوبارہ بات کرنے کی کوشش بھی مت کرنا۔“ میں نے غصے میں کہہ کر فون بند کر دیا۔ میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اگلے روز میرا پیپر تھا اور میں اس نئی مصیبت میں پھنس چکی تھی۔

☆.....☆

پیپرز کی تیاری کافی اچھی طرح کی تھی اسی لیے حیات کی کسی بات کا اثر پیپر پر نہیں ہوا تھا۔ کہتے ہیں غصے میں انسان ہمیشہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے مگر میں

نے انجانے میں اپنا فائدہ کر ڈالا تھا۔ میں نے حیات کے فون کے بعد ساری کہانی علی کو سنا ڈالی تھی۔  
مگر جب میں گھر واپس آئی تو مجھے حمزہ کا میسج موصول ہوا جس میں لکھا تھا۔

”آئی ریلی لو یو لاریب! میں کل ہی ماما کو رشتہ لے کر تمہارے گھر پہنچ رہا ہوں۔ تمہارے جواب کا منتظر حمزہ۔“  
مجھے سمجھ ہی نہ آیا یہ سب میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے میں نے بھی جوابی میسج میں خوب سنا ڈالی تھیں اور اس بار بھی میں علی کو سب بتا چکی تھی۔ میں نے حیات اور حمزہ دونوں ہی سے قطع تعلق کر ڈالا تھا۔

میں نے ان دونوں کے بارے میں علی کے علاوہ کسی سے ذکر نہیں کیا تھا مگر ایک دن میری کزن مہک نے مجھ سے سوال کیا۔

”تمہاری حیات اور حمزہ کے ساتھ دوستی کس نوعیت کی ہے؟“ مجھے اس کی بات پر بے حد غصہ آیا۔  
”میری ان دونوں سے دوستی تھی اب نہیں ہے آج کے بعد مجھ سے ان لوگوں کا ذکر مت کرنا۔“ میں اس کو تنبیہ کرتی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ میری سمجھ سے باہر تھا کہ میری دوستی کو غلط رنگ کیوں دیا جا رہا تھا۔ میں اب اپنے سب ہی کزنز سے ریزو رہتی جا رہی وہ لڑکیاں ہوں یا لڑکے، ان سے ایک حد تک بات کرنی۔  
سال بھر بعد ہی حیات کی شادی کے انویٹیشن نے مجھے پرسکون کر ڈالا تھا اور ساتھ ہی گھر میں میری شادی کا ذکر بھی چھڑ چکا تھا۔ مجھے لگا اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ جس دن حیات کی شادی کی پہلی ڈھولکی تھی میں بھی خواتین کے ساتھ ڈھولکی میں انجوائے کر رہی تھی جب میرے پاس حیات کا میسج آیا۔

”مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“ میں اب کوئی نئی مصیبت نہیں پالنا چاہتی تھی اسی لیے میں نے جواب دیے بغیر میسج ڈیلیٹ کر ڈالا۔ اس وقت میں نہیں جانتی تھی کہ وہ میرے پیچھے کھڑا میری اس حرکت کو نوٹ کر چکا ہے۔ اس نے سب سے نظر بچا



کر میرے کان کے قریب سرگوشی نما انداز میں کہا۔  
 ”میں اوپر ٹیرس پر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ میں نے  
 حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر سمجھل کر کہہ ڈالا۔  
 ”میں نہیں آؤں گی۔“ کوئی بھی ہماری طرف  
 متوجہ نہ تھا۔

”تم آؤ گی۔ میرے لیے نہیں اپنے لیے میں تمہیں  
 کچھ سچائی بتانا چاہتا ہوں۔“ وہ اس یقین کے ساتھ کہہ کر  
 جا چکا تھا کہ میں ضرور جاؤں گی وہ یہ جانتا تھا اس کی اتنی  
 بات ہی مجھے تجسس میں مبتلا کر گئی اور میں نے اس کے  
 یقین پر مہر بھی لگا ڈالی۔ میں چھت پر چلی آئی۔ جہاں  
 دیوار کے ساتھ حیات نظریں جمائے گھڑا تھا۔ میں بھی  
 اسی طرف چلی آئی اور باہر لان کو دیکھنے لگی جہاں علی اور  
 حمزہ سمیت سب ہی مرد حضرات موجود تھے۔

”جلدی کہو کیا کہنا ہے۔“ میں نے ہی بات کا آغاز کیا۔  
 ”تم اب تک مجھے غلط سمجھتی ہو مگر آج ایک بات  
 واضح کر دینا چاہتا ہوں میں نے ہمیشہ اسی سے محبت  
 کی جس سے میری شادی ہو رہی ہے تم صرف میری  
 بہت اچھی کزن اور دوست ہو، اس سے زیادہ کچھ  
 نہیں مگر اپنے لیے کوئی بھی فیصلہ لینے سے پہلے علی کی  
 سچائی جاننا تمہارا حق ہے۔“ وہ پل بھر کے لیے رکا تھا  
 اور میں سانس روکے اس کی اگلی بات کی منتظر تھی۔

”میں نے خود سے تمہیں پر پوز نہیں کیا تھا۔ نہ ہی  
 میں ایسا چاہتا تھا مگر میں مجبور تھا علی نے مجھے بہت  
 سے واسطے اور قسمیں دے کر مجبور کر ڈالا تھا یہ صرف  
 علی کے دیاغ میں بھرا خناس تھا وہ یہ سمجھتا ہے کہ تم مجھے  
 پسند کرتی تھیں اور میرے نکاح کا سننے کے بعد تم نے  
 صرف اپنا دل بہلانے کے لیے اس کے پروپوزل کا  
 پازیٹو جواب دیا۔ وہ تمہیں آزمانا چاہتا تھا کہ تم اس  
 سے کتنی سچی محبت کرتی ہو اور جس وقت میں نے تمہیں  
 کال کی وہ میرے ساتھ تھا۔ میری اور تمہاری ساری  
 باتیں سن رہا تھا اور اس نے یہ سب صرف میرے  
 ذریعے نہیں بلکہ حمزہ کے ذریعے بھی کیا حمزہ نے بھی

اسی کے کہنے پر تمہیں میسج کیا اور مہک کو بھی اسی نے تم  
 سے معلوم کرنے کو کہا۔ مجھے لگا وہ مجھ سے کال کروا کر  
 مطمئن ہو گیا ہو گا مگر میں غلط سمجھا اس نے ایک بار  
 نہیں تمہیں کئی بار آزمایا اور وہ اب بھی پوری طرح تم  
 پر بھروسہ نہیں کرتا۔ میرا فرض تھا تمہیں حقیقت سے  
 آگاہ کرنا۔ آگے تم خود سمجھدار ہو۔ اپنے لیے بہتر سوچ  
 سکتی ہو۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے ایک نظر مجھ پر ڈال کر  
 جا چکا تھا اور میں وہاں پہروں بیٹھے یہ سوچتی رہی کہ اگر  
 اتنی بے یقینی ہے تو محبت کہاں ہے اس رشتے میں، یہ  
 محبت نہیں تھی بلکہ محبت تو کہیں نہیں تھی۔ میں نے اسے  
 اللہ کی طرف سے آزمائش جان کر صبر کر لیا تھا۔

گھر آ کر میں نے ایک ایک بات ماما کو بتا ڈالی تھی اور  
 ماما نے پاپا کو، میں نہیں چاہتی تھی کہ گھر میں کوئی لڑائی ہو،  
 اسی لیے پاپا نے میرا رشتہ اپنے دوست کے بیٹے سے  
 طے کر دیا گھر میں سب ہی کو بہت اعتراض ہوا ان میں علی  
 بھی شامل تھے۔ کئی دنوں تک علی کے میسج آئے جس کے  
 بدلے میں، میں نے صرف ایک ہی جواب دیا۔

”آپ سے میں نے محبت کرنا نہیں سیکھی تو کیا  
 ہوا، آپ نے مجھے سکھایا کہ محبت میں آزما تے کیسے  
 ہیں، اب میں کسی پر اندھوں کی طرح اعتبار نہیں کر  
 سکتی۔ آپ نے میرے مخلص دوستوں کو بھی میری نظر  
 میں بے اعتبار کر ڈالا۔ آپ نے مجھے قدم قدم پر  
 آزمایا جب کہ یہ حق تو اللہ نے بھی آپ کو نہیں دیا۔

”خیر جو ہوا سو ہوا دو ماہ بعد میری شادی ہے۔  
 شرکت ضرور کرے گا۔ کیونکہ میں بھی آپ کو تکلیف  
 میں دیکھنا چاہتی ہوں۔“ اس ملاقات کے بعد میں  
 نے اب تک کسی سے رابطہ نہیں رکھا۔ آج سب ہی  
 میری خوشی میں شریک ہونے والے ہیں اور میں ایک  
 بار پھر خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے زندگی  
 بھر آزمائے جانے سے بچا لیا اور رہا اپنوں پر  
 اعتبار..... تو وہ بھی آ ہی جائے گا۔

☆.....



مریم فاطمہ

افسانہ

# مغروب

ہوا میں خنکی تھی، سردی بہت تھی، اس نے ٹھنڈ سے بچنے کے لئے ایک شال اپنے جسم پر اوڑھ رکھی تھی، کاش کہ اس گھر میں ایک ہیٹر ہوتا لیکن ہیٹر تو دور کی بات لبا کے پاس تو انگیٹھی لینے تک کے پیسے نہیں تھے، اسے رہ کر اس بات کا فہم





پھر شادی والا دن بھی آ گیا، وہ خوب سچ سنور کر شادی کی شادی میں پہنچی، وہاں بریانی اور زردے سے اسے انصاف کرنا دیکھ کر اس کی ساری سہیلیاں اسے چھیڑتی رہیں، کھانے کے معاملے میں پیڑھتی رہیں۔  
دراصل گھر میں تو کبھی ایسا کھانا بنتا تھا، آج اتنا ذائقے دار کھانا کھا کر مزہ آ گیا تھا۔ اس کی سہیلی نجمہ نے تجسس سے پوچھا۔

”اقصی! ایک بات تو بتاؤ یہ سوٹ تم نے کب خریدا؟“ وہ جانتی تھی کہ اس کے گھر کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ نجمہ کیونکہ اس کی بہترین دوستوں میں سے تھی اس لئے اس نے اسے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

یہ سنتے ہی نجمہ اپنے دونوں ہاتھ گالوں پر رکھ کر توبہ تو بہ کہنے لگی۔

”یہ تو نے بہت غلط کیا قصی! تجھے نہیں کرنا چاہئے تھا۔“ نجمہ نے یہ بات شادی میں آئی اس کی باقی کی سہیلیوں کو بھی بتائی اور پھر تو یہ بات جنگل کی آگ کی طرح سارے میں پھیل گئی کہ یہ لڑکی چور ہے۔ وہاں موجود ہر عورت اسے تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگی۔

جب وہ گھر پہنچی تو معلوم ہوا کہ جو دو ہزار روپے اس نے ابا کی الماری سے چرائے تھے وہ دراصل انہوں نے اپنی دوائی کے لئے رکھ چھوڑے تھے اور اب وقت پردوائی نہ ملنے سے ان کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ انہیں سانس رک رک کر آ رہی تھی، وہ اور اماں انہیں فوراً سرکاری ہسپتال لے کر گئیں لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی، ان کی روح اس دنیا سے پرواز کر چکی تھی۔ اماں، ابا کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور ان کا بھی انتقال وہ گیا۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ اگر میں اس وقت ابا کی الماری سے پیسے نہ نکالتی تو یہ سب نہ ہوتا لیکن اب پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جو ہوتا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ میں پہلے اتنی غریب نہیں تھی جتنی کہ اب ہو گئی ہوں۔

ہو رہا تھا، پرسوں اسے اپنی دوست شازیہ کی شادی میں بھی جانا تھا، وہ سوچ رہی تھی کہ کون سے کپڑے پہنے گی، تمام فینسی سوٹ وہ اس کے گھر پہن کر جا چکی تھی، اس بار کوئی نیا ہونا چاہئے تھا لیکن نیا سوٹ وہ کہاں سے لائی۔ تب ہی اسے اس مسئلے کا حل سمجھ میں آیا، وہ کام سے فارغ ہو کر جلدی جلدی سیانے والی مریم کے پاس پہنچی۔ مریم سے اس کی زیادہ دوستی تو نہ تھی لیکن فی الحال اس کی مدد کی ضرورت تھی، ویسے بھی ان کے حالات اس سے کہیں بہتر تھے۔

”السلام علیکم مریم! کیسی ہو؟“ اقصی نے سلام کے بعد اس کا حال پوچھا۔

”وعلیکم السلام! ٹھیک ہوں، تم سناؤ کیسے یاد کر لیا۔“ مریم نے منہ چڑھا کر جواب دیا۔

”میں بھی ٹھیک ہوں، وہ دراصل میری دوست کی پرسوں شادی ہے تو میرے پاس کوئی کپڑے نہیں ہیں پہن کر جانے کے لئے، اگر تم اپنے پاس سے کوئی سوٹ دے دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

”نہ بابا میں تمہیں اپنا کوئی سوٹ نہیں دے سکتی، معاف کر دو برا نہ ماننا لیکن اس سے پہلے میں نے کنول کو اپنا سوٹ ایک دفعہ شادی میں پہننے کے لئے دیا تھا، اس نے شادی میں اس پر قورمہ گرا کے بالکل ماس مار دیا۔“ اس نے بڑی رکھائی سے جواب دیا۔

مریم نے کچھ اس طرح کہا تھا کہ پھر اقصی زیادہ دیر وہاں نہ رک سکی۔ بس خیدا حافظ کہہ کر واپس گھر آ گئی۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ ایسا کیا کروں کہ کہیں سے پیسے کا بندوبست ہو جائے۔

”اگر ادھار لیتی ہوں تو وہ چکانے کا مسئلہ۔“ آخر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ وہ چپکے سے اٹھ کر ابا کے کمرے میں آئی۔ الماری کی دروازہ کھولی اور ہزار ہزار کے دو کراے سے نوٹ نکال لئے۔ پھر وہ چپکے سے واپس اپنے کمرے میں آئی اور وہ پیسے اپنی کالج کی کتاب میں چھپا دیے۔

پھر شام کے وقت کسی بوتیک سے ایک چھاسا سوٹ خریدا گھر لا کر مل بلا سے کہا کہ کسی سہیلی نے تجھے میں دیا ہے۔

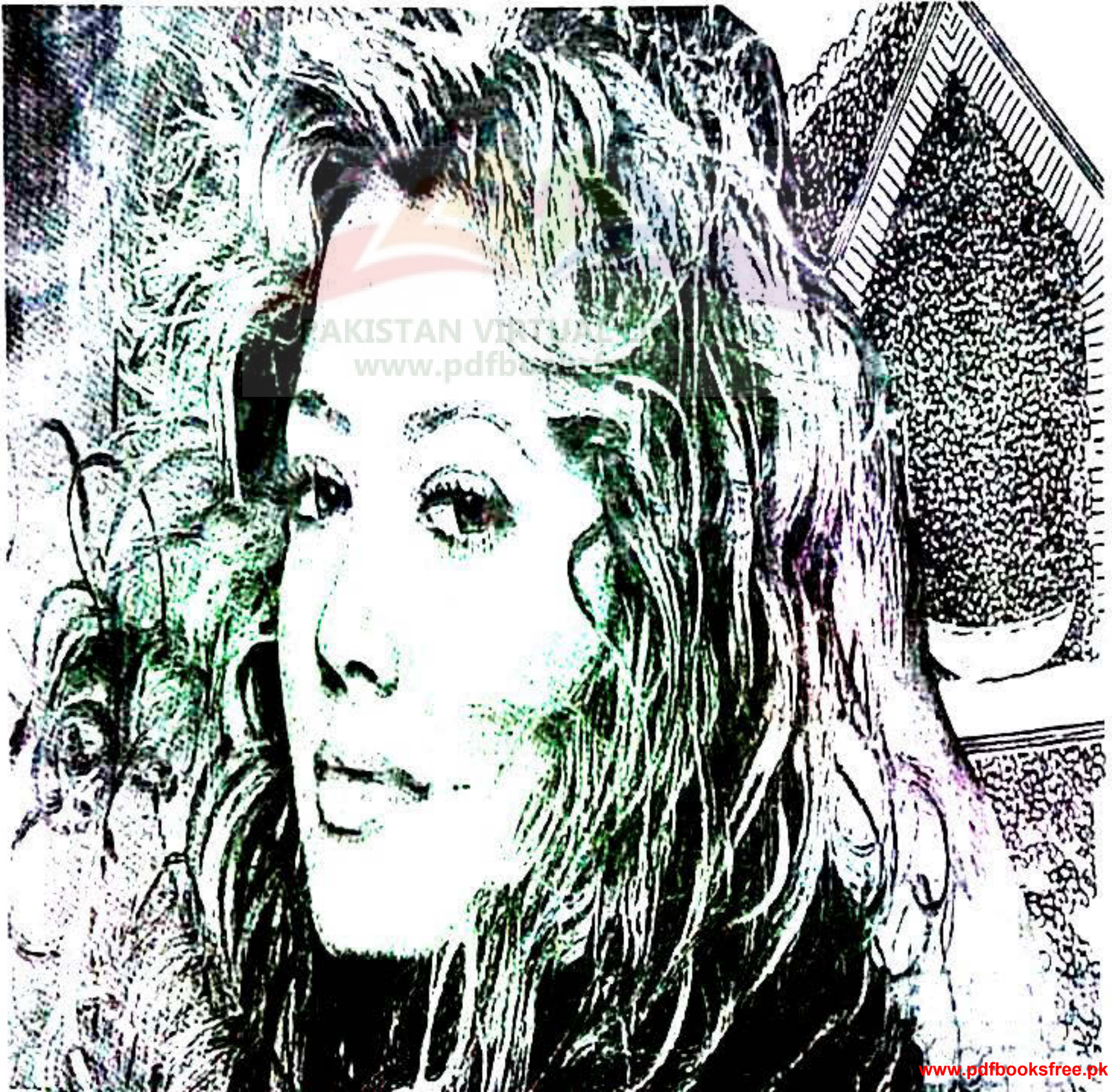


سحر بین

افسانہ

# چاندنی

سرخ پانچ انچ کی ہیل میں مقید اس کا نرم دودھ چھوتے سرخ گاؤں سے اجماع تھا اور وہ زمین بوس ہو  
ملائی جیسا سفید پاؤں اچانک اس کے پیروں کو جاتی، اگر اس کا مضبوط ہاتھ اسے تھام نہ لیتا تو۔





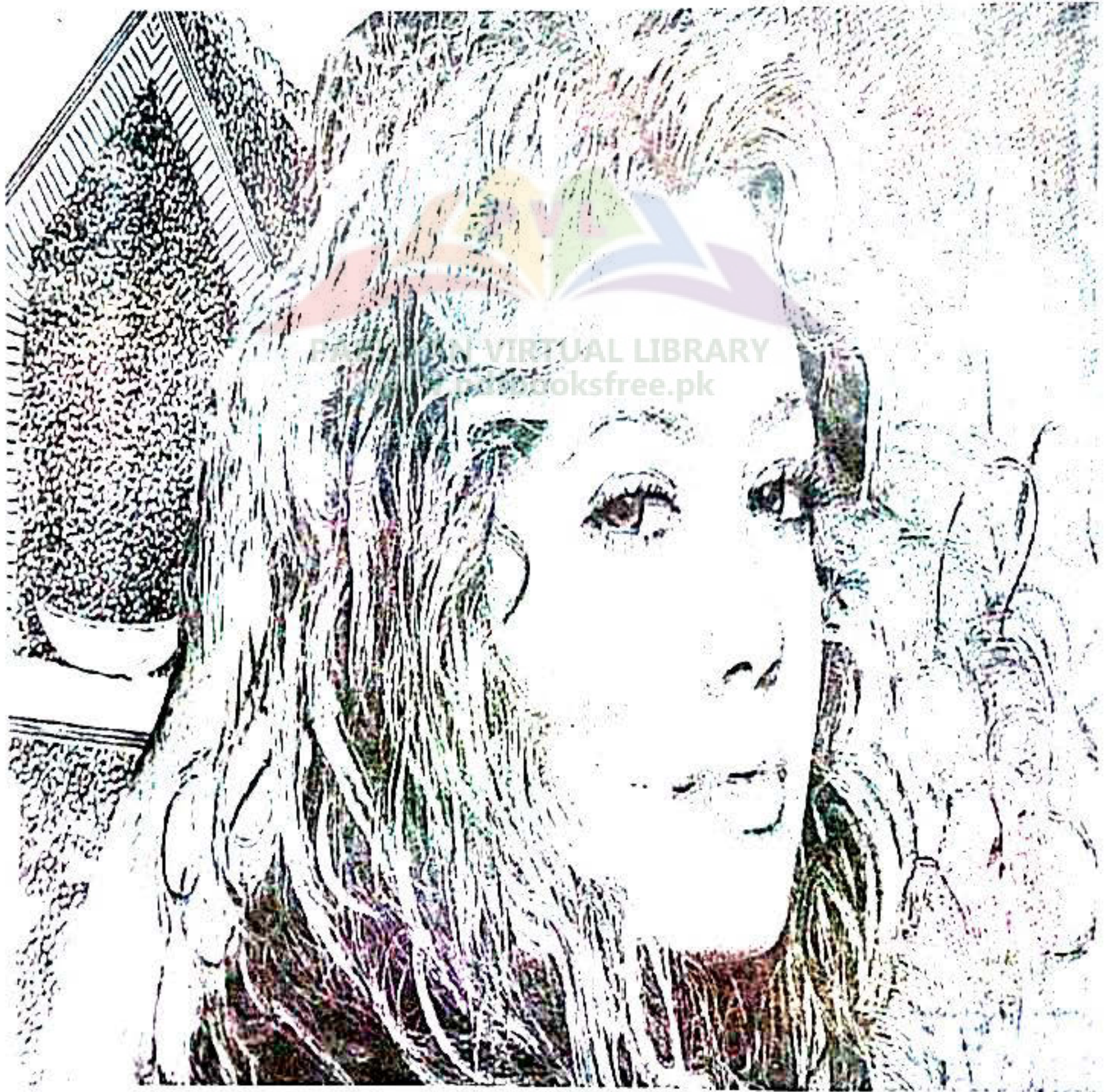
”بی کمر فل انوشہ“۔ ہلکی خفگی سے ڈپٹا گیا تھا۔ وہ ابھی کچھ لمبے پہلے ہی گاڑی سے اتری تھی اور وہ ابھی گاڑی سے اتر ہی رہا تھا جب اسے انوشہ کو گرنے سے بچانا پڑا۔ سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس اس کا بازو ابھی تک انوشہ کی کمر کے گرد جمائل تھا، جو بے اختیاری میں اس کی طرف بڑھا تھا۔

”اوہ صینکس میکال“۔ وہ حواس باختہ سی بولی۔ کچھ لمحے سر کے تھے اور وہ دونوں بے اختیار ہنس پڑے۔

یہ ایک اپر کلاس فنکشن تھا، نامعلوم کس چیز کا۔ یہ تو

ان دونوں کو بھی یاد نہیں ہوگا کہ وہ کسی برتھ ڈے پارٹی میں آئے یا کسی اینیورسری میں، کیا خبر کوئی شادی ہی ہو، انہیں بس پارٹیز اینڈ کرنے کا کرہ تھا۔ کہیں سے بھی انوی ٹیشن ہوتا ان دونوں کا ساتھ ساتھ جانا لازمی امر تھا۔

پارٹی کی رونقیں عروج پر تھیں جب میکال، انوشہ کی کمر میں بازو جمائل کیے قدم قدم بڑھ رہا تھا، انوشہ کی اکڑی ہوئی گردن اور ہونٹوں پر کھلتی دلفریب مسکراہٹ، سیلوئیس گاؤن سے جھانکتے اس کے نرم دودھیا بازو۔ اف... کمال کی جوڑی تھی دونوں کی، اور وہ دونوں اس سے بخوبی واقف تھے۔ بہت سی





سراہتی اور دیگر حاسد نگاہیں ان کی جانب اٹھی تھیں۔  
کچھ اٹھی نگاہوں میں بے فکری تھی جیسے انہیں ان کی  
لا جواب جوڑی سے غرض ہی نہ ہو۔

انوشہ اور میکال کا پہل ان کے سوشل سرکل میں  
بہت مشہور اور بے مثال مانا جاتا تھا، پچھلے کچھ برسوں  
سے وہ ایک ساتھ ہی دکھائی دیتے تھے اور جلد ہی  
شادی کا ارادہ رکھتے ہوئے ہمیشہ ایک ساتھ ہی دکھائی  
دینے کے تمنائی تھے۔

وہ دونوں اب کلوز فرینڈز سے بغل گیر ہونے  
میں مصروف تھے، دور نزدیک سے نظر آتے انکل،  
آنٹی کی طرف ”ہیلو“، ”ہائے“ کے تبادلے کے سلسلے  
بھی جاری تھے۔

”میکال! تم کب انجمنٹ فنکشن پر انوائسٹ کر  
رہے ہو؟“ ہاتھ میں ڈرنک کا گلاس تھا مے سب لیتی  
فارہ نے پوچھا تھا۔ انوشہ اور میکال کے لبوں پر بڑی  
محفوظ اور جاندار مسکراہٹ آئی تھی۔

”بہت جلد“۔ جواب سن کر جہاں فارہ کا قہقہہ  
بلند ہوا تھا وہیں انوشہ اور میکال سمیت باقی دوستوں  
نے بھی دل کھول کر اس کا ساتھ دیا تھا۔ رات گزرتی  
جاری تھی اور وہ مستیوں میں مصروف تھے۔

☆.....☆.....☆

انوشہ کے والد تین برس قبل ہی میکال کے پڑوس  
میں ایک بنگلے میں شفٹ ہوئے تھے۔ انوشہ اور میکال  
کے والد آپس میں دیرینہ اور گہرے دوست تھے۔  
دونوں گھرانوں کے آپس میں بہت اچھے اور گہرے  
مراسیم تھے، انوشہ کی ایک بڑی بہن بھی جو شادی  
شدہ تھی اور ادھر میکال بھی سب بہن بھائیوں میں سب  
سے چھوٹا تھا۔ تین برس قبل ہی ان دونوں کی دوستی ہوئی  
تھی، خوب انڈراستینڈنگ اور پھر بے تحاشا پیار جو  
گہری دوستی میں چھپا تھا اور پھر اچانک سے ظاہر ہوا  
اور وہ دونوں دل کھول کر اپنی ہر ہر کیفیت ایک دوسرے  
سے شیئر کرتے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔

انہیں زندگی بہت رنگین اور پیاری لگتی تھی۔ ہر  
طرف رنگ ہی رنگ تھے۔ بے فکری تھی، سب کچھ اپنا  
تھا، بے انتہا چاہنے والے لادول اور ان کا بے تحاشہ  
لگاؤ اور خلوص، ہاں سب اچھا ہی تھا، وہ ایک دوسرے  
سے مطمئن تھے، دونوں میں بلا کی انڈراستینڈنگ تھی،  
پسند یا پسند سب ملتی جلتی، کسی کو دوسرے سے شکایت  
نہیں تھی، غرضیکہ زندگی واقعی حسین تھی۔

☆.....☆.....☆

رات می نے ڈاننگ ٹیبل پر ہی انوشہ کو آپی کے  
دیور کی شادی میں شرکت کے لیے تیاری مکمل رکھنے کا  
کہہ دیا تھا۔ آپی بیرون ملک ہی اپنے سرال سمیت  
سیٹل تھیں اور وہیں ان کے دیور کی شادی ہونا تھی۔

مما پاپا نے بس تقریب میں ہی شرکت کرنا تھی،  
سوان کا اسے محض دو تین دن تک تھا جبکہ آپی انوشہ کو کم  
از کم پندرہ بیس دن اپنے پاس روکنے پر بضد تھیں۔  
میکال اسے ایئر پورٹ پر ہی آف کہہ آیا تھا۔

اور پھر وہ شادی میں مکمل طور پر مصروف ہو گئی۔  
اٹھارہ دن بعد وہ واپس آئی تھی، اس کا ارادہ میکال کو  
سر پرانہ دینے کا تھا، وہ اس کے کمرے میں گئی تھی مگر  
وہ تو گھر میں ہی موجود نہیں تھا، اسے خود کو میکال کا شام  
تک انتظار کرنے کے لیے تیار کرنا پڑا۔

رات ہوتے ہی وہ بغیر کھانا کھائے اس کے گھر  
تک آئی تھی، اس کا ارادہ آج میکال کے ساتھ ڈنر کا  
تھا، وہ اس وقت بھی گھر میں نہیں تھا۔ اسے سن کر  
افسوس ہوا۔ بھابیوں نے اسے کھانے پر روکا تھا مگر وہ  
باہر لان میں آ گئی۔

بظاہر تو وہ قدم بقدم لان مانے میں مصروف تھی  
مگر شدت سے میکال کی واپسی کی منتظر تھی۔ وہ اسے  
کال نہیں کرنا چاہتی تھی مگر... سر پرانہ کے چکر میں  
خود ہی پلکان ہوئے جا رہی تھی۔ وقت گزرنے لگا تھا،  
اس کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں، وہ لان میں رکھی چیر پر  
بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اس کے حواس بحال ہوئے تو اس



نے رات کی تاریکی کو مزید گہرا محسوس کرتے ہوئے بے اختیار وقت دیکھنے کو موبائل اٹھایا تھا۔ 12 بجنے کے قریب تھے، وہ آٹھ بجے کے قریب اس کے گھر آئی تھی، بے اختیار ہڑبڑا کر اٹھی۔

شاید میکال آگیا ہو اور اسے پتہ نہ چلا ہو، وہ بھاگتی رہا کشتی حصے کی طرف گئی تھی، ابھی تک چھوٹی بھابی اور بھائی لاؤنج میں موجود تھے، وہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔ موڈا یکدم بگڑا تھا، اور خراب موڈ کے ساتھ ہی وہ دونوں گھروں کی درمیانی دیوار میں موجود دروازے کی طرف بڑھی تھی۔

بڈروم میں جانے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک اسی متعلق سوچتی رہی تھی۔ جانے کب نیند آئی۔

صبح ناشتے کے بعد وہ پھر سے میکال کی طرف گئی۔ اسے امید تھی کہ وہ ابھی تک سویا ہوا ہوگا اور ہوا بھی یہی۔ انوشہ کے اٹھانے پر ہی وہ اٹھا تھا۔

”کہاں تھے کل کا دن؟“ اس کی کھلتی آنکھوں کو دیکھ کر وہ تیزی سے بولی، انداز ڈپٹنے والا تھا۔

”یہیں تھا۔“ وہ سادگی سے بولا تھا۔

”نہیں تھے یہیں۔“

”یس نہیں تھا یہاں۔“ وہ سابقہ لہجے میں بولا۔

”تو پھر کہاں تھے؟“

”لائگ ڈرائیو پر۔“

”ہوں... کیسی رہی پھر؟“

”اچھی تھی۔“ وہ مختصر جواب دے رہا تھا، انوشہ نے اس کے سنجیدہ سے لہجے کو قصداً نظر انداز کیا۔ یقیناً ابھی اس کا بولنے کا موڈ نہیں ہوگا۔ آخر ابھی تو اٹھا ہے۔

وہ اس کے سنجیدہ مزاج کو نظر انداز کر گئی تھی۔ وہ اس کے جانے سے جتنا بے قرار تھا اب واپس آنے پر ساری گرم جوشی مفقود تھی۔ مگر یہ باتیں نظر انداز کرنے کے لئے ہی وقوع ہوئی تھیں۔ یہ کوئی خاص معنی نہیں رکھتی تھیں۔ انوشہ اتنا گہرائی میں جا کر ہرگز نہیں سوچ رہی تھی۔ وہ انوشہ تھی اور وہ اس کا میکال، اور سب اچھا تھا۔

وہ اپنے مزاج کے مطابق بولنا شروع کر چکی تھی۔ وہاں شادی کے قصے، یہ، وہ، اس نے کہاں کہاں میکال کو زیادہ یاد کیا، کیسے لباس زیب تن کیے، اور وہ سن رہا تھا بس۔

☆.....☆.....☆

میکال اکثر گھر سے باہر رہتا تھا، اس کا موبائل ادھر تر آف ہی رہتا، انوشہ کال کرتی تو کاٹ دیتا، وہ حیران ہو رہی تھی اس کے رویے پر، شاید وہ اس سے ناراض ہو مگر کیوں؟

وہ اپنے رویے پر نظر ثانی کر رہی تھی، شاید اس سے کہیں کوئی غلطی ہو گئی ہو، مگر ایسا کہاں ہوتا تھا؟ وہ دوست تھے، ایسی غلطیاں کوئی معافی نہیں رکھتی تھیں، مگر میکال کی طرف سے لا پرواہی تھی کہ ہنوز برقرار، ہاں ایک بات کا اضافہ ضرور ہوا تھا اس لا پرواہی میں، وہ اب بالکل بھی اس سے نہیں ملتا تھا۔ وہ بے حد حیران تھی، بہت پریشان، وہ اپنی کزنز اور مشترکہ دوستوں سے بھی کچھ نہیں ڈسکس کر رہی تھی۔

ان دونوں کی ذہنی ہم آہنگی کا تو ایک زمانے میں چرچا تھا۔ پھر ان کے درمیان ایسی کسی صورتحال کا پیدا ہونا۔

وہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوئے جالی۔ پھر خود کو پرسکون کرنے کے لیے صرف آنکھیں موند لیتی۔

”ضرور کوئی مسئلہ ہے مجھے میکال سے ضرور ملنا چاہئے، ہو سکتا ہے اسے کسی اور حوالے سے کوئی ٹینشن لاحق ہو؟ وہ اس سے شیئر نہ کر پارہا ہو۔“

مگر وہ تو سب شیئر کرتے تھے پھر؟

وہ پھر سے روہانسی ہو جاتی۔ اس نے سوشل ویب سائٹس اور اس کے موبائل پر بے تحاشا پیغامات چھوڑے ہوئے تھے مگر جواب نہ دار۔

”میکال ایسا کیوں کر رہا ہے؟“

”وہ آخر ٹھیک تو ہے، خیریت سے؟“

”مجھے یقیناً انکل، آنٹی سے اس حوالے سے بات کرنا ہوگی، کیا خبر نہیں اس کی سرگرمیوں کا پتہ ہو۔“



وہ ایسی باتوں کو سوچتی ہوئی آنٹی کے سامنے بیٹھی تھی۔

”آنٹی! میکال کم کم نظر آتا ہے، کہاں ہوتا ہے وہ؟“ وہ سرسری سے انداز میں پوچھنے لگی۔ پہلے تو اس کے نہ ملنے کی وجہ ہر کوئی انوشہ سے پوچھا کرتا تھا مگر آج...

اف... یہ دن بھی دکھانا تھا قسمت نے، اس نے پانیوں سے بھری آنکھوں کو جھکانا مناسب سمجھا۔

”یہ انوشہ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ میکال کے علاوہ انوشہ کو ہی اس کے ہر ہر عمل کی خبر ہوتی ہے۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہنے لگیں۔

”جی“۔ وہ قصداً مسکرائی پھر گویا ہوئی۔ ”مگر کچھ دنوں سے میرا اس سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔“

”اچھا... وہ تو سارا دن گھر میں نہیں ہوتا، میں تو اس لئے انجان رہی کہ ایسا کون سا پہلی دفعہ ہو رہا ہے، وہ میچور ہے، اور آپ فرینڈز تو ویسے بھی اکثر گھر سے باہر ہی پائے جاتے رہے ہو، ہو سکتا ہے دوستوں کے ساتھ ہو۔“

آنٹی کہہ کر اٹھ گئیں۔ انہیں پارٹی میں جانا تھا۔ انوشہ کا دل بے تحاشا رونے کو چاہا تھا، کن دوستوں کے ساتھ؟

انوشہ سے زیادہ بہترین اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ ان کے مشترکہ دوست؟ وہ ان کے پاس بھی نہیں ہوتا۔ کوئی نیا دوست؟

مگر وہ اتنا اہم کیسے کہ انوشہ کہیں پیچھے چلی جائے۔ وہ کمرے میں بند ہو کر روتی رہی۔

دل میں میکال کے حوالے سے بہت سی فکریں تھیں۔ ”اللہ کرے وہ خیریت سے ہو۔“

اور پھر اس کی میکال سے ملنے کی دعائیں رنگ لے ہی آئیں۔

وہ اسے دیکھ چکی تھی، وہ ٹیرس پر کھڑی تھی میکال اپنے گھر کے گیٹ پر تھا۔ انوشہ نے بے اختیار ہاتھ ہلایا تھا اور وہ رک گیا۔ انوشہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی

اس تک پہنچی تھی۔

”میکال! کہاں تھے تم، میں اتنی ٹینشن میں تھی۔ اتنے دن، اف... مجھے تمہاری فکر ہو رہی تھی۔ تم بتا بھی کچھ نہیں رہے تھے، کال کاٹ دیتے، رپلائی نہیں کرتے، سب خیریت تو ہے ناں؟“ وہ بے اختیار اس کا بازو تھامے بولتی چلی گئی۔

”ہوں... سب خیریت ہے۔“ وہ نارٹل سے انداز میں بولا۔

”پھر...“

”کیا پھر؟“

”پھر رابطہ کیوں نہیں کر رہے تھے؟“

”ایسے ہی، میرا دل نہیں تھا رابطہ کرنے کو۔“

”میکال! پلیز تنگ نہ کرو۔ سچ سچ بات بتاؤ۔“

وہ زچ ہوئی۔

”تم پلیز مجھے تنگ نہ کرنا، میں قصداً تمہیں نظر انداز کر رہا تھا۔“ وہ کہہ کر آگے بڑھنے لگا۔

”کیوں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”دل کیا۔ آرام سے جواب آیا۔“

”تم پلیز مجھے تنگ نہ کرو۔“ وہ باقاعدہ منت کرنے لگی۔

”میں سیریس ہوں انوشہ۔“

”مگر کیوں؟“

”میری مرضی۔“

”کیا ہے تمہاری مرضی، بتاؤ پلیز۔“

”میں نہیں بتاؤں گا، مجھے آرام کرنے دو۔“ وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ بھی پیچھے آئی۔

میکال اسے تنگ کر رہا تھا بس، وہ دونوں ایک دوسرے کے جذبات کی شدت سے آگاہ تھے، وہ کچھ بھی آگے تک نہیں سوچ پائی، سوائے اس بات کے کہ وہ اسے تنگ کر رہا ہے بس۔

جلد ہی اس کی پریشانی تشویش میں بدلنے لگی تھی۔

”میکال! پلیز تنگ نہ کرو۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔



اس کے لیے مئے تھے۔ وہ سوچتی رہتی کیسے سب ٹھیک ہو جائے۔ وہ جاننے کی کوشش کرتی کہ میکال کے اس رویہ کی وجہ کیا ہے، مگر کچھ حاصل نہ ہوتا۔

وہ اس دن ضبط گنوا بیٹھی جب وہ اسے دستیاب ہوا تو وہ رونے لگ گئی، ہچکیوں سمیت روتی رہی، وہ جان نہ پائی میکال اسے دیکھ کر کیا سوچ رہا ہے۔

”میکال! اگر تم ناراض نہیں تو پلیز ناراض ہو جاؤ، روٹھ جاؤ، خفا ہو جاؤ، میں تمہیں مناتو لوں، مگر ایسا رویہ تو نہ رکھو فارگاڈ سیک میکال“۔ وہ روتی رہی۔

”تم بتاؤ دو ہوا کیا ہے، ٹھیک ہے اگر تم واقعی مجھے زچ کرنا چاہتے ہو تو کرلو، پلیز مجھ سے تعلق کیوں ختم کرنے پر تلے ہو“۔

”تم کہیں اور انٹر سٹڈ ہو گئے ہو؟“

”نہیں“۔

”پھر کیا وجہ ہے“۔

”میں بتانا ضروری نہیں سمجھتا“۔

اف اس کا قطعی لہجہ، کاش... وہ مرجائے۔ عجیب سی حسرت پیدا ہوئی تھی۔

”تم کیوں کر رہے ہو ایسا؟“ وہ خود کلامی کرنے لگی پھر وہ واپس پلٹی۔

ان کے درمیان بہت انڈرا سٹینڈنگ تھی، بہت دوستی، ان کا اسٹیشن بھی ایک جیسا تھا، ان کی لواستوری میں دور تک کسی ولن کا نشان نہیں تھا مگر پھر کیا ہوا؟

یہ کوئی نہیں جانتا، میکال کا رویہ کیوں بدلا؟

یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب نہ ہو۔

محبت اور بیوفائی میں ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔

محبت ”بے وجہ“ اگر ہو سکتی ہے تو بے وفائی کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

”تم بے وفا ہو“ وہ بڑبڑاتی تھی۔

ایک ایسا رشتہ جس کا اختتام ہوا تھا کیونکہ بے وفائی بے وجہ ہو جاتی ہے۔

☆.....☆.....☆

”انوشہ! تم مجھے مسلسل تنگ کر رہی ہو“، انوشہ نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

”کیا ہے تمہیں؟ پر ابلیم کیا ہے؟“ وہ زچ ہو گئی۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے مسلسل پریشان رہی تھی اور اب میکال اسے دستیاب ہوا تھا تو اس کا رویہ۔

”مجھے کوئی پر ابلیم نہیں، میرا دماغ چائے کی ضرورت نہیں“۔ وہ سرد مہری سے بولا۔

”تمہیں کوئی پر ابلیم ہے، بتاؤ مجھے“۔ وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔

”نہیں ہے کوئی بھی“۔

”میکال! پلیز یار بتاؤ کیا ہوا؟“ وہ منت کرنے لگی۔ دل ڈوبا جا رہا تھا۔

”کچھ بھی ہو، تمہیں کیا؟“ قطعی لہجہ۔

”تم ناراض ہو؟“

”نہیں ہوں“۔

”پھر تمہارا رویہ کیوں چنچ ہو گیا اچانک۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی، چلو شاید کوئی ہوئی ہو، آئی ایم سوری وہ کوئی بھی بات جو تمہارے اس بیوی کی وجہ ہے اس کے لیے سوری۔ پلیز مجھے مزید تنگ نہ کرو، سانس بند ہو رہی ہے“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”میں تمہیں تنگ نہیں کر رہا، نہ مجھے کوئی پر ابلیم ہے، نہ تمہیں سوری کی ضرورت“۔ وہ کہہ کر واش روم میں گھس گیا۔

انوشہ اس کے باہر آنے کا انتظار کرتی رہی پھر اس بات کو کچھ مزید وقت پر ڈالتے ہوئے مڑ گئی۔

☆☆☆☆☆

میکال کا رویہ بدستور وہی تھا، انوشہ بیک وقت بہت سے نئے جذبات احساسات سے روشناس ہو رہی تھی، نظر اندازی، سب سے برا اور مار ڈالنے والا احساس نظر انداز ہی تو ہوتا ہے، وہ ان دنوں اس احساس کوشدت سے محسوس کر رہی تھی۔

حیرت، صدمہ، تکلیف، پریشانی، سب احساسات



# صدائے صبح

رات کافی ڈھل چکی تھی، ہر طرف اندھیرے کا راج تھا، مگر وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ جب رات کی تاریکی اپنی آخری حد پر پہنچتی ہے تب ہی اجلی نکھری صبح کا آغاز ہوتا ہے۔ اللہ پر اعتماد اسی صبح کی





طرح ہوتا ہے جس سے پہلے رات کالی سیاہ چادر  
اوڑھے ہوتی ہے۔

”اللہ سوا کبر...“

”اللہ سوا کبر...“

درختوں پر میٹھی ہوئی چڑیوں کی چچہاہٹ،  
ٹھنڈی ملائم ہوا میں اور اذان کے کلمات کے ساتھ صبح  
کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ آواز اس محلے کی جامع مسجد کے  
امام صاحب حسن مصطفیٰ کی تھی۔ اذان تو موذن  
صاحب ہی دیتے تھے مگر کبھی کبھار امام صاحب کی بھی  
آواز گونجتی تھی۔

نماز اور قرآن پاک کی تلاوت کے بعد ناشتے  
سے فارغ ہو کر حب علی کالج جانے کے لئے تیار کھڑا  
تھا اور کالج بیگ اٹھا رہا تھا تب امام صاحب نے اسے  
پکارا۔

”سنو بیٹا!“

”جی ابو جی۔“ حب علی نے بیگ کو بائیں  
کندھے پر لٹکایا۔

”بیٹا! کالج سے واپسی پر میرے ساتھ اسٹور  
چلنا، مجھے کچھ سامان خریدنا ہے۔“ امام صاحب نے  
مسکراتے ہوئے جواب دیا۔





”اچھا ٹھیک ہے ابو جی! مگر ظہر کے بعد چلیں گے کیونکہ پھر مجھے بیٹھ کر اپنا اسائنمنٹ بھی مکمل کرنا ہے آج۔“ حب علی نے وجہ بتائی۔

”اچھا بچے۔“ امام صاحب نے اپنے سدا بہار نرم لہجے میں اس کی بات کی تائید کی اور اسے کالج کے لئے رخصت کیا۔

امام صاحب کو اپنے ذاتی کاموں کے لئے دوسروں کو تکلیف دینا اچھا نہیں لگتا تھا، اس لئے وقت ملنے پر خود ہی یا کبھی اپنے بیٹے حب علی کے ساتھ اسٹور چلے جاتے تھے اور سامان خرید لاتے۔

حب علی سیکنڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا، نماز روزے کا پابند، بہت خوش اخلاق، بالکل امام صاحب کی طرح۔ حب علی کی امی اتنا فرمانبردار اور نیک بیٹا پا کر ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرتیں اور اس کو نظر بد سے بچانے کے لئے ہر وقت کچھ سورتیں پڑھ کر اس پر دم کرتی رہتیں۔ اکلوتا بیٹا تھا، ماں باپ دونوں کی آنکھ کا تارا اور اوپر سے اس کی پرورش اتنے اچھے ماحول میں ہو رہی تھی، امی جی معلمہ اور ابو جی امام مسجد۔

”ابو جی! انٹر کے بعد سے میں بھی اذان دیا کروں گا۔“ اس نے لہجے میں زمانے بھر کی معصومیت سموتے ہوئے کہا۔

”ارے انٹر کے بعد کیوں بھلا؟ انٹر سے پہلے کیوں نہیں؟“ امام صاحب پچھلے کئی دنوں سے یہی جملہ اس کے سامنے دہراتے تھے اب بھی وہ یہ بول کر اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے زاویے کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔

جواب میں حب علی سر کھجا کر رہ گیا۔ کیونکہ یہ بات تو امام صاحب کی بھی ٹھیک تھی۔ وہ اتنی اچھی قرأت کرتا تھا اسکول سے لے کر کالج تک کئی انعامات جیت کر آیا تھا۔ کئی بار ابو جی کو اذان بھی سنا چکا تھا اور امام صاحب نے اس سے فرمائش بھی کی

تھی کہ اب وہ اذان دیا کرے مگر اس کی سوئی انٹر کے بعد یہ کروں گا، انٹر کے بعد وہ کروں گا یہی ایک کئی تھی اور کالج کی لائف ہوتی بھی تو کتنی پرسکون ہے ناں! نہ کوئی فکر، نہ ٹینشن، ساری فکریں تو اسی کالج لائف کے بعد سے ہی شروع ہوتی ہیں اور ذمہ داریاں بھی۔

یہ ان دونوں کی اسٹور سے باہر کی گئی گفتگو تھی۔ اب سامان کا تھیلا بائیک پر رکھ کر انہوں نے گھر کی راہ لی۔

دن گزرتے گئے، امتحانات سر پر آ گئے، امتحانات ہو گئے تو پھر رزلٹ کا انتظار اور حب علی کی وہی رٹ کہ ”اذان میں انٹر کا رزلٹ آنے کے بعد دوں گا، ابھی میں چھوٹا ہوں۔“

وہ اتنی معصومیت سے کہتا کہ امام صاحب کو اس پر بے تحاشا پیارا آتا تھا۔

دراصل حب علی اذان دینے کو بہت بڑی ذمہ داری سمجھتا تھا اور خود کو اس بڑی ذمہ داری کے سامنے بہت چھوٹا تصور کرتا تھا۔

ہر جمعرات کو مسجد کے احاطے میں بنے مدرسے میں وہ ناظرہ سیکشن کے بچوں کو درس دیتا تھا۔ وضو کے طریقے سکھاتا تھا، ناظم صاحب نے خاص اس کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ ہر جمعرات کو مدرسے میں بچوں کو درس دیا کرے گا۔ نعتیں پڑھنا، قرأت سکھانا، وضو کا طریقہ سکھانا، نماز سکھانا، یہ کام وہ اپنی خوشی سے کرتا تھا اور یہ سب کرتے ہوئے اسے راحت ملتی تھی مگر سارے لاڈ پیار وہ امی جی اور ابو جی کے سامنے دکھاتا تھا مگر مسجد کے اور دیگر امور میں بالکل ایک ذمہ دار شخص کی طرح سارے کام انجام دیتا تھا۔

☆.....☆.....☆

جب انٹر کا رزلٹ آیا سب کتنا خوش تھے۔ پھر



شام کو امام صاحب حب علی کو اس کا گفٹ دلانے اسی اسٹور پر گئے۔ یہ ان کے علاقے سے تھوڑا دور ایک سپر اسٹور تھا۔ یہاں سے راشن، گفٹ، برتن، ضرورت کی ہر چیز ملتی تھی۔ حب علی اپنا من پسند گفٹ یا کر بہت خوش تھا اور امام صاحب کو اس بات کی خوشی تھی کہ آج حب علی کی اذان کی آواز فضاؤں میں گونجے گی۔

وہ دونوں اسٹور سے باہر بایک پر بیٹھ کر بس ابھی تھوڑا ہی دور گئے تھے کہ ایک نقاب پوش نے بندوق دکھا کر ان کا راستہ روک لیا اور اگلے ہی لمحے ان سے بایک چھیننی چاہی اور دوسرا نقاب پوش اسی گلی کے نکل پر کھڑا اسے جلدی جلدی کا اشارہ کر رہا تھا۔ دونوں نقاب پوش گھبرائے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ اس نقاب پوش کی بندوق کا رخ حب علی کی طرف تھا امام صاحب اور حب علی دونوں اس اچانک صورتحال پر بوکھلا گئے تھے۔ بیٹے کی محبت کے آگے امام صاحب بایک سے اتر آئے اور حب علی کو بھی اترنے کا اشارہ کیا۔ اگر وہ اکیلے ہوتے تو کبھی بندوق کے ڈر سے بایک ان لٹیروں کے حوالے نہ کرتے۔

اچانک گلی کے کنارے کھڑا اس کا ساتھی بھاگ کر دوسری طرف جانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا، اُس کی اس حرکت پر ان دونوں کے پاس کھڑا نقاب پوش مزید گھبرا گیا کیونکہ وہاں سے اس کا اکیلا بھاگ جانا اس پلان میں تو شامل ہی نہیں تھا۔ وہ اسی گھبراہٹ کے عالم میں ان دونوں پر بندوق تانے روڑ ہی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ابھی اس کا ساتھی آئے گا مگر اس کی گھبراہٹ مزید بڑھ گئی جب پیچھے سے اسے انسپکٹر اکرم نے گردن سے دبوچا تھا۔

”لگتا ہے اس علاقے میں نئے آئے ہو؟“

انسپکٹر اکرم نے اس کے ہاتھ سے بندوق چھینتے ہوئے اس کے حلیے کا جائزہ لیا۔ وہ نقاب پوش کاپٹن لگا۔ نظریں اس کی بار بار سڑک کی جانب اٹھیں اور ناکام پلٹ آئیں۔

”السلام علیکم امام صاحب!“ انسپکٹر اکرم نے سعادت مندی سے سلام کیا۔

”آپ فکر نہ کریں آرام سے گھر جائیں، اس سے تو ہم نمٹ لیں گے۔“ انسپکٹر اکرم نے امام صاحب کی پریشانی دور کرتے ہوئے کہا۔ وہ ان کو جانتا تھا اور ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اکثر وقت نکال کر ان کے درس اور خطبے میں شریک ہوتا تھا۔

اسی لمحے روڈ سے ایک پولیس کی گاڑی نمودار ہوتی اسی سمت چلتی ہوئی ان کے قریب آئی۔

”ڈالو اسے بھی۔“ انسپکٹر اکرم نے اپنے مخصوص کڑک دار لہجے میں گاڑی میں بیٹھے اپنے ساتھی افسر سے کہا۔ اس گاڑی میں اس نقاب پوش کا وہ ساتھی بھی بیٹھا تھا جو دراصل پولیس کی گاڑی کو دیکھ کر بھاگ گیا تھا، مگر قانون کے ہاتھ تو لمبے ہوتے ہیں سو وہ اور اس کا ساتھی پکڑے گئے۔

”اللہ ہوا کبر...“

”اللہ ہوا کبر...“

عشاء کے وقت مسجد سے اذان کی صدا بلند ہو رہی تھی مگر اب کی بار آواز نہ موزین صاحب کی تھی نہ امام صاحب کی بلکہ حب علی کی تھی اور اس کی پہلی اذان میں ایک خاص جذبہ تھا، احساس تشکر تھا، وہ آج ایک آفت سے صحیح سلامت بنا جان و مال کے نقصان کے بچ آیا تھا اور یہی سچ ہے اللہ بے شک بہت بڑا ہے۔ بس اس کو پکارنے کے لئے نیت میں سچائی اور بھروسہ شامل ہونا چاہئے اور اب وہی سچائی اور بھروسہ اس کی آواز میں رچ بس گیا تھا اور اس کے من کی صدا بن گیا تھا۔

☆.....☆.....☆



# ایک نئی عفت

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کے دور میں بھی سنڈریلا  
جیسی کہانیاں موجود ہیں۔ عفاف ایک حقیقی کردار ہے  
تھوڑی سی رد و بدل کے ساتھ میں نے یہ کہانی لائف  
بوائے شیپو کے حوالے سے تحریر کی ہے۔ اس کو پڑھیے





اور سند یہ ضرور لکھتے۔

۱۸۸

ایک عفاف تھی۔ اس کا خواب تھا کہ وہ کسی خوب صورت شہزادے سے شادی کرے۔ لیکن اس کی سوتیلی ماں بہت زیادہ ظالم تھی اور عفاف کو بہت زیادہ ظلم اور تکلیفیں دیا کرتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عفاف کا باپ مرتے وقت ساری دولت عفاف کے نام کر کیا تھا۔ عفاف بہت زیادہ خوب صورت، ذہین اور ایماندار لڑکی تھی۔ اس کا ایمان تھا کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ملتی ہے جب کہ اس کی

سوتیلی بہن اس سے اس بات پر حسد کیا کرتی۔ دولت کے لالچ نے اس کی بہن اور ماں کو بہت زیادہ لالچی بنا دیا تھا۔ ہر وقت وہ اسی فکر میں رہتیں کہ کسی طرح عفاف کی دولت حاصل کر لی جائے۔ اس بار بھی انہوں نے ایک پلان بنایا۔ گھر سے پروگرام بنا کر دوسرے شہر لاہور جانے کا۔ عفاف کو بھی اپنے ساتھ بڑی محبت سے لے کر چلیں اور کہا کہ خالہ کے گھر جا رہے ہیں۔ عفاف بے چاری ان کی باتوں میں آگئی اور اپنا سامان جلدی جلدی پیک کر کے ٹرین کے ذریعے کراچی سے لاہور کے لیے روانہ ہو گئی۔





اسٹیشن قریب آنے پر اس کی سوتیلی ماں نے تھرماں میں سے چائے نکالی، عفاف کو دی اور خود بھی پینے لگی۔ چند لمحوں میں ہی عفاف گہری نیند سو گئی۔

ٹرین اسٹیشن پر رک گئی۔ عفاف کی سوتیلی ماں اور بہن، عفاف کو ٹرین میں سوتا چھوڑ کر اتر گئیں۔ کچھ دیر بعد ٹرین روانہ ہو گئی۔ جب عفاف کی آنکھ کھلی تو وہ رونے لگی اور لوگوں سے پوچھنے لگی۔ ”میری امی اور بہن کہاں گئیں اور یہ کون سا اسٹیشن ہے؟“

”بی بی اکلہ اسٹیشن لاہور کا ہے آپ کی امی اور بہن بہت پہلے اتر گئیں۔ آپ بہت گہری نیند سو رہی تھیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ ان کی بیٹی ہیں ورنہ میں آپ کو اٹھا دیتی۔“ ایک عورت بولی۔

وہ روئے جا رہی تھی اور کوئی اس کی باتوں پر دھیان نہیں دے رہا تھا۔ اسٹیشن آگیا وہ اپنا بیگ اٹھا کر نیچے اتر آئی۔ آنسو پونچھ کر اس نے ارد گرد دیکھا اس کا اپنا کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ جو نبی دو چار قدم وہ آگے بڑھی سامنے سے آتے ہوئے شخص سے وہ بری طرح ٹکرا گئی۔

”میم! آپ دیکھ کر چلیں کیا کر رہی ہیں آپ؟“ وہ چونک کر بولا اور وہیں پر تھم سا گیا۔ وہ بغور عفاف کو دیکھ رہا تھا جب کہ عفاف کے آنسو تیزی سے بہہ رہے تھے۔

”کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟ آپ رو کیوں رہی ہیں؟“

وہ بمشکل اسے اپنی رواد سنا سکی۔

”اوکے آپ گھبرا میں نہیں، آپ اپنا کانیکٹ نمبر دیں۔“

”ہاں ہاں میں امی کا نمبر دیتی ہوں۔“ وہ جلدی سے بولی۔

تبھی سامنے کھڑے شخص نے اپنے سیل سے کال ملائی اور بولا۔ ”یہ تو آف جا رہا ہے۔ آپ تھوڑی دیر یہاں بیٹھ کر ویٹ کریں میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

”میں یہاں آپ کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتی ہوں؟“ وہ گھبرا کر بولی۔

”میم! آپ یہاں اکیلے ہی بیٹھیں میں کچھ فاصلے پر بیٹھ جاتا ہوں جب تک آپ اپنا نمبر ٹرائی کرتی

رہیں۔“ اس نے اپنا سیل اسے تھما دیا۔

کافی دیر بعد بھی فون ریسو نہیں ہوا تو بے بسی سے اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔

”میم! آپ کا یہاں اس طرح سے بیٹھنا صحیح نہیں ہے۔ آپ اکیلی ہیں بہتر یہ ہے کہ آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں یا جہاں آپ کہیں میں آپ کو وہاں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“

”مجھے تو یہاں کا کچھ نہیں پتا میں تو امی کے ساتھ ان کی کزن کی بیٹی کی شادی میں آرہی تھی یہاں۔“ عفاف بولی۔

”بہتر یہ ہے کہ آپ چھ گھنٹے بعد کراچی جانے والی ٹرین سے واپس چلی جائیں میں آپ کے ٹکٹ کا بندوبست کر دیتا ہوں۔“

”نہیں میں اکیلے نہیں جاسکتی۔“

”پلیز میم! اتنی دیر سے ہم ساتھ ہیں میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“ تبھی اس نے آہستہ سے اپنا نام بتا دیا۔

”مجھے شہریار کہتے ہیں۔“ وہ بھی جواباً اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔

”پلیز اب آپ اس طرح سے روئیں مت لوگ مڑ مڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ گھر چلیں میری والدہ کی بار بار کال آرہی ہے۔ آپ چاہیں تو امی سے بات کر سکتی ہیں۔ آپ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ سفر کر سکیں اس وقت یہاں پر رک سکیں۔“ پھر اس نے اس کی بات اپنی والدہ سے کروادی اور پھر وہ اس کے ساتھ بیگ اٹھائے چل دی۔

شہریار کے گھر میں بھی لوگ موجود تھے۔ سب اس کی بات سن کر اس سے ہمدردی کرنے لگے تھے۔ سب کو اس نے بتا دیا تھا کہ اس کی والدہ سوتیلی ہیں اور وہ اسے ٹرین میں چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔

بار بار وہ یہی کہہ رہی تھی کہ ”مجھے کراچی پہنچا دیں۔“ شہریار کی امی بڑے راحت رساں لہجے میں بولیں۔



”کیسا لگ رہا ہے تمہیں یہ ڈریس۔“  
 ”اچھا ہے مگر مجھے یہ پیرٹ گرین اچھا لگ رہا ہے۔“ اس نے بہت قیمتی سوٹ کی طرف اشارہ کیا۔  
 شہریار رخ پھیر کر مسکرایا۔ حور یہ نے دیکھا اور پھر شہریار سے بولی۔

”کیوں بھائی جان! لے لوں یہ؟“ شہریار نے اشارات میں سر ہلایا تو انہوں نے وہ ڈریس لے لیا اور پھر گھر کی طرف لوٹ آئے۔

☆.....☆

شام میں حور یہ نے اس سے پوچھا۔ ”ہم لوگ تو سب چلے جائیں گے مہندی میں کم یہاں اکیلے کیسے رہو گی۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔“  
 ”لوگ کیا کہیں گے؟“ عفاف بولی۔

”کچھ نہیں آپ ہماری مہمان ہیں اور کیا کہیں گے لوگ۔“  
 ”لیکن میرے کپڑے ٹھیک نہیں ہیں۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”تمہارا ڈریس تو یہ رہا۔“ وہ ہنگر میں پیرٹ کر رہی تھیں۔  
 ”یہ تو تمہارا ہے۔“ عفاف نے حور یہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں امی نے آپ کے لیے یہ ڈریس منوایا تھا۔“  
 ”میرے لیے.....!“ وہ حیرت سے حور یہ کو دیکھ رہی تھی۔

”ویسے بھی یہ تمہاری پسند ہے تمہارے لیے ہے اور یہ تم پر اچھا بھی لگے گا۔ عجیب اتفاق ہے بھائی کو بھی یہ رنگ بہت پسند ہے بانی داوے تمہارا اشار کیا ہے؟“ حور یہ نے عفاف سے پوچھا۔  
 ”لیو۔“

”او..... بھائی کا بھی لیو ہے۔“ حور یہ ہنس کر بولی۔  
 عفاف جھینپ گئی۔ تبھی شہریار روم میں آیا تھا۔ پیرٹ گرین ڈریس پر اس کی نظر رک گئی۔ اس نے مڑ کر

”دیکھو بیٹا! ہمارے بہت ہی قریبی رشتے داروں کی شادی ہے۔ ہم دو چار دن تک گھیں نہیں جاسکتے اور میں کسی کے ساتھ تمہیں اکیلا نہیں بھیجوں گی۔“  
 ”میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ میں آپ کو ہمیشہ کے لیے روک لوں۔“ تبھی شہریار کی بہن حور یہ بولی۔  
 ”کوئی بات نہیں آپ ہمارے ساتھ ہمارے گھر کراچی چلیں۔“ عفاف بولی۔

”نی الحال تو آپ ہماری مہمان ہیں۔ اب آپ میری چھوٹی بہن بن کر ہمارے ساتھ رہیں۔“ شہریار کی بھابی بولیں۔ امی جان بھی بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔

☆.....☆

دوسرے دن کی بات ہے۔  
 ”امی! لڑکی ہے تو بڑی پیاری یوں بھی شہریار کو کوئی لڑکی پسند نہیں آتی۔ آپ اس کے بارے میں شہریار سے پوچھیں اس کی کیا رائے ہے۔“ حور یہ نے کہا۔  
 ”کیسی باتیں کرتی ہو، کون ہے، کہاں سے آئی ہے، کون جانے۔ صرف شکل و صورت نہیں حسب و نسب بھی دیکھا جاتا ہے۔“ امی جان آہستہ سے حور یہ کو سمجھاتے ہوئے بولیں۔

”امی! آج ہم سب مہندی میں جا رہے ہیں اس کو بھی ہم لوگ لے کر جائیں گے۔ کیوں ناں اس کو کوئی اچھا سا ڈریس دلوا دیا جائے۔“  
 ”کیوں نہیں بیٹا یہ تو نیکی ہے وہ تو ہماری مہمان ہے اور وہ پریشان بھی ہے اللہ نیکیوں کا صلہ نیکی سے ہی دیتا ہے۔ تم اس کی مدد کرو گی اللہ تمہارے لیے رستے بنائے گا۔“

پھر حور یہ گھمانے کے بہانے عفاف کو باہر لے گئی اور کہا۔ ”چلو تمہیں لاہور کی سیر کرواؤں۔“

”میں آج کی تقریب کے لیے ایک ڈریس لینا چاہتی ہوں کیا تم اس میں میری مدد کرو گی۔“ حور یہ بولی۔  
 ”شیور کیوں نہیں۔“ عفاف بولی۔ پھر حور یہ نے ایک بوتیک سے ڈریس پسند کیا اور عفاف سے بولی۔



عفاف کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شوخ سی لہر عفاف کو نظر آئی وہ جھینپ کر رخ پھیر گئی اور پھرتیار ہونے کے لیے اس نے اپنا بیگ کھول کر اپنا شیمونکا لالا اور واش روم کی جانب بڑھ گئی۔ جب وہ باہر آئی تو پورا کمرہ مہک رہا تھا۔

☆.....☆

رات میں مہندی کی بڑی گہما گہمی تھی۔ عفاف پر وہ رنگ بہت سوٹ کر رہا تھا۔ شہریار نے ایک نظر چوری سے اسے دیکھا اور پھر رخ پھیر لیا۔ کچھ اس طرح سے کہ عفاف کو محسوس بھی نہ ہوا۔ سب تیار ہو کر جب ہال پہنچے سب بڑی گرجوشی سے ملے۔ ہر کوئی اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ یہ کون ہے؟

”یہ میری دوست ہے۔“ حور یہ ہر ایک کو جواب دیتی رہی۔ سبھی نے یہ بات محسوس کی کہ شہریار بار بار کسی نہ کسی بہانے سے عفاف کے قریب چلا آتا۔ اس کے مہکتے ہوئے بال اسے بار بار ٹریکٹ کر رہے تھے۔

”عفاف! تم نے کون سا پر فیوم لگایا ہے۔“ حور یہ پوچھنے لگی۔

”نہیں میں نے کوئی خوشبو نہیں لگائی۔“ عفاف نے جواب دیا۔

”تمہارے بال بڑے شائین کر رہے ہیں جب تم آئیں تو روف لگ رہے تھے۔“

”میں تو بس ”لائف بوائے شیمو“ استعمال کرتی ہوں۔“ وہ عام سے لہجے میں بولی۔

”لیکن تمہارے بال تو بہت شائین کر رہے ہیں۔“

بھابی نے بھی حور یہ کی بات کی تائید کی تو وہ ہنس پڑی۔

”امی..... امی سامنے والی ٹیبل پر دیکھیں عفاف بیٹھی ہے۔“ سحرش بولی۔

”پاگل ہو گئی ہے اسے تو میں ٹرین میں چھوڑ کر آئی ہوں۔ وہ یہاں کہاں سے ہمارے رشتے داروں میں آجائے گی۔“

”سچ امی! وہ دیکھیں وہ بیٹھی ہے۔ اپنے پسندیدہ رنگ کے ڈریس میں۔“

”تم پاگل تو نہیں ہو گئیں اتنا قیمتی ڈریس وہ کہاں سے لائے گی۔“ انہوں نے جلدی سے اپنا چشمہ درست کر کے اس جانب دیکھا۔

”ارے ہاں یہ تو ہو ہو عفاف لگ رہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی جڑواں بہن ہو۔ ورنہ وہ یہاں کہاں سے آجائے گی چلو چل کر پوچھتے ہیں کہ ماجرا کیا ہے۔“

”حور یہ ارد گرد نظر رکھو شہریار کے لیے کوئی لڑکی پسند آئے تو مجھے بھی دکھانا۔“ شہریار نے ماں کی بات سنی تو اس نے مسکرا کر عفاف پر نظر ڈالی۔

”عفاف.....!“ اس کی سوتیلی ماں قریب آ کر بولی۔

”امی آپ.....!“ عفاف گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

سبھی ایک دوسرے کو حیرانگی سے دیکھ رہے تھے۔ شہریار کی امی کے بھی عفاف کے والدین جاننے والے تھے۔

”ارے یہ ہماری عفاف ہے۔“ شہریار کی امی نے اٹھ کر جھٹ عفاف کو سینے سے لگالیا۔

”سچ ہے جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں میں سوچا کرتی تھی کہ وہ ننھی سی بچی اب کتنی بڑی ہو گئی ہوگی۔“

میں تو اس کا نام تک بھول گئی تھی۔ آج اللہ نے ہمیں اچانک ملوادیا۔ برسوں پہلے جب یہ پیدا ہوئی تھی تو

میں نے اسپتال میں بھائی سے شہریار کے لیے اسے مانگ لیا تھا۔“ عفاف کی سوتیلی ماں کا چہرہ اتر گیا۔ وہ کچھ

بھی نہ بول سکیں سحرش نے حسرت بھری نظر شہریار پر ڈالی۔

جب گھر واپسی کے لیے سب گاڑی میں بیٹھ رہے تھے تو شہریار دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول

کر عفاف جب اندر بیٹھ رہی تھی تو شہریار آہستہ سے بولا۔

”عفاف! تم بہت ڈیفرنٹ ہو دوسروں سے۔“

”میں نہیں.....“ اس نے اپنے شانوں پر لہراتے خوشبو سے مہکتے بالوں کو جھٹکتے ہوئے بولا۔

”سارا کمال لائف بوائے شیمو کا ہے جس نے آپ کو میرا دیوانہ بنا دیا۔“ اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

☆.....☆



## فَضائلِ قرآن

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَا بُدَّ لَكُمْ﴾

- ★ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن شریف کو سیکھے اور سکھائے۔
- ★ حق سبحانہ و تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ جس شخص کو قرآن شریف کی مشغولی کی وجہ سے ذکر کرنے اور دعائیں مانگنے کی فرصت نہیں ملتی، میں اس کو سب دعائیں مانگنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ شانہ کے کلام کو سب کاموں پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی کہ خود حق تعالیٰ شانہ کو تمام مخلوق پر۔
- ★ حسد و شخص کے سوا کسی پر جائز نہیں۔ ایک وہ جس کو حق تعالیٰ شانہ نے قرآن شریف کی تلاوت عطا فرمائی اور دن رات اس میں مشغول رہتا ہے دوسرے وہ جس کو حق سبحانہ نے مال کی کثرت عطا فرمائی اور وہ دن رات اس کو خرچ کرتا ہے۔
- ★ حق تعالیٰ شانہ اس کتاب یعنی قرآن پاک کی وجہ سے کتنے ہی لوگوں کو بلند مرتبہ عطا کرتا ہے اور کتنے ہی لوگوں کو پست و ذلیل کرتا ہے۔
- ★ قیامت کے دن صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور بہشت کے درجوں پر چڑھتا جا۔ اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا تھا۔ پس تیرا مرتبہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔
- ★ جو شخص ایک حرف کتاب اللہ کا پڑھے اس کے لئے اس حرف کے عوض ایک نیکی اور ایک نیکی کا اجر دس نیکی کے برابر ملتا ہے۔
- میں نہیں کہتا کہ سارا (الم) ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف، میم ایک حرف ہے۔
- ★ جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر عمل کرے اسکے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا جسکی روشنی آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ ہوگی اگر وہ آفتاب تمہارے گھر میں ہو۔ پس کیا امان ہے تمہارا اس شخص کے متعلق جو خود حامل ہے۔
- ★ جس شخص نے قرآن پڑھا پھر اس کو حفظ یاد کیا اور اس کے حلال کو حلال جانا اور حرام کو حرام حق تعالیٰ شانہ اس کو جنت میں داخل فرمادیں گے اور اس کے گھرانے میں سے ایسے دس آدمیوں کے بارے میں اس کی شفاعت قبول فرمادیں گے جس کے لئے جہنم واجب ہو چکی ہو۔
- ★ جس شخص کے قلب میں قرآن شریف کا کوئی حصہ بھی محفوظ نہیں وہ بجزل ویران گھر کے ہے۔
- ★ دلوں کو بھی زنج لگ جاتا ہے جیسا کہ لوہے کو پانی لگنے سے زنگ لگتا ہے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ ان کی صفائی کی کیا صورت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ موت کو اکثر یاد کرنا اور قرآن پاک کی تلاوت کرنا۔
- ★ تم لوگ اللہ جل شانہ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں تقرب اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے جو خود حق سبحانہ سے نکلے ہو یعنی کلام پاک۔
- ★ جو شخص ایک آیت کلام اللہ کی سنے اس کیلئے دو چاند نیکی لکھی جاتی ہے اور جو تلاوت کرے اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگا۔
- ★ کلام اللہ کو آواز سے پڑھنے والا علانیہ صدقہ کرنے والے کے مشابہ ہے اور آہستہ پڑھنے والا خفیہ صدقہ کرنے والے کی مانند ہے۔
- ★ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک کلام پاک سے بڑھ کر کوئی سفارش کرنے والا نہ ہوگا نہ کوئی نئی نہ فرشتہ وغیرہ۔
- ★ اگر تو صبح کو جا کر ایک آیت کلام اللہ شریف کی سیکھ لے تو نوافل کی سو 100 رکعات سے افضل ہے اور اگر ایک پاب علم کا سیکھ لے خواہ اس وقت وہ معمول بہ ہو یا نہ ہو تو ہزار رکعات نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔
- ★ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو اطلاع دی کہ بہت سے فتنے ظاہر ہوں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ان سے غلامی کی کیا صورت ہے انہوں نے کہا کہ قرآن شریف۔



# دلکش بہن

تو شاید وہ بھی خود کو انتہائی بنا سنوار کے رکھتی۔ ذمہ داریوں اور حالات نے کبھی موقع ہی نہیں دیا کہ وہ اپنے اوپر توجہ دیتی، شروع میں ماں نے شادی پر زور دیا، تو اس کے سختی سے انکار کے بعد شادی کا ذکر ہی ختم ہو گیا، ماں بھی بیمار تھیں اس پر اسکول جاتے بہن بھائی، ایسے میں وقت کی، بھل نے اسے وقت سے پہلے ہی حد درجہ سنجیدہ اور میچورڈ کر دیا، اب اس کی زندگی کا مقصد صرف کمانا تھا اور اپنے بہن بھائیوں کی قابل تحسین پرورش کرنا تھا، اس کی امی پورے محلے میں شمینہ باجی کے نام سے مشہور تھیں، وہ بہت سالوں سے درزن کا کام کرتی تھیں، کیڑے تو اتنے خوشنما سیتی تھیں کہ ڈیفنس کی کئی خواتین کم سلائی کے چکر میں ان کے پاس آتی تھیں، باقی دو بہنیں اور تھیں جونویں اور دسویں کی طالبہ تھیں اور ایک چھوٹا بھائی حسن جو چھٹی کلاس میں زیر تعلیم تھا۔ یہ کنبہ اس کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا، وہ ہر ممکنہ محنت کرتی تھی تاکہ گھر کا خرچ خوش اسلوبی سے چل سکے، اس کے باوجود مہینے کے آخر میں ادھار کی نوبت آ جاتی تھی، گھر کا کرایہ، فیسیں، بل، راشن اور دیگر مسئلے مسائل ان سب سے نمٹنا آسان نہ تھا، ایسے میں اتنی اچھی ٹیوشن کا ملنا ایک خوش قسمتی ہی تو تھی، وہ پہلے گھر میں ٹیوشن پر پڑھاتی تھی مگر دوستوں کے مشورے سے اس نے تنگ و دو شروع کر دی تھی کہ ڈیفنس میں کہیں ٹیوشن مل جائے، اور تھوڑی سی محنت کے بعد وہ

وہ ایک چھوٹے علاقے سے ڈیفنس کے انتہائی خوبصورت اور وسیع بنگلے میں ٹیوشن پڑھانے آیا کرتی تھی، یہ ٹیوشن اسے اخبار میں چھپنے والے ایک اشتہار کے توسط سے ملا تھا، وہ صبح اسکول میں جا کر ٹیوشن کرتی تھی، اور شام میں یہاں ٹیوشن پڑھانے آ جیا کرتی تھی، جتنی خواہ اس کو اسکول میں ملا کرتی تھی اس سے زیادہ وہ ڈیفنس کے اس ٹیوشن سے کمائی تھی، وہ خود کو خوش قسمت گردان رہی تھی کہ اتنا اچھا اور پارٹ ٹائم اسے جاب مل گیا تھا۔ وہ سوفٹ روڈ کے ایک چھوٹے سے مکان میں اپنی ماں اور تین چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ زندگی کے ایسے کسمپرسی کے اتار چڑھاؤ سے گزر رہی تھی جب باپ یا بڑے بھائی کا سایہ رحمت خداوندی سے کم نہیں ہوتا، ایسے میں وہ خود ایک بڑے بیٹے اور باپ کا فرض بخوبی نبھا رہی تھی، اچھے وقتوں میں اس کی لی گئی ماسٹرز کی ڈگری آج اس کے لئے بے انتہا کارآمد ثابت ہو رہی تھی، وہ بے تحاشہ پڑھنے کی شوقین تھی، بچپن میں باپ کا سایہ اٹھ جانے کے بعد ماں نے جتنا ممکن ہوا کچھ نہ کچھ کر کے اسے انگلش میں ماسٹرز کروایا تھا، اچھی تعلیم نے جہاں اس کے مزاج میں تبدیلی پیدا کی تھی، وہیں وہ اس حد تک مہذب ہو گئی تھی کہ ہر کوئی اپنے بچوں کو اس کی مثالیں دیا کرتا تھا، وہ انتیس سال کی دبلی پتلی گندی رنگت کی ایک عام سی مگر جاذب نظر لڑکی تھی۔ اگر پیسے کی ریل پیل ہوتی







کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

☆.....☆

اسے دودن ہوئے تھے اس بنگلے پر آتے ہوئے، پرائمری کلاسز کے دو بچوں کو کم سے کم دو گھنٹے ٹیوشن دینا ہوتی تھی، وہ دونوں جڑواں بھائی تھے، مگر صورت ایک دوسرے سے مختلف تھی، ان دونوں بچوں کی پھپھو نے اسے ہار کیا تھا، نہ پھپھو نے زیادہ بات کی نہ بیٹی بس بچے حوالے کئے اور اس کے بعد نظر نہ آئی، وہ خود ہی دودن سے آرہی تھی، وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں بچے کتابیں کھولے موجود ہوتے اور وہ بڑی دلچسپی اور محنت کے ساتھ ان میں مشغول ہو جاتی آج بھی وہ ذیلی دروازے سے لان عبور کر کے اندر آئی تو بچے ہمیشہ کی طرح ٹیبل پر کتابیں پھیلائے پڑھنے میں مصروف تھے، انہوں نے اسے آتے دیکھتے ہی بیک وقت کہا۔

”ہیلو آنٹی! گڈ ایوننگ۔“

”گڈ ایوننگ گڈز!..... کیسے ہو آپ دونوں؟“ وہ مسکراتے ہوئے جواب دیتی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”وی آر فائن، آنٹی! ہم نے سارا ہوم ورک کمپلیٹ کر لیا آپ پلیز چیک کر لیں۔“

”ویری گڈ بہت اچھا کام کیا ہے آپ دونوں نے تو۔“ اس نے مسکرا کر دونوں کو سراہا۔

”اچھا علی اور شافع آپ دونوں میٹھس کی بک نکالو، آج ہم کچھ سز کریں گے جو کہ بہت اپورٹنٹ ہیں۔“

”اوکے آنٹی!“ وہ فوراً اپنے بیگ پر جھک گئے، بہت ہی خوبصورت اور معصوم بچے تھے وہ، جب سے وہ ان سے ملی تھی ان پر بہت پیار آتا تھا، نہ ان کی ماں کا پتہ تھا نہ باپ کا، نہ کبھی اس نے پوچھنے کی ہمت کی، لیکن آج اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

”علی، شافع، چلو ایک بات بتاؤ مجھے جلدی سے، آپ دونوں کی ماما کہاں ہیں؟ کیا وہ مجھ سے نہیں

ملیں گی؟“ وہ بچے جواب دینے کے لئے لب ٹٹولنے لگے، اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس عالیشان بنگلے کی دیواروں میں کئی راز چھپے ہوئے ہیں، اسے بچوں سے نہیں پوچھنا چاہئے تھا وہ خود شرمندہ ہو گئی، ابھی علی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ پیچھے سے بھاری اور گرجدار آواز سنائی دی۔

”دیکھئے مس! آپ صرف اور صرف بچوں سے اسٹڈیز کو لے کر کنسرن رکھئے، پرسنل سوالات یا پرسنل ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، آپ کو یہاں پڑھانے کے لئے ہار کیا گیا ہے، آپ کو کوئی بھی کام ہو آپ یہاں کسی بھی سرونٹ کو بتا سکتی ہیں، بچوں سے آئندہ کسی بھی قسم کے سوالات کرنے سے گریز کیجئے گا۔“ وہ اچانک مردانہ آواز سن کر گھبراہٹ میں کھڑی ہو گئی تھی، بولنے والا ایک لمبا چوڑا سوئڈ بوئڈ خوبصورت ترین آدمی تھا، وہ اب عین اس کے مقابل کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

”اوہ سوری، آنٹی ایم سوسوری سر! میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھوں گی۔“ وہ انگلیاں دبائی ہوئی بولی۔

”اوکے مجھے آپ سے یہ ہی امید ہے۔“

”ہیلو بابا!“ علی شافع خوشی سے اچھلتے ہوئے اس سے لیٹ گئے، آج پہلی بار وہ ان دونوں بچوں کو اتنا خوش دیکھ رہی تھی۔

”ہیلو بیٹے! میرے بچے، میری جان۔“ اس نے

دونوں بچوں کو گلے سے لگا کر چوم لیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بابا کہیں سے بہت دنوں بعد آئے ہیں، ابھی اتنا جوش و خروش نظر آ رہا تھا۔

”بابا! اتنے دن کر دیئے آپ نے آنے میں۔“

ہم تو بہت اکیلے ہو گئے تھے، پراس کہ اب آپ ہمیں چھوڑ کر کبھی نہیں جائیں گے، ہم بالکل بھی خوش نہیں تھے یہاں، پھپھو بھی چلی جاتی ہیں انکل کے ساتھ ڈیلی، اور ہم یہاں بور ہو جاتے ہیں، ماما بھی چلی گئیں ہمیں چھوڑ کر، سب کی ماما ہوتی ہیں ہماری تو



مما بھی نہیں ہیں۔“ وہ دونوں مسلسل شکایتوں میں لگ گئے۔

”اچھا، اچھا پراس! میں کبھی نہیں جاؤں گا آپ کو چھوڑ کے، پر آپ دونوں کو میں نے پراس دیا تھا تاکہ کبھی بھی ممما کی بات نہیں کرو گے، میں ہی آپ کی ممما بھی ہوں اور بابا بھی، اب بابا کو بھی کبھی کام سے جانا بھی پڑتا ہے نا، اب میرے بہادر بچے نہیں سمجھیں گے تو کون سمجھے گا، اور ابھی ساری باتوں کو چھوڑو، آپ کی مس کھڑی ہیں پہلے پڑھائی کرو پھر خوب باتیں کریں گے اوکے۔“ انہوں نے پیار سے بچوں کو سمجھاتے ہوئے کن آنکھوں سے سامنے نظریں جھکائے کھڑی اس کی طرف دیکھا، جو بہ غور ساری باتیں سن رہی تھی مگر انجان بنی نظریں جھکائے پین سے کھیل رہی تھی، اتنی باتیں سننے کے بعد اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ علی اور شافع کس مشکل کے دور سے گزر رہے ہیں، اسے بے انتہا دلی ہمدردی بچوں سے محسوس ہونے لگی، یقیناً ان بچوں کی ماں ان کے ہمراہ نہیں تھی، تبھی اس گھر میں اتنا سناٹا اور خاموشی کا سیرا رہتا تھا، بچے بالکل مسکینی انداز میں زندگی گزارتے نظر آتے تھے، وہ معصوم سے بچے انتہائی محبت اور شفقت کے متمنی تھے، وہ دل سے ان دونوں کے لئے ہمدردی محسوس کرنے لگی، ان کے بابا کے جانے کے بعد وہ پھر ان کو پڑھانے میں مصروف ہو گئی، اب بھی کئی سوالات اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے جن کو جاننے کے لئے وہ بے تاب تھی۔

☆.....☆

آج خلاف معمول کچھ چہل پہل تھی، ورنہ اس بنگلے میں سناٹے کا عالم چھایا رہتا تھا، وہ شام پانچ بجے ہمیشہ پہنچتی تھی، آج تھوڑا لیٹ ہوئی تو جلدی جلدی اندر داخل ہوئی، دائیں بائیں خوبصورت سالان تھا، اور بیچ میں ایک پیسج اور کارپورج، وہ

تیزی سے پرس سنبھالے آگے بڑھی کہ بری طرح کسی سے ٹکرائی، سامنے جو کوئی تھا وہ بہت جلدی میں تھا تبھی زبردست ٹکراہوئی۔

”اوہ سوری، میں دیکھ نہیں سکی۔“ وہ فوراً دوپٹہ سنبھالتی ہچکچاتے ہوئے معذرت کرنے لگی، سامنے کھڑے فیصل سلیم کے چہرے پر ابھرتے برہمی کے تاثرات نے اسے اور کنفیوژ کر دیا۔

”مس سحرش! آپ اتنا اندھا دھن کیوں سارے کام کرتی ہیں، میں اکثر نوٹ کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی ہیں، وہ دیکھئے، اتفاق سے میرے کمرے کی کھڑکی اسی سمت کھلتی ہے اور میں اکثر آپ کو جلدی میں ہی دیکھتا ہوں۔“ فیصل سلیم نے اپنی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا، اس کی بے ساختہ نظر اوپر گئی، وہ اتنے سالوں سے جاب کر رہی تھی مگر جب بھی فیصل سلیم سے سامنا ہوتا، اس کی بارعب اور حسین شخصیت کے سامنے وہ عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو جاتی تھی، فیصل سلیم کا اسٹائل، آواز، رعب اور سنجیدہ مزاج یہ تمام خصوصیات وہ ابھی تک اخذ کر پائی تھی، اسے ہمیشہ اپنا آپ انتہائی کم تر محسوس ہونے لگتا تھا، ابھی بھی وہ سوائے اسے تنکے کے کچھ کہہ نہیں پارہی تھی، تبھی انہوں نے چٹکی بجا کر اپنی طرف متوجہ کیا، اس نے چونکتے ہوئے جواب دیا۔

”جہ..... جی..... سوری، بس وہ آج لیٹ ہو گئی تبھی جلدی میں تھی، پر میں آئندہ خیال رکھوں گی۔“ وہ سرعت کے ساتھ سر پر دوپٹہ سجھ کر نی اندر بڑھ گئی، فیصل سلیم اسے جانا دیکھ کر خود بھی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

وہ لاؤنج میں سے گزر کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھنے لگی وہاں سے کسی خاتون کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی، اس نے اندر موجود ایک ضعیف انتہائی باوقار خاتون کو وہیل چیئر پر بیٹھے علی



اور شافع کے ساتھ کھیلتے پایا، آج اتنے دنوں میں پہلی بار کوئی اسے نظر آیا تھا، جن کے دم سے خوب رونق ہو رہی تھی، اس نے آگے بڑھ کر فوراً سلام کیا۔  
 ”السلام علیکم آئی جی!“

”وعلیکم السلام! جیتی رہے۔ بیٹے جی آپ ہی کا انتظار ہو رہا تھا، آپ تھوڑا لیٹ ہو گئیں تو ہم اپنے پوتوں کے ساتھ کھیل میں لگ گئے، جاؤ بچوں اسٹڈیز اشارٹ کرو۔“ انہوں نے بچوں کو فوراً پڑھنے کے لئے کہا، وہ مسلسل سحرش کو بغور اوپر سے نیچے تک دیکھ رہی تھیں، چہرے پر ایک دلفریب مسکراہٹ اس بات کی عکاسی کر رہی تھی کہ وہ خاتون بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھیں۔

”بھئی میں تو ہوں ان دونوں شیطان کی دادی، آج صبح ہی میں آسٹریلیا سے واپس آئی ہوں، اور ابھی پتہ چلا کہ ماشاء اللہ ایک ماہ سے آپ میرے پوتوں کو بڑھانے آرہی ہیں، یہ بچے تو بس سارا دن آپ کے گن گاتے رہتے ہیں، آپ کی محبت نے تو لگتا ہے جادو کر دیا ان بچوں پر۔“ وہ آٹھویں ٹک وکیل چیر پر فریب آ کر بولیں، ان کا انداز نہایت شفقت بھرا تھا، وہ بہت باتونی نظر آرہی تھیں۔

”بس آئی! اللہ کا احسان ہے مجھ پر کہ اس نے میری خامیوں کو پس پردہ رکھا ہوا ہے، ورنہ ہم گنہگار کس لائق ہیں، اور رہا سوال ان بچوں کا تو یہ ہیں ہی محبت کے مستحق۔“

”بہت خوب کہا تم نے، یہ بچے بہت معصوم ہیں، نہیں جانتے کہ کس مقام پر موجود ہیں، اس عمر میں جب والدین کا سایہ سب سے زیادہ ضروری ہے ایسے میں بن ماں کے پلنے والے بچے سب کی محبت اور شفقت کے مستحق ہوتے ہیں، میرا علاج کے لئے جانا بے حد ضروری تھا، ورنہ میں انہیں چھوڑ کر کبھی نہ جاتی، مگر آنے کے بعد انہیں مختلف ایکٹیویٹیز میں مصروف دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، سحرش نام ہے نا

تمہارا؟ بیٹا کیا کرتی ہو، کہاں رہتی ہو کتنے بہن بھائی ہو؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے بارے میں تفصیل بتانے لگی، خاتون بہت دلچسپی سے باتیں سن رہی تھیں، علی اور شافع کے لئے سحرش کے دل میں اتنی محبت دیکھ کر انہیں دلی مسرت ہو رہی تھی، وہ بہت متاثر ہونے لگیں۔

”بس بیٹا! اپنی اپنی قسمت کی بات ہوتی ہے، ان بچوں کی قسمت..... سحرش آؤ بیٹا ہم باہر چل کر بات کرتے ہیں، بچوں کو اسٹڈیز کرنے دو بلا وجہ ہماری بات چیت سے ڈسٹرب ہو رہے ہیں؟“ وہ بچوں کے سامنے بات نہیں کرنا چاہ رہی تھیں، تبھی سحرش کو لے کر لاؤنج میں آ گئیں، سحرش بھی ان سے بہت کمفرٹبل ہو کر اب بات کر رہی تھی۔

”آئی! کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ ان کی ماما کہاں ہیں؟ میں بچوں سے بہت فرینک ہوں مگر میں نے ان سے کبھی پوچھا نہیں کہ کہیں میری وجہ سے وہ دکھی نہ ہوں۔“

”بس بیٹے جی! کیا بات بتاؤں، ان بچوں کو تو اپنی ماں کی شکل بھی یاد نہیں، یہ بے چارے تو آیا اور گورنس کے ہاتھوں میں پلے بڑھے ہیں یا پھر ان کا باپ ان کی ماں کا فرض نبھاتا آیا ہے، پر ماں تو ماں ہوتی ہے، اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا، بھلا کیا عمر تھی ان کی، آئی تھنک دو سال جب جو یہ ان دونوں کو چھوڑ کر چلی گئی۔“

”وہاٹ، ان کی ماما زندہ ہیں؟ اوہ..... میں تو سمجھی کہ وہ اس دنیا میں ہی نہیں ہیں۔“ سحرش نے حیرانی سے پوچھا۔

”بالکل زندہ ہے، سلامت ہے، ہم نے بچوں کو یہ کہا ہوا ہے کہ ان کی ماما اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں، وہ تو زندہ ہے اور خوش باش ہے اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ، یہ سب فیصل کی نادالی کی وجہ سے ہوا



ہے، آج سے تقریباً دس سال پہلے میں نے اپنے خاندان کی لڑکی سے اس کی منگنی کی، سب صحیح چلتا رہا مگر اس جویریہ سے عشق و عاشقی کے چکر میں سب برباد ہو گیا۔

فیصل نے جویریہ سے محبت کے چکر میں اپنی منگنی توڑ کر خاندان میں دراڑ پیدا کی، ہمیں رسوا الگ کروایا اور اس کمبخت کو اس گھر میں لے آیا، آئی ایم سوری سحرش اگر میں نازیبا الفاظ استعمال کروں تو..... بس جویریہ کا ذکر آتے ہی میرا پاراہائی ہونے لگتا ہے۔“ وہ سحرش کو دیکھ کر معذرت خواہانہ لیجے میں بولیں، وہ جو بہت دلچسپی سے بات سن رہی تھی ایک دم بولی۔

”اُس اوکے آنٹی! آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانوں گی میں۔“

”ہینکس بیٹے جی! بس فیصل کی ضد کی وجہ سے ہم نے انتہائی دھوم دھام سے شادی کی اور اسے گھر لے آئے، جویریہ نے اس گھر کو کبھی اپنا گھر سمجھا ہی نہیں، میں بارہ سال سے وہیل چیئر پر ہوں، نہ اس نے کبھی مجھ پر توجہ دی نہ گھر پر، اس کے لئے ضروری تھے تو اپنے سوشل سرکلو، پارٹیز، دوست، فیشن اور عیاشیاں، دن بدن مسئلے مسائل بڑھنے لگے اور فیصل اور جویریہ میں آئے دن جھگڑے ہونے لگے، اسی دوران علی اور شافع اس دنیا میں آ گئے، ہمارے لاکھ سمجھانے پر بھی اس نے اپنے بچوں کو نہیں اٹھایا، وہ بچے شروع دن سے ہی آیا کے ہاتھوں پلے پڑھے، میں جتنا ممکن ہوتا نظر رکھتی تھی مگر میں مجبور تھی، کیا کرتی بہر حال ایک دن جویریہ آدھی رات کو گھر لوٹی، وہ مکمل نشے میں تھی، اس دن فرسٹ ٹائم فیصل نے اس پر ہاتھ اٹھایا، وہ ہاتھ اٹھانے پر اس حد تک مجبور ہو گیا تھا کہ اگر میں جویریہ کو نہ بچاتی تو وہ اسے مار ہی ڈالتا، بالآخر یہ انجام ہوا اس شادی کا کہ اس رات کے بعد وہ جب گئی تو لوٹ کر نہ آئی، آئے

تو ڈائورس پیپرز، فیصل کو بچوں کی کسڈی مل گئی، اب وہ وقت ہے اور آج کا وقت، اس جویریہ کو اس گھر سے گئے چار سال ہو گئے ہیں، فیصل کو شادی کے نام سے ہی جڑ ہے، وہ شادی اور عورت کی ضرورت کو سمجھتا ہے مگر ڈرتا ہے کہ نئی آنے والی عورت کہیں دوسری جویریہ نہ ہو، مجھے فکر ہوتی ہے تو ان بچوں کی، میں نہ رہی تو کیسے بیچ ہوگا سب گاڈنوز۔“ وہ انتہائی افسردہ ہو گئی تھیں، سحرش انہیں ہمت دلانے لگی، سحرش کا پیار سے بات کرنا، انہیں ہمت دینا یہ سب زویا سلیم کو بہت بھار رہا تھا، وہ آہستہ آہستہ سحرش کی طرف گامزن ہوتی جا رہی تھیں اور ان کی دلچسپی سحرش سے بھی پوشیدہ نہیں تھی۔

☆.....☆

اب یہ ہر روز کا معمول تھا، سحرش جب بھی پڑھانے آتی، زویا سلیم اس کو لے کر کبھی لان میں آ جاتیں کبھی لاؤنج میں، دونوں خوب باتیں کیا کرتیں، زویا سلیم نے یہ بھی بتایا کہ ان کی ایک شادی شدہ بیٹی بھی ہے کرن جو بہت کم آتی جاتی ہے، وہ بھی کافی پروفیشنل اور لبرل قسم کی ہے، اسی طرح کئی باتیں وہ دونوں شیئر کرنے لگیں، اب تو پڑھائی کے علاوہ بھی وہ کافی وقت زویا سلیم کے ساتھ گزارتی تھی، بچے بھی اس حد تک مانوس ہو گئے تھے کہ سحرش کی کہی گئی ہر بات ان کے لئے لازم ہوتی، وہ خود بھی بچوں سے اور زویا سلیم سے محبت کرنے لگی تھی۔

☆.....☆

”مام پلیز! آپ ہمیشہ کچھ نیا ڈھونڈ کے لاتی ہیں، جب سے آیا ہوں بس سحرش کی تعریفوں کے بل باندھے جا رہی ہیں، مانا میں نے کہ بچے بہت مانوس ہیں اس سے اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس سے شادی کر کے بیٹھ جاؤں، آپ کا تو کوئی کیلیبر ہی نہیں رہا شاید، نہ کلاس دیکھتی ہیں نہ اسٹینڈرڈ،



بس لڑکی پسند کر کے بیٹھ جاتی ہیں۔ فیصل سلیم چڑتے ہوئے نائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے بولا۔  
 ”شرم کرو فیصل شرم، ابھی بھی تم کلاس کی بات کر رہے ہو“ ارے ان اسٹینڈرڈ گھروں کی لڑکیوں سے یہ غریب گھر کی لڑکیاں قدرے بہتر ہیں، جن میں ایٹ لسٹ سن اخلاق، گھر بنانے کا ہنر، تہذیب تو ہے، ورنہ یاد ہے نا وہ جو یہ کیسی ذلت کر کے گئی ہے وہ ہماری۔“

”مام پلیز! جو یہ کا نام مت لیں، وہ میری غلطی تھی جس کی سزا میں آج تک بھگت رہا ہوں۔“  
 ”بیٹے جی، بس اسی غلطی کو بھلانے کا وقت آ گیا ہے، سحرش سے اچھا جیون ساٹھی، اور بچوں کی ماں تمہیں کبھی نہیں مل سکتی۔“ زویا سلیم نے بارعب لہجے میں حتمی فیصلہ سنایا۔

”مام! آپ سمجھنے کی کوشش کریں، میں اب لڑکا نہیں رہا، مجھے لائف پارٹنر کی ضرورت نہیں ہے، میرے لئے ایک تجربہ ہی بہت ہے، جس کی نچی میں آج تک محسوس کرتا ہوں، آپ مجھے ایسے رشتے میں مت باندھیں جو میں نبھانہ سکوں اور کسی کے ساتھ زیادتی کر بیٹھوں۔“

”تمہیں ابھی ایسا لگتا ہے کہ تمہیں بیوی کی ضرورت نہیں ہے مگر درحقیقت تمہیں بیوی کی بھی ضرورت ہے اور اپنے بچوں کے لئے ماں کی بھی، مگر تم ڈرتے ہو کہ کہیں تمہارا کوئی غلط فیصلہ تمہارے بچوں کی زندگی کیلئے نقصان دہ ثابت نہ ہو جائے، مگر ہم بوڑھے لوگوں کا تجربہ بھی کچھ معنی رکھتا ہے کہ نہیں، سحرش تمہاری زندگی کو جنت بنا دے گی، اس دفعہ مجبوری میں ہی صحیح مگر یہ فیصلہ لے کر دیکھو، انشاء اللہ تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔“

”مام! میرے لئے بہت مشکل ہے، مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت درکار ہے۔“

”ٹھیک ہے، مگر مجھے کل مثبت جواب چاہئے۔“

زویا سلیم بغیر کچھ جواب سننے کمرے سے باہر آ گئیں، ان کا کمرہ نیچے تھا، مگر آج وہ بہت عرصے بعد اوپر آئی تھیں، تاکہ فیصل سے بات کر سکیں وہ دل ہی دل میں دعا گو تھیں کہ فیصل حامی بھر لے، ابھی دوسرا مرحلہ تو سحرش سے بات کرنے کا تھا، فیصل جیسے ہی حامی بھرتا وہ پہلی فرصت میں رشتہ لے کر ڈائریکٹ سحرش کے گھر چلی جاتیں، کچھ دنوں کی بحث کے بعد تنگ آ کر مجبوراً فیصل نے سحرش سے شادی کی حامی بھر لی۔

☆.....☆

فیصل سلیم کا رشتہ سحرش کے لئے ایک بم کی صورت تھا، اس نے گمان بھی نہیں کیا تھا کہ زویا سلیم خود اس کے گھر رشتہ لے کر آئیں گی، سحرش بہت سمجھدار تھی وہ وقت کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھتی تھی، اس نے خوش دلی سے یہ رشتہ قبول کیا، اس کے لئے یہ ہی بہت تھا کہ علی اور شافع کو اس کے روپ میں ماں مل جائے گی، وہ تہہ دل سے ان بچوں کے لئے دل میں ہمدردی کے جذبات رکھتی تھی اور یہ ہی جذبات بھانپ کر زویا سلیم اسے سادگی سے دو کپڑوں میں گھر لے آئیں، شادی کے بلکے پھلکے جوڑے میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی، چند رشتہ داروں نے اسے خواب گاہ تک پہنچایا، وہ جانتی تھی کہ فیصل سلیم کبھی بھی کمرے میں نہیں آئے گا اسی لئے وہ چینیج کر کے علی اور شافع دونوں کو اپنے کمرے میں لے آئی، وہ اپنے بابا کی شادی اپنی فیورٹ پیچر سے کرا کے خوشی سے پھولے نہیں سارہے تھے، سحرش نے ان دونوں کو جی بھر کے پیار کیا اور ان سے وعدہ لیا کہ وہ اب ہمیشہ اسے ماما کہہ کر پکاریں گے۔ ان کے منہ سے ماما، سننا اسے اس قدر اچھا لگ رہا تھا کہ بس، وہ مطمئن تھی کہ اس نے شادی کا فیصلہ کر کے بہت اچھا کیا تھا، اس کا کمرہ سپر بیٹ تھا، جو کہ بہت کشادہ اور انتہائی خوبصورت تھا، وہ جانتی تھی کہ فیصل



سلیم نے مجبوری کے تحت یہ شادی کی ہے زویا سلیم نے اسے پہلے ہی ہر بات سے آگاہ کر دیا تھا، وہ سب جانتے ہوئے بھی صرف بچوں کی خاطر اس شادی کے لئے راضی ہوئی تھی، اس کا اور فیصل کا کمرہ الگ الگ تھا، وہ دونوں بچوں کو سارا دن اپنے کمرے میں رکھتی تھی، وہ سوتے بھی ساتھ تھے، وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ تین دن ہو گئے تھے اور اس کا ابھی تک اپنے شوہر سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ فیصل نہ چاہتے ہوئے بھی سحرش سے گریز کرتا تھا کہ کہیں اس کے سوالوں کے جوابات نہ دینے پڑ جائیں۔

☆.....☆

”کوئی چائے وائے ملے گی کہ نہیں یا اتوار والے دن بھی باہر سے چائے پینی پڑے گی۔“ فیصل سلیم نے سرونٹ کو دیکھتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی لان میں چیئر گھسیٹ کے بیٹھ گیا۔ سامنے رکھا اخبار اٹھایا اور انگریزی اخبار کا مطالعہ شروع کر دیا، ابھی کسی کی کھلتی چوڑیوں والے ہاتھ نے چائے عین اس کے سامنے کر دی، فیصل نے چونک کر دیکھا تو سامنے سحرش کو کھڑا پایا۔

”تھینکس..... آپ نے کیوں زحمت کی؟“ وہ نظریں جراتے ہوئے بولا اور کپ تھام لیا، سحرش بھی اپنی چائے لے کر وہیں بیٹھ گئی۔

”میں اپنے لئے چائے بنا رہی تھی، سو چا آپ کے لئے بھی بنا دوں۔ آپ کو اٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا میں نے۔“

”اوہ..... تھینکس، کوئی کام ہو تو آپ مجھ سے بغیر کسی جھجک کے کہہ سکتی ہیں، آپ کے اکاؤنٹ میں ہر مہینے پیسے جمع ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو، بلا جھجک کہئے گا۔“ وہ چائے کی چسکیاں بھرتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کے بات کرنے لگا، وہ بھی آہستہ آہستہ چائے پیتے ہوئے

لا تعلقی سے اخبار پڑھ رہی تھی، دھیان وہیں تھا۔

”مجھے بس اپنے اور بچوں کے خرچے کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوگی، اس کے علاوہ میں کچھ رقم ہر مہینے اپنے گھر میں دینا چاہتی ہوں، اگر آپ کی اجازت ہو تو؟“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے سحرش۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔

اس کے منہ سے اپنا نام سننا اس قدر دلفریب لگا کہ اس کا دل چاہا بس اس کی زبان سے اپنا نام سنتی رہے۔ جب سے وہ فیصل سلیم کے نکاح میں آئی تھی، ایک عجیب سا احساس اسے لپیٹ میں لئے رکھتا، آج بھی فیصل کو سامنے پا کر وہ وہیں بیٹھ گئی، اس کے پاس سے اٹھتی مسخور کن برانڈڈ پرفیوم کی خوشبو اسے مہوت کر رہی تھی، پہلی پہلی محبت کا یہ احساس اسے پاگل کر رہا تھا، وہ جذبات پر قابو رکھتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ یکطرفہ محبت اسے خوار کر دے گی، درد کے سوا کچھ نہ دے گی اس کے باوجود وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی، اس کی نگاہیں ہر وقت اپنے مجازی خدا کو ڈھونڈتی رہتیں، زویا سلیم کی گھاگ نظریں پہچان گئی تھیں کہ یکطرفہ ہی صحیح، محبت کی کوئیل پھوٹ چکی ہے، اب یہ کب پروان جڑھتی ہے یہ وقت ہی بتائے گا۔

☆.....☆

فیصل سلیم واقعی کچھ دنوں میں ہی اپنے گھر اور زندگی میں تبدیلی محسوس کر رہا تھا، سحرش واقعی ایک بہترین ماں ثابت ہو رہی تھی، وہ صبح خود بچوں کو اسکول بھیجتی، ان کو پڑھائی، نہلاتی اور اپنے سامنے کھانا کھلاتی تھی، نیز وہ ایک مثالی ماں ثابت ہو رہی تھی، وہ اس تبدیلی اور بچوں کی خوشی کو دیکھ کر بہت خوش رہنے لگا تھا۔

”سحرش مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ وہ لان میں اکثر رات میں بیٹھ جایا کرتی تھی اور کسی



کتاب کا مطالعہ کرتی تھی، آج بھی وہ موجود تھی، تبھی فیصل سلیم نے وہیں بیٹھے ہوئے کہا۔  
”جی کہئے۔“

”میں وہ آپ کے لئے ایک پریزنٹ لایا تھا۔“

”پریزنٹ؟ میرے لئے؟“ سحرش کو کانوں پر یقین نہیں آیا، تبھی فیصل نے گفٹ آگے بڑھا دیا۔  
”اوہ کھینکس۔“ وہ گفٹ لے کر گود میں رکھ کے اسے دیکھنے لگی۔

”آپ نے یوں اچانک میرا مطلب..... گفٹ دینے کی کوئی خاص وجہ؟“

”ہمہ..... نہیں..... بس دل چاہا تو خرید لیا، امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔“

”جو بھی ہوگا، میرے لئے بہت قیمتی ہوگا، میرے لئے یہ ہی بہت ہے کہ آپ نے میرے لئے اتنا سوچا۔“ وہ نگاہیں نیچی کئے بولی، فیصل سلیم کو شرمندگی نے آگھیرا، وہ جانتا تھا کہ اس نے اتنے دنوں میں کوئی حقوق نہیں نبھائے اس کے باوجود سحرش اس سے مسکرا کر گفتگو کر رہی تھی۔

”آپ کو شرمندہ کرنا میرا مقصد نہیں تھا، میں جانتی ہوں کہ کن حالات میں آپ نے مجھ سے شادی کی ہے، مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے، پتہ ہے مسٹر فیصل! میری زندگی کا مقصد کمپروماز کرنا ہے، میں نے ساری زندگی بس قربانیاں ہی دی ہیں، بچپن میں بچپن کی قربانی، پھر تمام تر آرام، مستیوں اور دوستیوں کی قربانی، اور اب ایسا لگتا ہے کہ یہ شادی بھی ایک سیکر یفائز ہی ہے اور بخدا میں بہت خوش ہوں۔ علی اور شافع کو میری صورت میں ایک ماں مل گئی اس سے بڑھ کر میرے لئے کچھ نہیں ہے، پلیز آپ یہ مت سمجھئے گا کہ میں آپ کی ہمدردی بخورنا چاہ رہی ہوں، بس آج ایسے ہی بہت زیادہ بول گئی۔“ وہ نگاہیں نیچے کئے اپنے ہاتھوں کو گھورتی

بہت کچھ بول گئی تھی، فیصل سلیم حیرانی سے سن رہا تھا۔  
”اچھا لگا، تم نے کچھ باتیں شیئر کیں مجھ سے۔“  
فیصل نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔  
”اچھا اب گفٹ تو دیکھو اور بتاؤ کہ تمہیں پسند آیا کہ نہیں؟“ سحرش نے سرعت کے ساتھ چھوٹا سا گفٹ کھولا، اندر ویلیوٹ کے باکس میں ایک بہت خوبصورت چین اور لاکٹ موجود تھا، فیصل، سحرش کے بدلتے تاثرات سے محظوظ ہو رہا تھا، وہ سادی سی لڑکی رات کے اس پہر بہت پیاری معلوم ہو رہی تھی، سحرش نے چین دیکھ کر بے ساختہ تعریف کی۔

”واؤ، یہ بہت خوبصورت ہے۔“  
”پسند آیا تمہیں، اب خود پہن لوگی یا مجھے پہنانا بھی پڑے گا؟“ فیصل کا شرارت میں کہا گیا جملہ سحرش کو پانی پانی کر گیا، وہ تیزی سے کھڑی ہو گئی، فیصل سلیم جان چکا تھا کہ وہ بھاگ جائے گی تبھی وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ سحرش کے بے تحاشہ قریب تھا، اس کے پاس سے ہمیشہ کی طرح اٹھتی پرفیوم کی مہک، اسے پاگل کر رہی تھی، وہ گفٹ ہاتھ میں لئے تھر تھر کانپ رہی تھی، نگاہیں مسلسل نیچے گھاس رہی ہوئی تھیں، فیصل سلیم اس کی اس کیفیت سے مسلسل محظوظ ہو رہا تھا۔

”تم نے بتایا نہیں خود پہن لوگی، یا میں، پہنادوں؟“

”نہ..... نہیں میں خود پہن لوں گی۔“ وہ کہتی ہوئی سرعت سے بھاگ نکلی، اس کی دھڑکنیں اس کے قابو میں نہیں تھیں، وہ بستر پر گری عجیب سی سرشاری کے عالم میں تھی، فیصل سلیم کا ایسا رویہ، ایسا روپ وہ بہت کنفیوژ تھی۔

اب اکثر ایسا ہونے لگا تھا، فیصل سلیم اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا اور وہ شرما کر بھاگ جاتی۔ فیصل خود سحرش سے دلی وابستگی محسوس کرنے لگا تھا، اور یہ انیت اسے سحرش کے اخلاق، اور اس کی اچھائیوں



کی وجہ سے محسوس ہو رہی تھی، کہاں وہ شادی کے نام سے خوفزدہ تھا اب چند دنوں میں ہی وہ سحرش کی سنگت کا متلاشی رہنے لگا، بچوں کی طرف سے تو وہ مکمل بے فکر ہو گیا تھا، وہ ساری توجہ اب بزنس پر دیتا، روز ایک یا دو دفعہ بچوں اور سحرش سے اس کی ملاقات ہو جاتی تھی، آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔

☆.....☆

فیصل کو اچانک کام کے سلسلے میں دینی جانا پڑ گیا تھا، وہ ایک ہفتے بعد گھر واپس لوٹا تھا، یہ ایک ہفتہ اس کی زندگی میں بہت اہمیت کا حامل تھا، اس دوران وہ فیصلہ کر کے لوٹا تھا کہ زندگی کو پھر ایک موقع دینا ہے، رات کے دو بجے اس نے فون کر کے سحرش کو اٹھایا، وہ فریش ہو کر نیچے آئی، یوں اچانک آمد پر وہ بھی حیران تھی۔

”آپ تو دو دن بعد آنے والے تھانا! یوں اچانک۔“

”بس آپ کی یاد آئی تو ہم جلدی آگئے، اب ہماری کچھ خاطر کرو، بھوک سے برا حال ہے کچھ ملے گا؟“ وہ شرارت سے گویا ہوا۔ آج اس کا موڈ حد درجہ اچھا تھا۔

”جی..... میں ابھی لائی۔“ وہ کھانا گرم کرنے لگی اور ٹرے میں سجا کر ٹیبل پر لے آئی، فیصل کو نہ پا کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی، تبھی اوپر سے آواز آئی۔

”کھانا میرے بیڈروم میں لے آؤ، میں یہاں ہوں۔“ وہ ٹرے لے کر اوپر فیصل سلیم کے بیڈروم میں آگئی، وہ آج پہلی بار اس کے کمرے میں آئی تھی، اسے سی کی کوننگ سے ٹھنڈا ٹھار کمرہ، فیصل کے سینٹ کی بسی خوشبو، کمرے میں فیصل موجود نہیں تھا، وہ جانے لگی تبھی واش روم سے سر پر تو لیا لئے وہ باہر آیا، اسے بنا شرٹ کے دیکھ کر وہ منہ پھیر کے کھڑی

ہو گئی، تبھی اسے کان کے بہت قریب آواز سنائی دی۔  
”میں غیر ہوں کیا، جو تم مجھ سے نظریں چرا رہی ہو۔ شوہر ہوں تمہارا۔“ وہ اس قدر قریب تھا، سحرش کے تو روم روم سے پسینہ نمودار ہو گیا، اتنے کول کمرے میں بھی اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے، وہ ہمیشہ کی طرح بھاگنے والی تھی مگر سامنے والا مکمل راستہ روکے کھڑا تھا۔

”مجھے صبح اسکول..... اسکول کے لئے اٹھنا ہے۔“  
”شش..... شش..... ابھی صرف ہماری بات کرو، نوکڈز، نو اسکول، بلاہ بلاہ۔“  
”فیصل پلیز!“

”لیکن آج کے بعد سے میں تمہیں کبھی کہیں نہیں جانے دوں گا، یہ ہمارا کمرہ ہے، اور ہم آج سے یہیں سوئیں گے۔“ وہ مسلسل اس کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا، وہ شرم سے دوہری ہوئی جا رہی تھی، جانتی تھی کہ آج اس کے صبر کا ثمر اسے مل گیا ہے، آج اس کے شوہر نے اسے دل سے اپنا لیا ہے، وہ مسلسل کان میں سرگوشی کر رہا تھا، اپنی محبت کا اقرار کر رہا تھا، وعدے وعید کر رہا تھا، اور وہ آنکھیں بھیچنے وہ محبت کی اتنا گہرائیوں میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی، آج زویا سلیم کے یقین کی جیت ہوئی تھی، واقعی بڑوں کے کئے گئے فیصلے ہمیشہ صحیح ثابت ہوتے ہیں، فیصل سلیم کو بھی بہت جلد اس بات کا احساس ہو گیا تھا، وہ اپنی مام کا دل سے مشکور تھا کہ انہوں نے ایک بہت سنجھی ہوئی سمجھدار جیون ساتھی اور ایک بہت پرواہ کرنے والی ماں کا انتخاب سحرش فیصل کی صورت میں کیا تھا۔ ایک شادی اس نے اپنی مرضی کی کی تھی جو کہ ناکام ثابت ہوئی، اور ایک شادی اس نے مجبوراً ماں کی مرضی سے کی اور اوپر والے نے دنیا کے سارے سکھ اسی رشتے میں سمود دیئے۔

☆.....☆



سحرش فاطمہ

افسانہ

# دل کے باتوں کا سیر

”تمہاری زندگی کا مقصد کیا ہے؟“  
اس کے اچانک سوال کرنے پر میں نے آنکھیں پوری طرح کھول کر اسے دیکھا اور اس سوال کو سمجھنے کی کوشش کی۔





سنا دے گی لیکن ویسے گنگ ہوئی زبان لئے بیٹھی  
 رہے گی۔“ اس کی بات سن کر میرا بس نہیں چل رہا تھا  
 کہ ابھی کے ابھی اس کے بال نوچ لوں اور وہ مزے  
 سے بولے جارہی تھی۔ ہم دو دوستیں تھیں، ہمارے  
 خیالات شاید ہی بھی ملے ہوں آپس میں لیکن دوستی  
 میں ضروری نہیں کہ خیالات بھی ملیں، حیر میں اس  
 شام اپنے کمرے کے ٹیرس پر بیٹھی ہوئی تھی چائے کی  
 چسکیاں بھرتے ہوئے موسم کا مزا لے رہی تھی، ابر  
 آلود ہونے کے باوجود بھی بارش نہیں ہوئی لیکن  
 آسمان کو دیکھ کر پھر مزا بھی آتا ہے، میری دوست جو  
 میرے ساتھ والی کُلی میں رہتی تھی لیکن میرے پاس

”ایک تو تمہاری آنکھیں اتنی بڑی ہیں کہ ویسے ہی  
 دیکھو تو ڈر جائیں ان کو مزید بڑی اور پھیلائے کی ضرورت  
 نہیں۔“ اس نے مجھے ناک آؤٹ کرنے کی پھر سے  
 کوشش کی اور میں ہاتھ باندھ کر منہ بسورے بیٹھی رہی۔  
 ”سچ کہہ رہی ہوں، تم نے اپنا خود ستیا ناس کیا ہوا  
 ہے، تم ان لڑکوں کے چکر سے کب نکلو گی؟“ اس نے  
 وہ بات کر دی جس پر میرا معصوم مومی دل پکھل جاتا  
 ہے۔ ایسی بات نہیں تھی کہ میں غلط تھی لیکن اس بات  
 پر میرا دل کٹ کر رہ جاتا ہے جب بھی سوچتی ہوں۔  
 ”منہ میں زبان نہیں ہے کیا؟ ویسے تو ان محترمہ  
 سے ٹک ٹک مینج کر والو اور چیٹنگ بھی سب کو





جب بھی آتی یوں لگتا کہ یہ اس کا گھر ہو، ابھی بھی وہ میرے گھر میں ہی موجود تھی۔  
 ”میں تو تھک گئی ہوں تم سے کہہ کہہ کر خدا واسطہ ہے نکل آؤ ان سب سے کیوں تم اپنی زندگی خراب کر رہی ہو؟“  
 ”میں نے کیا کیا ہے بھئی؟ کب سے بولے جارہی ہو، دو گھڑی سانس نہیں لے سکتیں تم؟“ بالآخر میں نے لب کشائی کر ہی لی اس کی پٹر پٹر کرتی زبان کو چپ کروانا تھا۔ چلے تک سکون سے بیٹھیں دی اس نے مجھے ”نہ پھر دو کیا کرنا ہے کیا نہیں، اپنے آپ کو دیکھا ہے؟“ میری بات سن کر وہ بھوکھلی رہ گئی اور میں اس کی شکل پر تیرا بج رہے تھے اور میں مزے سے دیکھ رہی تھی۔

”لو میں نے کیا کر دیا؟“ وہ بھی کنک سی مجھے دیکھنے لگی۔

”اچھا، مجھے کہتی ہو کہ میں لڑکوں کے پیچھے ہوں اور تم جو لڑکوں کو اپنے پیچھے لگائے ہوئے ہو وہ کیا ہے؟“ مجھے لگ رہا تھا کہ جس اب میں نے اس کی بات بتا کر اس کے بال نوٹنے کے مترادف کر لیا ہے حالانکہ مجھے یہ سب کہنا تو ہمیں چاہئے تھا پر وہ مجھے سنائے جارہی تھی تو میں کیوں چپ رہتی؟  
 ”کیا بکواس کر رہی ہو میں نے کسی کو بھی اپنے پیچھے نہیں لگایا۔“ اف یہ جھوٹ کے کتنے رنگ ہوتے ہیں؟ سفید کالا نیلا پیلا، خیر جو بھی اس کا جواب نہیں کیا مزے سے جھوٹ بولنے کی شروعات کی ہے اور میں اسے ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔

”اچھا..... وہ یاد ہے تمہاری گلی میں ہی رہتا تھا وہ تو آج بھی منتظر ہے کہ تم اس سے ایک دفعہ اظہارِ افسوس کر لو۔“ میں نے اسے لڑکا یاد دلایا جس کے بارے میں اس نے مجھے بتایا تھا اور ابرو اچکائے اسے بغور دیکھا۔

”تو بہ ہے یار! میں اسے بھائی سمجھتی تھی اب وہی مجھ سے امیدیں باندھنے لگ گیا تو میرا کیا قصور؟“

”واہ کیا بات ہے ان کی بھی؟“ وہ اپنے کلیں کی لوپ ہاتھ لگانے لگی اور میں اسے دیکھنے میں مگن تھی۔

”اچھا اور وہ اسکول میں جو تھا تمہارے ساتھ بلکہ بیٹھا بھی تمہارے ساتھ تھا بے چارہ کتاب نام ہوا تھا تم نے ہی تو اسے فیئر ویل میں وہ ایک ٹائٹل دے دیا تھا یا ہے؟“ میں نے ایک اور بات یاد دلانی۔

”ہاں ناں بھائی بہن کی جوڑی تھی اور وہ اس میں بھی پیار لے کر آ گیا یہ تو اچھا ہوا مجھے پتا چل گیا تھا اور میں نے اسے سب کا بھائی ایک ہی بھائی کے نام کا ٹائٹل دے دیا تھا۔“ ایک کمینٹی سے ہنسی آئی اسے اور میں اس کی باتیں سن کر کھول رہی تھی۔

”کیا تم صرف بھائی بنائی ہو؟ وہ بھی تب جب وہ تمہیں کہہ دیں کہ تمہیں پسند کرتے ہیں؟ واہ کیا بات ہے تمہاری؟“ مجھے اس کی یہ بات عجیب ہی لگی۔

”اچھا تو کیا کرتی؟ تمہاری طرح سب کو اپنا دل دے بیٹھتی؟ اور دو تین سال تو چھوڑا ایک سال بھی گزارنے کے بعد بے دردی سے چھوڑ دیتے ہیں اس پر آنسو بہا بہا کر ٹپ بھر دیتی؟“ اس نے پھر مجھ پر چوٹ کی، میں سلگ گئی کیوں نہ سلگتی اس نے میرے دل پر میری دھستی رگ پروار کیا تھا۔

”تمہارے پاس تو دل ہی نہیں ہے آج بھی جو تمہیں پسند کرے اس کے ساتھ باتیں کرتی ہو مل بھی لیتی ہو اور جب وہ شادی کی بات کریں یا اظہار کریں تو تم انہیں فضول باتیں سنا کر بھائی کا لفظ چپکا دیتی ہو۔“ میں نے فرح کو دیکھا اور کہا اور وہ پھر ہنسی۔

”اور تم اپنا حال نہیں بتانا پسند کرو گی کہ کیسے تم سے دوستی کر کے تمہیں پیار کا کہہ کر تمہیں آخر میں چھوڑ جاتے ہیں مس عازہ ارے یہ تو کچھ نہیں ان کی محبتیں تو عید کی طرح ہوتی ہیں ہر سال پیار ان کا جاگ جاتا ہے اور یہ واپس آپ سے رابطے میں آ جاتے ہیں اور بس پھر وہی باتیں شروع اور کیا ہوتا ہے پتا ہے نا لڈ۔“ میری ہنسی ایک دم رک گئی وہ مجھے سب یاد دلایا رہی تھی جو میں خود بھول نہیں پارہی تھی، سچ کہہ رہی تھی لیکن میں اب کیا کہوں؟ ”فرح مجھے گھوری دے رہی تھی۔“

”میں صرف اتنا کہوں گی کہ میرے دل میں ان کے لئے کبھی برا نہیں آیا ہاں میں مانتی ہوں کہ میں ان کے واپس آنے کا انتظار کرتی ہوں۔ انہیں بھلا نہیں سکتی بس اور کیا کہوں؟“ میرا اداس چہرہ دیکھ کر وہ میرے پاس آئی۔

”تمہیں اندازہ ہے تم کتنی بڑی بے وقوف ہو؟ تم ان لڑکوں کی فطرت کو سمجھ نہیں رہی ہو یا سمجھنا نہیں چاہتیں؟“ اس کا پھر شروع ہو چکا تھا وہ سمجھا رہی تھی



کہ لڑکوں کی فطرت کیسی ہوتی ہے لیکن لڑکیوں میں اگر میں کہوں کہ کوئی غلط ہے تو اس وقت فرح تیمور میرے سامنے تھی۔

”تم مجھے لڑکوں کی فطرت بتاؤ گی اور اپنے بارے میں کب تک پھر دو گی؟“ میں نے اسے ہی سنا دیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ شاید وہ سمجھ گئی لیکن ڈرامہ تو میرے سامنے ہی کرنا تھا۔

”مطلب یہ کہ لڑکیوں کی فطرت مجھے سمجھاؤ گی یا لڑکوں کی لڑکیاں کیسے دل توڑتی ہیں؟“ میں نے صاف بات کر دی۔

”میں نے بھی دل نہیں توڑا اگر خود ٹوٹ جاتا ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں؟“

”اہیں ایلی تو دے سکتی ہوتا؟“ میری بات سن کر اس نے ہنسی اچکا میں۔

”بی بی رہنے دو، عورت پر الزام نہیں آتا مرد ذات پر ہی آتا ہے کہ وہ ہی دل توڑنے کے ایکسپرٹ ہیں۔“ اس کی بات پر میرا دل پتا نہیں کتنے آنسو رونے لگا۔

”ہاں اور تم ان کے ہی نقش قدم پر تو چل رہی ہو، وہ بھی تو بہن بنادیتے ہیں یا تو کہتے ہیں کہ ہم نے شادی کا وعدہ کیا ہی نہیں تھا تو امید کی کٹھڑی کیوں باندھی۔“

میں کم تھوڑی مانتھی بنانے پر آؤں تو رکتی نہیں تھی۔

”میں ان کے نقش قدم پر کیوں چلوں گی بھئی؟ میری عقل کیا گھاس جرنے لگی ہے؟ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں، لڑکوں کی اپنی مرضی ہوتی ہے وہ جیسا سمجھیں۔ پر میں تو یہی کہوں گی کہ میں انہیں بھائی ہی سمجھتی ہوں۔“

”ہاں اپنے شوہر کو بھی بھائی ہی سمجھنا۔“ میں نے اس کی بات پوری کرنے کی جسارت کی۔

”لاحول ولا قوۃ۔ یہ تم ہی ایسی فضول سوچ رکھ سکتی ہو میں نہیں۔“ اس نے پھر مجھ پر گولی چلائی میں نے بھی پانی والی کن اٹھانے کا سوچ لیا۔

”لڑکیاں چالاک ہو جائیں جتنی بھی، لیکن ان کی فطرت میں معصوم پن اور بھولائپن تو کہیں نہیں جانا، اس ہی کا فائدہ وہ اٹھا سکتی ہیں کسی کا دل جیت کر تو کسی کا دل توڑ کر۔“ میں نے فرح کو کہا۔

”اچھا تو تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم بھی چالاک ہو؟“ اس نے تو یہ پالی والی کن میری طرف کر دی۔

”میں چالاک ہوں بھی تو اس چالاک میں بھی پیار جھلکے گا اور لوگ سمجھ بھی جائیں گے پر تم اپنے آپ کو کوئی چالاک لومڑی کہو گی۔“ میری بات پر وہ میرے پاس آ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور مجھے گھورنے لگی۔

”چالاک ہونے کے باوجود ان میں عقل نام کی چیز ہوتی ہے جس سے وہ سمجھ جاتی ہیں کہ کون اسے بے وقوف بنا رہا ہے، تم لڑکیاں بھی ناں بس جو بیٹھے بول بولے، اسے اپنا خیر خواہ سمجھ کر دل کی بازی ہار جاتی ہو اور اس کا خمیازہ تم لڑکیوں کو عمر بھر بھگتنا پڑتا ہے۔“ میں اب اسے غور سے سن رہی تھی۔

”پر میں پھر بھی کہوں گی کہ ان کا احساس جاگتا ہے، آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں ترسوں۔“

”مرسوں مرسوں مرسوں۔“ میں بول ہی رہی تھی کہ مجھے مرسوں مرسوں یاد آ گیا۔

”جب انسان کا پیٹ بھر چکا ہوتا ہے تو اسے پھر کھانے کی ضرورت نہیں ہوتی، اسی طرح ایک دفعہ لڑکی سے دل بھر جائے وہ دوبارہ اس کی چاہ نہیں رکھتا۔ یہ انسان کی فطرت سمجھ لو کہ اسے من پسند جب کھانا ہوتا ہے وہ کافی دن انتظار کے بعد کھاتا ہے روز کھائے گا تو پور ہو جائے گا، لڑکے بھی جب روز روز بات کرتے ہیں انہیں کتنی شاید اچھا لگے پھر وہ اکتا جاتے ہیں جیسے ہم ایک ہی چیز کھا کھا کے اکتا رہے ہوتے ہیں۔ اس لئے تو وہ دور ہو جاتے ہیں اور جب ان کا دل کرتا ہے تب ہی بات کرتے ہیں۔“ یہ فرح کے پچھر کی ٹپ تھی شاید جو وہ خالصتاً میرے گوش گزار کر رہی تھی۔

”مجھے اس کی کبھی ہوتی بات پر وہ لوگ یاد آنے لگے جنہوں نے پیار کا اظہار کیا پھر کوئی مجبوری آگئی ظالم سماج کی طرح اور دور کر گئی، لیکن پھر معافی تلانی کر کے واپس جوڑ دیتی اور پھر کچھ عرصے میں پھر دوری آ جاتی۔“

”میں اب بھی کہوں گی فرح کہ اگر ہم لڑکیاں سزا بھگت رہی ہیں تو لڑکے بھی خوش حال تو نہیں بنائے رہتے ہوں گے۔ کہاناں انہیں ہماری یاد ستانی ہوگی، بھی تو وہ شادی کے بعد بھی ہم سے رابطے میں رہتے ہیں۔“ میرا یہ خام خیال تھا اور میں ہی دھجیاں اڑانے میں مگن تھی۔

”لڑکیوں کا دل آج تک سمجھ نہیں آیا، ان کی طرف ہی زیادہ مائل ہوتا ہے جو انہیں محض اس وجہ سے چھوڑ دیتے ہیں کہ انہیں اب وہ پیار وہ چاہ نہیں رہی



”تم ایسا کرو دونوں کا رونا رولو، لڑکے بھی دھوکہ دیتے ہیں لڑکیاں بھی ٹھیک ہے ناں؟“ وہ کپڑے جھاڑتی ہوئی اچانک اٹھ گئی۔

”جاری ہو؟“ میں نے دل میں خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ایک بھائی نے کام کہا تھا وہ کرلوں پھر آتی ہوں۔“ اس کی بات پر مجھے تپ چڑھ گئی اس لڑکی نے تو سب کو بھائی بنایا ہوا ہے جیسے سب اس کے سگے ہوں میں نے بھی اس کی بات پر ہنکارتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ اس کی بات سمجھ نہیں آتی وہ کس طرف تھی؟ لڑکیوں کے یا لڑکوں کے؟ اور میں صرف ان یادوں میں ہی گھری رہتی ہوں افسوس بھی کرتی ہوں خود پر لیکن دل کے ہاتھوں مجبور بھی ہوں۔ مجھے ایک ایک کر کے وہ سب یاد آنے لگے جنہوں نے مجھ سے پیار کا دعویٰ کیا اور پھر چھوڑ دیا، جب چھوڑ ہی دینا تھا تو بقول فرح کے وہ واپس کیوں آتے ہیں یہ کیسا پیار تھا؟ کہ ساتھ بھی نا دو لیکن وقت بھی گزار لو۔ اور میں اس بات کو یہ بھتی ہوں کہ چلو بے وقوف ہی کبھی شاید وہ سمجھ جائیں کہ میں اب بھی ان کی منتظر ہوں۔ وہ جا چکی تھی اور میں وہیں چائے کی چکیاں لیتے ہوئے ان ہی لوگوں کی یاد میں گھولی ہوئی تھی۔ شاید نہیں بلکہ۔ یقیناً غلطی ہماری ہوئی ہے جو پنا سوچے سمجھے ایسا قدم اٹھا لیتی ہیں اور پھر عمر بھر اس کا روگ پال کر سوگ مناتی ہیں۔ فرح اگر غلطی کر چکی یا بے تو عازرہ بھی ہے لیکن یہ ابن آدم بھی کسی کے سمجھ میں نہیں آتا تو بنت خوا بھی نہیں، بنت حوا نازک ہے، بے وقوف ہے، اسے بہکانا بہت آسان ہے اور یہ آدم کے بیٹے جن پر شیطان غالب آ جاتا ہے تو وہ بھی بہک جاتے ہیں، تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجاتی، اگر تو ہم مردوں کو کہیں گے کہ وہ بری ہیں ایک دوسرے کو الزام کے ترازو میں تولتے تولتے یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ اللہ نے ایک حد مقرر کر رکھی ہے۔ جو اس حد کو پار کرے گا وہ خود ہی اس کا ذمہ دار ہوگا۔ ہم لوگ خود اپنی عزت کو مجروح کر دیتے ہیں اور الزام ایک دوسرے پر لگا دیتے ہیں۔ خود کو ایسے شیلڈ میں ڈھال دیں کہ کوئی چھو بھی نہ سکے یہی بہتر ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

کیونکہ وہ گھر کے کاموں میں الجھے ہوتے ہیں گھر کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں اس لئے وہ دور ہو جاتے ہیں اور جب ان کی کہیں اور شادی ہو جاتی ہے تو انہیں پھر وہ پرانی لڑکی یاد آتی ہے پھر زندگی کے کسی موڑ پر وہ لڑکی مل جائے یا رابطہ بحال ہو جائے تو ان کا دل اٹھیلیاں کرتا رہتا ہے۔ یہیں سے ان لڑکیوں کا دل ان کی طرف آنے لگتا ہے کہ یہ بے وقوف قوم بھتی ہیں کہ انہیں اب بھی ان سے پیار ہے، ان لڑکوں کو کیوں سمجھ نہیں آتی کہ بیوی کے آ جانے کے بعد کیسے اور کیوں احساس جاگ جاتا ہے؟“ اور یہ میڈم فرح تیمور نے زوردار چھکا مارا تھا کہ گیند ہی باؤنڈری کے باہر چلی گئی تھی میں ہاتھ مل رہی تھی اب کیا جواب دیتی مجھے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا۔ ”چلو یہ تو تم نے کہہ دیا کہ لڑکیاں بے وقوف ہیں اور لڑکوں کا بھی سمجھ نہیں آتا واقعی۔“ میں دل میں سوچ رہی تھی کیونکہ ایسا واقعی میرے ساتھ ہوا تھا۔ ”پر یہ بتاؤ کہ لڑکیاں کیوں دھوکہ دیتی ہیں؟“ میں نے بھی گیند زور سے پھینکنے کے بعد سوچا کہ وہ کھیل ہی نہ سکے۔

”وہ اس لئے کہ انہیں لگتا ہے کہ وہ اپنی لڑکی ہونے کا فائدہ اٹھا رہی ہیں جبکہ وہ خود اپنے آپ کو ذلیل و خوار اور رسوا کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔“ میں یہ کیا کہہ گئی؟ میں بس فرح کو دیکھ رہی تھی۔

”عازرہ..... یہ لڑکیاں اگر اپنے آپ کو ذلیل نہ دیں اور کسی بھی لڑکے کو اجازت نہ دیں تو وہ ان کے معصوم دل سے کھیل ہی نہیں سکتا۔“ یہ فرح کہہ رہی تھی؟ اور میں سن رہی تھی۔

”لیکن فرح، لڑکیاں کیوں ایسا کرتی ہیں وہ بھی تو لڑکوں کو دھوکہ دیتی ہیں ان کا دل توڑ دیتی ہیں۔ اس حساب سے دونوں قومیں ہی غلط ہوئیں ہیں ناں؟“ اگر فرح دونوں کو ہی قصور وار ٹھہرا رہی تھی تو پھر ہم بھی تو لڑکیاں ہی تھیں ہم صرف لڑکوں کو ہی کیوں کہتے ہیں؟ میں جس جگہ بیٹھی ہوئی تھی چائے کے ساتھ ساتھ میں سامنے بیٹھے کوئے کی اچھل کود دیکھ رہی تھی۔ ہم نے دو مٹی کے برتن رکھے ہوئے تھے پرندوں کے لئے پانی بھر کر۔ کوئے میاں بھی ایک برتن میں جاتا بھی دوسرے میں اور خود ہی مزے سے اپنے اوپر پانی کے چھینٹے گرا رہا تھا۔



# ایسا ہی ہوتا ہے

دیے تھے۔ بیٹی اشنا اور بہو سعدیہ کی آسانی کو مد نظر رکھتے ہوئے۔ جھاڑو پوچا ہمیشہ کی طرح ماسی ہی کرتی تھی۔ صرف بہو کے ذمہ کھانا لگا دیا تھا۔ تاکہ صبح اپنے حساب سے اٹھ سکیں۔ کیوں کہ امی اور ابو فجر کے بعد ہی ناشتہ کر لیتے تھے جو امی بنا لیتی تھیں اور آج بھی اسی روٹین پہ قائم تھیں۔

امی ہرگز بھی ان خواتین میں اپنا نام نہیں لکھواتا جاتیں تھیں جو بہوؤں کو ایک روٹین سمجھ کے دن رات گھر کے کاموں میں جھونک دیتی تھیں۔

اس گھر کی جو روٹین تھی امی نے وہ برقرار رکھی اور ناشتہ وہی بناتی رہیں جب کہ دوپہر کا اور رات کا کھانا سعدیہ کے حوالے کر دیا اور اشنا کے ذمہ چھوٹا موٹا کام یعنی کھانا لگانا، اٹھانا، برتن دھونا اور شام کی چائے لگادی، لیکن اشنا کے لیے یہ کام بھی پہاڑ سر کرنے کے مترادف ہوتے۔

☆.....☆

شام کی چائے بنانے سے پہلے اشنا کا معمول تھا پانچ منٹ کی تقریر کرنا۔ اپنے سنہرے خیالات سعدیہ کو سنانا جو رات کے کھانے کے لیے یا مینو مرتب کر رہی ہوتی یا آٹا گوندھ رہی ہوتی کے مغرب کے فوراً بعد کھانا کھا لیا جاتا تھا۔

اشنا کے سنہرے خیالات میں سرفہرست یہ تھا۔ ”میری شادی کرتے وقت دھیان رکھا جائے، میاں چٹورا نہ ہو، سسرال چھوٹی ہو، ماسیاں لگی ہوں،

”کاش گھروں میں بچن نامی جگہ ہی نہ ہوتی تو دنیا میں کتنا سکون ہوتا۔ نہ ہی روز کا سوال ہوتا آج کیا کئے گا؟ نہ ہی سائیں اپنی بہو سے سوال کرتیں۔ کیا کیا پکانا آتا ہے؟ نہ بیویوں کو پریشانی لاحق ہوتی۔ آج میاں کے لیے کیا پکا کے معدے کے راستے مزید اندر گھسیں اور اور اور.....“ اشنا کے روز کے دکھ جاری و ساری تھے وہ ہمیشہ کی طرح بلند آواز میں اپنے اقوال زیریں گھر والوں کی سماعت تک پہنچانے کی کوشش میں تھیں۔ لیکن گھر والے بھی اس حرکت کے عادی ہو چکے تھے۔ سو کسی کے کانوں پہ جوں بھی نہیں رینگتی تھی۔ جب اشنا نے دس پندرہ منٹ کے داویلا مچانے کے بعد دیکھا کوئی متوجہ ہی نہیں، تو شرافت سے بچن میں جا کے برتن دھونے اور شام کی چائے کی تیاری کرنے میں ہی عافیت جانی۔

☆.....☆

امی، ابو، اشنا اور علی اس چھوٹی سی متوسط طبقے کی فیملی میں صرف ایک فرد کا اضافہ ہوا تھا جو علی کی زوجہ حیات بن کر اس گھر کی رونق میں اضافہ کرنے کا باعث بنی تھیں۔ سعدیہ بھالی ایک پڑھی لکھی اور سنجھی ہوئی خاتون تھیں۔ امی بھی بیٹے کی شادی کے بعد ہر ممکن کوشش کرتیں کے روایتی طرز کی ساس بہو کے اختلاف سے پرہیز ہی کریں۔ تاکہ گھر کا ماحول نہ خراب ہو اور چھوٹی سی فیملی سکھ و سکون سے رہ سکے۔

اسی لیے انہوں نے بہو کے آتے ہی کام بانٹ







جب سفیان کے آفس کا پہلا دن تھا۔

☆.....☆

”اشنا، اشنا۔“ کوئی بہت دور سے آوازیں لگا رہا ہو جیسے۔

”اشنا۔“ اچانک کانوں کے پاس بلاسٹ سا ہوا۔

”کیا ہوا؟“ اشنا نے ایک دم گھبرا کے آنکھیں کھول

کے دیکھا تو میاں جی پاس کھڑے اسے پکار رہے تھے۔

”اوہو حد ہو گئی کتنی گہری نیند سونی ہو۔ کب سے

آوازیں لگا رہا ہوں۔“ اشنا جس کا دل تیزی سے

دھڑک رہا تھا۔ ذرا سنبھل کر کہ میاں جی شاید پیار سے

جگا جگا کے تھک گئے ہوں گے اسی لیے زرا زور سے آواز

لگا دی ہوگی۔ جو اشنا کو بم کی آوازیں لگی تھیں۔

”کیا ہوا، بتائیں تو؟“ اشنا نے آخر کار سوال پوچھا۔

”ارے بھئی اٹھ جاؤ آٹھ بج رہے ہیں۔ ناشتہ ہمیں

بنانا کیا نو بجے میں نکل جاتا ہوں۔ سچ ساتھ لے کے

جاتا ہوں، واپس آنا مشکل ہو جاتا ہے میرے لیے۔“

”جی؟“ اشنا کی رہی سہی نیند ایک ہی جھٹکے میں اڑ

گئی۔ اور آنکھیں باہر ابلنے کو کھیں۔

”اور ہاں بات سنو۔“ میاں جی نے ہاتھ روم

جاتے جاتے پلٹ کے کہا۔ اشنا جو مرے مرے انداز

میں بیڈ روم کے دروازے تک آئی تھی فوراً اسی آس

میں مڑ کے جی بولا شاید ارادہ بدل گیا ہو۔ اور جان بچ

جائے چن میں جانے سے۔

”وہ یار پہلے میں اکیلا تھا تو آفس والوں کے

ساتھ ان کا سچ شیر کر لیتا تھا اب تم ایسا کرنا 2,3

لوگوں کا سچ بھی بڑھا دینا۔ آخر معلوم تو ہو سب کو

سفیان بھی اب بیوی والا ہو گیا ہے۔“ میاں جی جیسے

صور پھونک کے ہاتھ روم میں چلے گئے اور اشنا کے

کانوں میں سعدیہ ہی کی آواز گونج رہی تھی۔

”اگلوتے ہیں نو سسرال نو چن۔“ بھابی نے یہ تو

بتایا نہیں تھا آفس سچ جاتا ہے۔

☆.....☆

کوک ہو تو بات ہی کیا ہے۔ کسی بہانے سے بتا دیا جائے کہ اشنا کو چن سے الرجی ہے وغیرہ وغیرہ۔“ سعدیہ بھی معمول کے مطابق گردن ہلا ہلا کے بتاتی وہ سب سن رہی ہے اور عمل کرنا نہ کرنا تو بعد کی بات تھی نا۔

☆.....☆

خیر انہی سکون و آرام کے ماحول میں B.A کے آخری سپر ز کے بعد جب اشنا نے گھر میں قدم رکھا تو کچھ غیر معمولی محسوس ہوا۔

امی آنکھوں میں نمی لیے اسے تک رہی تھیں۔

بھابی کے چہرے پہ شرارتی مسکان تھی۔ اور تو اور ٹیبل

پہ چائے برتن اور مٹھائی بھی رکھی تھی۔

”کیا ہوا بھابی! خیر تو ہے۔“

آخر ذیادہ دیر تک برداشت نہ ہوا تو پوچھ ہی لیا۔

”بنو! اب آپ پرانی ہونے جاری ہیں۔“ بھابی

نے شرارتی لہجے میں قہقہے سی مسکان چہرے پہ سجا کے بولا۔

”ہیں.....“ اشنا نے ہونق بن کے پوچھا۔

”فکر نہ کرو میرے کزن ہیں اور اگلوتے ہی

ہیں۔ نو سسرال نو زیادہ کام۔“ بھابی نے قہقہہ لگاتے

ہوئے مزید تفصیل دی۔ اور امی بھی ساتھ مسکرا دیں تو

اشنا کو احساس ہوا یہ تو شرمانے کا موقع ہے اور ساتھ ہی

اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

☆.....☆

رشتہ بکا ہوتے ہی کاموں کی ایک ناختم ہونے والی

فہرست آگئی۔ حالانکہ سفیان نے سختی سے جہیز جیسی

خرافات کا منع کر دیا اکیلے تھے اور آفس کی طرف سے

ایک فلیٹ ملا ہوا تھا فل فرنش تو کسی مزید فرنیچر کی

گنجائش نہ تھی۔ لیکن پھر کراکری اور پرسنل کپڑے،

پارلر جیسے ہی کام بے تحاشہ تھے۔ اللہ اللہ کر کے رخصتی کا

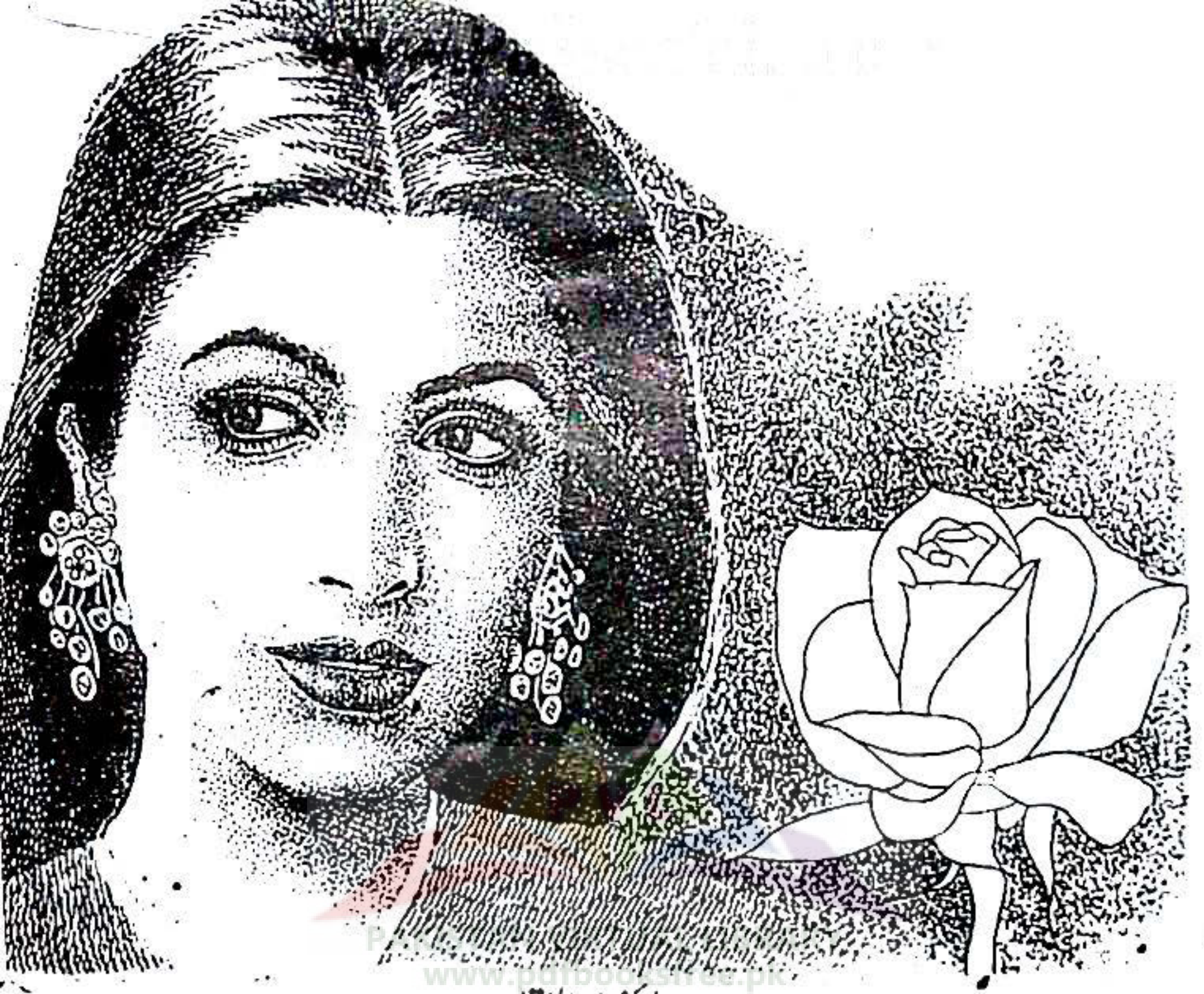
دن آن پہنچا تو معلوم ہوا دن تو پر لگا کے اڑ گئے تھے جیسے۔

شادی کے بعد ہی ہنی مون کے نام پہ مری، کاغان بھی گھوم

آئے اور زندگی ایک دم جیسے پرسکون جھیل کی مانند ہو گئی۔

اس جھیل میں پہلا پتھر شادی کے بیس دن بعد پڑا





عائشہ ذوالفقار

سلسلہ وار ناولٹ

# لڑجھال بیری بیری

”کہاں سگم ہے۔ چائے کب کی ٹھنڈی ہوگئی۔“ سلمان اس کے آگے پڑے چائے کے کپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ حارث نے چپ چاپ کپ اٹھالیا۔  
 ”کیا بات ہے، پریشان ہے۔“ سلمان نے پوچھا۔  
 ”نہیں بس ایسے ہی۔“ اب اسے کیا بتاتا۔ وہ ابھی ابھی عمیر راؤ کی جانب سے Get well soon کے دوکارڈز وصول کر کے بیٹھا تھا۔ دل اداس ہوا جا رہا تھا۔  
 ”کچھ تو ہے، بتادے۔ بوجھ ذرا کم ہو جائے گا۔“ سلمان بھی آخر اس کا دوست تھا۔  
 ”بس یار! حائقہ کے بارے میں سوچتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ اچانک آنکھ کھلی اور خواب ٹوٹ گیا۔“ حارث کی آواز خالی خالی ہو رہی تھی۔





PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

”ابھی تو شروعات بھی نہیں ہوئی تھی سلمان! ابھی تو میں نے خوش ہونا سیکھا بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ بہت ہو گیا عمیر کا راج۔ بہت حکومت کر لی اس نے، اب شاید میری باری ہے۔ حائقہ کی صورت میں ایک کرن ملی تھی کہ شاید اب میں اس اکیڈمی کو اس کا وہ مقام دلا سکوں گا جو کئی سال پہلے ختم ہو گیا تھا مگر.....“ حارث نے گرنے کے انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

”مگر سب کچھ سوچوں میں ہی رہ گیا۔ خیال سے حقیقت بن ہی نہ سکھا۔“ سلمان نے ایک لمبی سانس بھری۔

”شاید ابھی ہمارا وقت ہی نہیں آیا تھا حارث! شاید ہم نے غلط وقت کو صحیح سمجھ لیا۔“ حارث نے ہولے سے

سر ہلایا۔

”نہیں سلمان! ہمارا وقت آیا تھا لیکن شاید عمیر کا وقت ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اس لیے آ کے جلد ہی چلا گیا۔ عمیر کا راج ابھی باقی ہے۔ ابھی اور بادشاہت کرنی ہے اسے، اس کا وقت ختم ہو گا تو ہمارا آئے گا۔“ سلمان آگے کو ہوا۔

”اور اس کا وقت کب ختم ہو گا۔“ حارث نے کندھے اچکائے۔

”خدا جانے، برا بھی تو ہو گا ہر عروج کو زوال آتا ہے۔ اسے بھی آئے گا اسی امید پر تو اب تک ڈٹا ہوا ہوں



میں، ورنہ اندر سے تو کب کا ختم ہو چکا، کب کا مر چکا۔“ حارث نے گوشوں میں آیا پانی صاف کیا تھا۔

☆.....☆

کئی دن لگ گئے مجھے اس خالی پن سے نکلنے میں، عالیہ اور میڈم شمینہ دونوں کا رویہ بہت بہتر ہو گیا۔ وہ بے شک عمیر کی والدہ تھیں مگر زمانہ شناس تھیں۔ اپنے بیٹے اور میرے شوہر میں فرق اچھی طرح سمجھ چکی تھیں۔ اس دن میں برتن دھو رہی تھی۔ جب عالیہ نے بتایا کہ F.Sc کا رزلٹ آ گیا ہے۔ اسی نے مجھے عارش کے مارکس بتائے۔ 92% میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس رات کے بعد میں آج پہلی بار ہنسی تھی۔ F.Sc کے رزلٹ کے پانچ دن بعد انٹری ٹیسٹ کا رزلٹ بھی آ گیا۔ کلیئر نہ ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس رات میں نے ہمت کر کے خود عمیر سے بات کی۔

”عمیر! میرے اکاؤنٹ میں ڈھائی لاکھ روپے ہوں گے اس وقت، مجھے ایک بار عارش سے ملو ادیں، میں اسے سب سمجھا دوں گی۔ فرسٹ ایڈمیشن تو ہو ہی جائے گا اس کا آگے پھر دیکھا جائے گا۔“ مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ میں اس شخص سے بات کر رہی تھی جس کے دل میں میرے لیے صرف ایک جذبہ تھانفرت کا۔ جس کی زندگی کا اب صرف ایک ہی مقصد تھا۔ مجھے اذیت دینا۔ میں اس شخص کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر رہی تھی جس کے نزدیک میری ہی کوئی وقعت نہ تھی تو میری خواہش کی کیا ہوتی اب بھی اس نے کوئی نوٹس نہ لیا۔

”ملو ادیں گے ناں مجھے عارش سے۔“ میں نے کوئی جواب نہ پا کے دوبارہ پوچھا تھا۔ عمیر نے قہر بار نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”بس اس کے بعد اور کچھ نہیں کہوں گی۔“ میں نے سہم کر کہا تھا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھنے کے بعد منہ دوسری طرف کر کے لیٹ گیا۔ میں چپ بیٹھی رہ گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس نے مجھے چوتھی مرتبہ مارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگلے دن تقریباً عصر کے وقت مجھے عالیہ نے آکر بتایا کہ عارش آیا ہے۔

”عارش!“ خوشی کی انتہاؤں کو چھوٹی ہوئی میں بھاگ کر نیچے آئی تھی۔ عارش ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں کوشش کے باوجود اس کے چہرے پر خوشی نہ کھونج پائی، اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ شاید رو کر آیا تھا۔

”عارش! میرے پاس پیسے۔“ میرے بولتے ہی اس نے انگلی اٹھا کے مجھے خاموش کروا دیا۔

”ہتا ہے حاری! اس رات جب ابو جی تجھے مار رہے تھے ناں مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ تو نے وہ سب کیا ہے۔ جب تیرا خون نکلا تھا تب بھی مجھے بہت دکھ ہوا۔ جب ابو جی نے زبردستی تجھ سے سر عمیر کے پاؤں چومنے کو کہا۔ تب بھی میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ جب ابو جی تجھے گھسیٹ کے دروازے تک لے گئے تب میرا اتنا دل چاہا کہ انہیں روک دوں۔ انہیں کہوں کہ حاری نے کچھ نہیں کہا۔ جب ابو جی نے تجھے گھر سے باہر نکال کر دروازہ بند کر دیا تو میں بہت رویا حاری! میرا بہت دل دکھا۔“ عارش کی آواز بھرا گئی۔ میں نے بمشکل اپنے آنسو روکے ہوئے تھے۔ نہ جانے وہ یہ سب کیوں کہہ رہا تھا۔

”لیکن ہتا ہے حاری! سب سے زیادہ دکھ مجھے یہ دیکھ کر ہوا۔“ اس نے صوفے پر پڑا ڈبہ میری طرف اچھالا تھا۔

”سب سے زیادہ میں اسے دیکھ کر رویا حاری!“ عارش اب بھی رو رہا تھا۔ میں نے تیزی سے ڈبہ کھولا۔ اس میں صرف راکھ بھری ہوئی تھی۔

”حاری! تو نے صرف ڈھائی لاکھ نہیں جلائے، تو نے مجھے جلا دیا۔“ عارش کی بات میرے ہوش اڑا گئی۔ وہ



ذرا سی راکھ میرے ڈھائی لاکھ تھے۔ عمیر نے انہیں بھی جلا دیا اور راکھ عارش کو بھجوا دی۔ میں اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ بے یقین آنکھوں سے اس راکھ کو دیکھتی رہ گئی۔

”حاری! میرا کیا قصور تھا۔ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ مجھ سے کس چیز کا بدلہ لیا ہے تو نے یہ بھجوا کے۔“

آنسوؤں اور سسکیوں کے درمیان عارش سے بولنا دو بھر ہو رہا تھا۔

”عارش! میری بات سن، میں نے نہیں جلائے یہ پیسے، میں کیوں کروں گی بھلا ایسا۔“ دکھ اتنا شدید تھا کہ مجھ سے بولا ہی نہ گیا۔

”حاری! میں نے تو تجھے نہیں کہا تھا کہ مجھے ڈاکٹر بننا ہے۔ میں نے تو نہیں کی تھیں تیری منتیں تو نے مجھے زبردستی یہ خواب دکھائے تھے۔ تو نے مجھے زبردستی ہاتھ پکڑ کر اس رستے پر چلایا۔ تو نے مجھے بائو رکھوائی۔ ابو جی اور اماں کی ایک نہ سنی۔ یاد ہے ناں میری ہر بات کے جواب میں تو کیا کہا کرتی تھی۔ عارش اور کچھ نہیں صرف ڈاکٹر.....“ عارش پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ میں اسے چپ بھی نہ کروا سکی۔

”کہا تھا کہ مجھے ڈاکٹر بننا ہے۔ میں نے تو نہیں کی تھیں تیری منتیں۔ تو نے مجھے زبردستی یہ خواب دکھائے تھے۔ تو نے مجھے زبردستی ہاتھ پکڑ کر اس رستے پر چلایا۔ تو نے مجھے بائو رکھوائی، ابو جی اور اماں کی ایک نہ سنی۔ یاد ہے ناں میری ہر بات کے جواب میں تو کیا کہا کرتی تھی۔ عارش اور کچھ نہیں صرف ڈاکٹر۔“ عارش پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ میں اسے چپ بھی نہ کروا سکی۔

”بیچھے سے دھکا لگا لگا کے تو نے مجھے میڈیکل کی طرف چلا دیا۔ میری آنکھوں میں صرف ڈاکٹر بننے کے خواب سجادیئے اور جب میں نے جان ماردی، میڈیکل کے علاوہ ہر رستہ اپنے اوپر بند کر لیا۔ ڈاکٹر بننا اپنا جنون بنا لیا۔ کنگ ایڈورڈ میں جانے کا رستہ ڈھونڈ لیا تو نے کیا کیا حاری۔“ میں ایک دم عارش کے قریب آئی تھی۔

”عارش میں نے کچھ نہیں کیا۔ خدا کی قسم میں نے کچھ نہیں کیا۔“ میں نے عارش کے دونوں بازو پکڑے تھے جنہیں اس نے بری طرح جھٹک دیا۔

”میں کل سے رو رہا ہوں حاری! ہر چیز مکمل ہے، ہر شرط پوری ہے، بیسواں نمبر پر نام ہے میرا، K.E کا گیٹ کھلا ہے مگر میں نہیں جاسکتا جو کچھ تو نے کیا ہے اس کے بعد تو کوئی سیدھے منہ بات نہیں کرتا نہ کہ ادھار دے دے، جتنی نفرت آج تجھ سے ہو رہی ہے اتنی کبھی نہیں ہوئی تو مر بھی رہی ہوگی ناں تو معاف نہیں کروں گا تجھے۔“ عارش دونوں آنکھیں رگڑتے ہوئے بولا تھا۔

”عارش! میری بات سن، مجھے سچ میں نہیں پتا۔“ عارش نے مجھے دونوں کندھوں سے پکڑ کے جھنجھوڑ دیا۔

”بس کر دے حاری! میں اس دکھ سے مر گیا ناں تو قاتل ہوگی اور اگر نہ مرا تو ہر سانس کے بدلے تجھ سے صرف نفرت کروں گا، صرف نفرت۔ تیرے مرنے کے بعد تیری قبر بھی دیکھنے نہیں آؤں گا۔“ انتہائی نفرت سے کہتا وہ باہر نکل گیا تھا۔ میں اسے روکتی رہ گئی۔ آج ایک اور دفعہ درگور ہو گئی تھی میں۔

☆.....☆

عارش پورے ڈسٹرکٹ کا پاپر تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اس کا انٹری ٹیسٹ کلیئر ہو گیا تھا۔ اس کے میڈیکل میں نہ جانے کی خبر واقعی بے یقین تھی۔ حمزہ نے تو باقاعدہ اسے اپنے پاس بلایا۔ اس کی اکیڈمی کی جان تھا وہ۔

”عارش! لوگ ترس جاتے ہیں یہ وقت پانے کے لیے کئی کئی سال ضائع کر دیئے جاتے ہیں مگر دروازہ نہیں



کھلتا اور تم کھلے دروازے سے واپس پلٹ رہے ہو۔“ عارش کے آنسو نکلے تھے۔

”سر! شاید میری قسمت میں نہیں لکھا۔“ حمزہ نے سانس بھرا۔  
”دیکھو عارش! میں ترس نہیں کھا رہا۔ کوئی احسان بھی نہیں کر رہا، میں کروادیتا ہوں ایڈمیشن۔“ عارش نے نفی

میں سر ہلایا۔

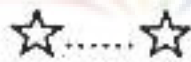
”نہیں سر! اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی آپ اتنی بڑی بات کہہ رہے ہیں یہ بھی بہت ہے تھینکس بٹ  
نو.....“ حمزہ نے سانس بھر کے اسے دیکھا۔

”حائقہ! نے کوئی رسپانس نہیں دیا۔“ عارش اس کی بات سن کے چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔  
”دیا تھا ڈھائی لاکھ روپے، جلا کے ان کی راکھ بھجوا دی ہے، بقول اس کے جب ہم نے اس کے ساتھ اچھا  
نہیں کیا تو وہ کیوں کرے؟“ حمزہ اس کی بات سن کر دنگ رہ گیا۔

”یہ سب اس نے خود تم سے کہا؟“ اس نے پوچھا۔  
”نہیں سر عمیر نے بتایا ہے۔“ حمزہ بول نہ سکھا۔ کتنی عجیب بات ہے ناں کہ کبھی کبھی ہمیں سب کچھ ٹھیک پتا  
ہوتا ہے اور سامنے والے کو غلط لیکن پھر بھی ہم اسے ٹھیک نہیں سمجھا پاتے، حمزہ بھی سب کچھ سمجھ جانے کے باوجود  
عارش کو کچھ نہ سمجھا سکا، شاید عارش آج اس جگہ کھڑا تھا جہاں چند ماہ پہلے وہ خود کھڑا تھا۔ جب حادثہ سب کچھ  
ٹھیک جانتا تھا اور وہ غلط اور حادثہ کوشش کے باوجود اسے ٹھیک سے سمجھا نہیں پایا تھا۔

”سر! آئی وٹش کے کسی کی بہن ایسی نہ ہو۔“ حمزہ کو لگا جیسے وہ آنسو روک رہا ہو۔

”ورنہ نہ ہو۔“ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔



اس دن وہ حمزہ سے ملنے آیا تھا۔ حمزہ اسے دیکھ کے خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔

”آج میری یاد کیسے آگئی؟“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”ایک کام تھا تم سے، اس لیے آگئی۔“ حادثہ ہولے سے ہنسا۔

”بولو.....!“ حمزہ نے کہا۔

”سلمان آج کل یہاں ہے نہیں ورنہ میں تمہارے پاس کبھی نہ آتا، تمہیں شاید میری بات بری لگے بلکہ بہت  
بری لگے مگر تمہارے علاوہ اور کوئی نظر بھی نہیں آیا۔“ حمزہ آگے کو ہوا تھا۔

”بولو حادثہ!“ حادثہ نے ایک لمبا سانس لیا۔

”تمہیں تو پتا ہے کہ ناعمہ کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے۔ چھ دن بعد اس کی شادی ہے اس لیے میں اکیلا شاید منہج نہ  
کر سکوں۔ تم سے ایک چھوٹی سی ریکوئسٹ ہے کہ تم عارش کا ایڈمیشن کروادو۔ جیسے ہی میں ناعمہ.....“ حمزہ نے  
اس کی بات کاٹی۔

”حادثہ! وہ میرا سب سے اچھا اسٹوڈنٹ ہے، میرے چھوٹے بھائیوں جیسا، اللہ کا بہت شکر ادا کرتا ہوں  
میں کہ شروعات ہی عارش جیسے اسٹوڈنٹ سے ہوئی اس کے میڈیکل میں نہ جانے کاسن کے جتنا دکھ مجھے ہوا تھا  
میں بتا نہیں سکتا۔ تم سے پہلے ہی میں اسے یہ بات کہہ چکا ہوں۔“ حادثہ ایک دم چونکا۔

”پھر کیا کہا اس نے؟“ حمزہ نے اسے دیکھا۔

”منع کر دیا، شاید حائقہ کے رد عمل سے بہت زیادہ دکھی ہوا ہے وہ۔“ حائقہ کے ذکر پر حادثہ بری طرح چونکا۔



”حائقہ سے کب ملا وہ؟“ حمزہ نے چند لفظوں میں اسے ساری بات بتادی۔ حارث سن سا بیٹھا رہ گیا۔

”شاید وہ میری بات مان لیتا اگر یہ سب نہ ہوا ہوتا مگر وہ بہت زیادہ اپ سیٹ تھا۔ آنسو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ حارث یار! میرا دل کٹ گیا اسے دیکھ کے۔“ حمزہ بولا۔

”حائقہ ایک طرف اس کا کیا دھرا ایک طرف۔ لیکن سزا عارش کو نہیں ملنی چاہیے تھی۔“ حارث چپ تھا۔

”حائقہ سے نفرت اس کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔“ حارث نے اس کی طرف دیکھا۔

”ایسے ہی ہوگا اب، ہر نفرت اب اس کے حصے میں ہی آئے گی۔ اس کے اپنے گھر والوں کی۔ تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی اور شاید عمیر اور اس کے گھر والوں کی بھی۔“ حارث وہاں سے اٹھ آیا۔

دعویٰ تو بڑے تھے اسے حائقہ سے محبت کرنے کے مگر آج تک اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ کسی ایک کے دل سے بھی اس کی نفرت نہیں مٹا سکا تھا۔ حمزہ کی دفعہ بھی اس نے بہت کوشش کی تھی، عارش کی دفعہ بھی وہ صرف کوشش ہی کر سکا۔

”عارش بیٹے! پلیز اس سے اتنی نفرت نہ کرو کہ جب اس کے داغ دھلیں تو تم نظریں نہ اٹھا پاؤ، وہ میری کچھ نہیں لگتی مگر پھر بھی میں اسے بے قصور مانتا ہوں۔ تمہاری تو سگی بہن ہے پھر کیوں یقین نہیں کرتے ہو اس پر۔“ عارش اس کی بات سن کے ہنسا تھا۔

”کیونکہ 92 فیصد مارکس لینے کے باوجود بھی میں کنگ ایڈورڈ نہیں جاسکا۔ صرف اس کی وجہ سے۔“

حارث چپ رہ گیا۔

”پوری زندگی پاکبازی کی زندگی گزارنے کے باوجود آج میرے ابو جی کسی کے سامنے نظر اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔ صرف اس کی وجہ سے۔“ عارش کی آواز بھر آئی تھی۔

”آج میری ماں اسے بیٹی کہنے سے ڈرتی ہے۔ صرف اس کی وجہ سے آج میں سر حمزہ کے سامنے نظریں نہیں اٹھا پاتا۔ صرف اس کی وجہ سے۔“ عارش کی باتوں کا اس کے پاس شاید کوئی جواب نہیں تھا۔

”اور سر! رہ گئی یہ بات کہ اتنا سب ہو جانے کے بعد بھی آپ اس پر کیوں یقین کرتے ہیں۔ تو سر میں نہیں جانتا کہ کیوں کرتے ہیں؟“ عارش آنکھیں رگڑتے ہوئے باہر نکل گیا۔ حارث نے بے جان ہو کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ آج ہر فرد حائقہ سے نفرت کرتا تھا۔ اس کے والدین کے نزدیک وہ مرگئی تھی، عارش کے لیے وہ صرف قابل نفرت تھی۔ حمزہ کے گھر والوں کے نزدیک وہ گھٹیا پن کی انتہا تھی۔ حمزہ خود چاہے جتنا مرضی اپنے ظرف کو بلند کرتا مگر دل کے کسی کونے سے اس کی نفرت نکال نہیں سکا تھا۔ صرف وہ تھا جو اسے غلط نہیں کہتا تھا جو اسے بے قصور مانتا تھا۔ اس کی دو وجہ تھیں جس لڑکی کو اس نے پہلی بار ٹوٹ کر چاہا وہ حائقہ ارشد تھی اور جس شخص سے اس نے ٹوٹ کر نفرت کی وہ عمیر راؤ تھا جس کی وہ رگ رگ سے واقف تھا۔

☆.....☆

بڑے بوڑھے کہتے ہیں۔ وقت ہر زخم کے لیے مرہم کی طرح ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ اسے مندل کر ہی دیتا ہے۔ لیکن میرے لیے وقت نشتر ثابت ہوا۔ رفتہ رفتہ مجھے ادھیڑا ہی چلا گیا۔ میرے وجود کا کوئی حصہ نہ چھوڑا جہاں گھاؤ نہ ہو۔ جہاں سے خون نہ رستا ہو۔ جہاں درد نہ ہوتا ہو۔ عمیر نے پہلے دن سے مجھے مارنے کا جو کام اپنے سر لیا۔ اسے بخولی نبھایا۔ اس نے مجھے ایک ہی دفع ختم نہیں کیا۔ ہزار بار ختم کیا میری روح تک چھلنی کر دی مجھے اس گھر تک محدود کر دیا۔ باہر کی دنیا سے میرا ہر رشتہ، ہر رابطہ ختم کر دیا۔ میرے خوابوں، امنگوں، خواہشوں



امیدوں اور ارمانوں کو کچل کر ختم کر دیا۔ ہر صبح کی پہلی کرن کے ساتھ وہ مجھے میری اوقات یاد کروا کے اٹھتا تھا اور ہر رات کے پہلے ستارے کے ساتھ ہی مجھے میری اوقات یاد کروا کے سوتا تھا۔ اس کی ذات کا پیار، محبت، رحم، انسیت، ترس نہ جانے کس کے لیے تھے۔ میرے لیے نہیں تھے۔ میرے لیے کیا تھا۔ اس کی ذات کی نفرت، بغض، دشمنی، ظلم، بے حسی، تنفر، بے رحمی یہ سب میرے لیے تھا۔ جو ہر روز ملتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس قید خانے میں میری پہلی سردیاں آ گئیں۔ عمیر کی مرضی ہوئی، دل چاہے تو بیڈ..... نہیں تو فرش۔ میں خدا خدا کر کے رات کاٹتی۔ میرے جسم پہ کوئی نیا کپڑا برداشت نہیں ہوتا تھا اس سے۔ میں خود ہی کہہ کر عالیہ کے پرانے کپڑے اور جرسیاں استعمال کرتی۔ سردیاں اپنے جو بن پہ آ گئیں۔ کیونکہ کافی اور کمبل..... میرے لیے یہ تینوں چیزیں ہی پرانی ہو گئیں اور جیسے ہی سردیوں کا زور و ثا، بہار نے ہر طرف قبضہ کیا۔ کیونکہ ہونے لگے۔ کافی پھسکی لگنے لگی۔ کمبل تہہ ہونے لگے تو میرے وجود کا پہلا حصہ اس دنیا میں آ گیا۔ میری پہلی بیٹی..... جسے جنم دیتے میں ایک اور بار مر گئی۔

☆.....☆

اس دن کوئی بھی گھر پہ نہیں تھا۔ تینوں اپنے اپنے سکول گئے ہوئے تھے۔ اچانک ہی درد اٹھا اور بڑھتا ہی چلا گیا۔ برداشت کرتے کرتے میری بس ہو گئی۔ نہ جانے کیسے میں خود کو کھینچتی ہوئی بیرونی دروازے تک آئی تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرہ چھانے لگا۔ دیوار کا سہارا لے کر میں خود ہی ایک طرف چلنا شروع ہو گئی اور چند قدم چل کے ہی گر گئی۔ تکلیف کی انتہا پہ پہنچ کہ میری آنکھیں بند ہوئی تھیں۔ نہ جانے کس نے مجھے نزدیکی اسپتال تک پہنچایا تھا۔ کوئی بھی نہیں تھا میرے پاس۔ بس مجھے اتنا یاد ہے کہ درد کی حدوں کو چھوتے ہوئے میں نے اللہ کے بعد عمیر کو پکارا تھا۔ پتہ نہیں کتنی دیر میں اسپتال میں پڑی رہی۔ ذرا ہوش آیا تو خود ہی اٹھنے کی کوشش کی شام ہو رہی تھی۔ اسپتال والوں نے ہی مجھے گھر تک پہنچایا۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں جب میں اس چند گھنٹوں کے وجود کو آغوش میں لیے گھر میں داخل ہوئی۔ عمیر ادھر سے ادھر مکن میں چکر کاٹ رہا تھا۔ عالیہ سیڑھیوں پہ بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔

”کہاں گئی تھیں تم.....؟“ میرے بازوؤں میں چھپے وجود کو دیکھ کے اس کا اٹھا ہاتھ فضا میں ہی رہ گیا۔ میں نے شکوہ کناں نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بھائی میں نے کہا بھی تھا کوئی مسئلہ ہو گیا ہو گا۔“ عالیہ تیزی سے میری طرف آئی تھی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے اس سے ہمدردی کرنے کی جاؤ اندر خود چلی جائے گی یہ اندر جب یہاں تک آ گئی ہے تو.....“ عمیر نے اسے بازو سے پکڑ کے اندر دھکیلا تھا۔

”آپ بھی جائیں۔“ عالیہ کے پیچھے کھڑی شمینہ راؤ کو بھی اندر جانے کا اشارہ کیا۔

”میری بس ہو گئی عمیر ابھی اور کتنا سہنا ہے مجھے سب کچھ تو چھین لیا تم نے۔ اب اور کیا بچا ہے میرے پاس؟“ بس وہیں گر گئی تھی۔

”بہت کچھ باقی ہے ابھی حائقہ ارشد! بہت کچھ.....“ عمیر مجھے وہیں چھوڑ کے اندر چلا گیا۔ اندر تک میں خود آئی تھی۔ اور اوپر تک مجھے عالیہ نے پہنچایا۔

☆.....☆

پھر بہار کو رفتہ رفتہ زوال آنے لگا۔ ہریالی باند پڑنے لگی۔ رنگ کم ہونے لگے۔ آہستہ آہستہ گرمیوں نے پر پھیلائے شروع کر دیے۔ دوپہریں گرم ہوئی گئیں۔ میری بچی کے ساتھ بھی میرے سے زیادہ بہتر سلوک نہ



ہوا۔ بس مجھے اتنا سکون تھا کہ عمیر کم از کم اس پر ہاتھ نہیں اٹھاتا تھا۔ عالیہ اور میڈم شمینہ دونوں کا رویہ نہ بہترین تھا۔ نہ بدترین تھا۔ وہ دونوں اگر مجھے کوئی سکھ نہیں دیتی تھیں تو دکھ بھی نہیں دیتی تھیں۔ عالیہ نے میری بیٹی کا نام ماریہ رکھا۔ ماریہ ثناء۔ نومبر میں عالیہ کی ڈیٹ فکس ہو گئی عمیر نے صرف اتنا کہا کہ بس شادی میں کم سے کم لوگوں سے ملوں۔ اپنا منہ بند رکھوں اور زیادہ بکواس نہ کروں۔ نہ جانے ان دونوں ماں، بیٹا نے میرے بارے میں کیا کچھ بتایا تھا عالیہ کے سرالیوں کو بہر حال میں نے واقعی کوئی بکواس نہ کی۔ جیسے ہی گرمیوں کا زور ٹوٹا، خزاں، نے پھیلانے۔ آسمان پیلا ہونے لگا تو عالیہ اپنے گھر رخصت ہو گئی اس روز میں نے پہلی بار عمیر کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ بہت دیر تک عالیہ کو اپنے ساتھ لگا کر کھڑا رہا۔ میں اس دن بھی اس چار دیواری سے باہر نہ آئی۔ عالیہ کو دیکھ کر مجھے میرا وقت یاد آ گیا۔ یہ جو کچھ عالیہ کو ملتا تھا۔ یہ سب میرا نصیب بھی تھا۔ میرا بھی حق تھا کہ میری ماں مجھے ساتھ لگا کر روتی، میرا باپ میرے سر پر ہاتھ رکھتا۔ میرا بھائی مجھے گاڑی تک آغوش میں لے کر جاتا۔ میں بھی دعاؤں میں رخصت ہوتی۔ پر مجھے ملا بھی تو کیا؟

”مرگئیں تم آج سے ہمارے لیے۔“ وہ رات میں نے عمیر کے بازوؤں میں سسکیاں لیتے ہوئے گزاری۔ اس نے بھی کچھ نہ پوچھا۔ پوچھتا بھی کیا؟ اسے کیا پتہ نہیں تھا۔

☆.....☆

خزاں کے پیچھے پیچھے ہی سردیاں پھر لوٹ آئیں۔ سال ہو گیا مجھے قید تنہائی سہتے سہتے۔ یہ سردیاں تو بہت ہی مشکل سے گزریں۔ نہ عمیر رحم کھاتا نہ سردیاں رحم کھاتیں۔ میں اپنی تکلیف کو پی پی کر بے حال ہو جاتی۔ مجھے یاد ہے اس دن بھی شدید سردی تھی۔ میڈم شمینہ اپنے کمرے میں تھیں۔ میں ماریہ کو ان کے پاس ہی سلا کر کچن میں آگئی۔ برتن دھونے والے تھے۔ اچانک مجھے باہر عمیر کی آواز آئی۔ عمو ماوہ اس وقت گھر آتا ہی نہیں تھا۔ ”کہاں ہے حائقہ؟“ انتہائی غصے سے بولتا وہ اندر آیا تھا۔ میں حواس باختہ سی کچن سے باہر نکلی۔ عمیر کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں۔

”کیا لینے آیا تھا یہاں؟“ وہ اونچی آواز میں بولا۔

”کون.....؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”جسٹ شٹ اپ۔ اچھی طرح جانتی ہو تم کہ کون؟“ عمیر ایک دم میرے قریب آیا۔

”عمیر! مجھے نہیں پتہ کہ کون آیا۔“ میری آواز لبوں میں ہی رہ گئی۔ عمیر کے زانے دار تھپڑ سے میں دیوار سے ٹکرا گئی تھی۔

”تم نے بلایا تو وہ یہاں آیا ہے ناں۔ بھولی نہیں ہونا آج بھی اسے۔“ عمیر دھاڑا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال حمزہ کا آیا۔

”حمزہ آیا تھا؟“ میں نے باریک سی آواز میں پوچھا۔ عمیر کا دوسرا تھپڑ میرے چودہ طبق روشن کر گیا۔

”حمزہ اس کی طرح بے غیرت نہیں ہے۔ دنیا جہاں کا گھٹیا پن صرف اسی میں ہے۔ اور ایک تم ہو اس جیسی۔“

”عمیر! پلیز خدا کا واسطہ پلیز رحم کریں۔ مجھے نہیں پتہ کون آیا تھا۔ میں نے کسی کو نہیں بلایا۔ پلیز میرا یقین کریں۔“ بغیر کوئی رحم کھائے۔ وہ میرے بدن پہ بیلٹ کے نشان ڈالتا چلا گیا۔ سخت سردی ٹھنڈا فرش، زخم میں تکلیف میں مرنے والی ہو گئی۔



”تمہاری خاطر تو میرے آگے ہاتھ بھی جوڑ لیے تھے اس نے بڑے دعوے کرتا تھا۔ تم سے پیار کرنے کے۔ تمہاری خاطر ایک ایک کا دل صاف کرتا پھرتا ہے، سب پتہ ہے مجھے۔“ میڈم شمینہ نے بمشکل اس کا ہاتھ روکا۔ میرے بدن پہ جگہ جگہ خون رسنے لگا تھا۔ ماریہ سہمی ہوئی دروازے کو پکڑے کھڑی تھی۔ میرے لبوں سے سسکیاں بھی نہ نکل سکیں۔

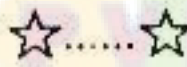
”دنیا میں جتنی نفرت مجھے حارث سے ہے نا۔ اتنی کسی سے نہیں ہے آئندہ یہاں نظر آیا ناں وہ تو کھال ادھیڑ دوں گا تمہاری۔“ ایک جھٹکے سے مجھے زمین پہ پھینکتے ہوئے وہ باہر نکل گیا تھا۔ میں بے جان سی وہیں گری رہ گئی۔ سہارا پا کر بھی اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔

”حارث آیا تھا۔“ میرے ذہن میں عمیر کی آواز گونجی۔

”حارث کو کب مجھ سے پیار ہوا۔ وہ کب گیا تھا عمیر کے پاس میری خاطر ہاتھ جوڑنے۔ اسے کیسے پتہ میں بے قصور تھی؟“ مجھے عمیر کی باتوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔

”میں نے تو نہیں دیکھا کبھی اس کی آنکھوں میں پیار.....“ ذہن سوچے جا رہا تھا۔

”تم نے تو کبھی اس کی آنکھوں میں ہی نہیں دیکھا حائقہ پیار کیسے نظر آیا؟ نہ جانے دل کے کس کونے سے آواز آئی تھی۔ میں رات تک سنبھل نہ سکی۔ تکلیف ناقابل برداشت ہو رہی تھی اور فجر کی اذانوں کے ساتھ ہی مجھے ایک بار پھر جڑواں بیٹیوں کا تحفل مل گیا۔



زندگی اور مشکل ہو گئی۔ صبح سے لے کر شام تک مجھے ایک لمحے کا بھی سکون نہ ملتا۔ عمیر کے رویے میں کوئی فرق نہ آیا۔ خدا خدا کر کے سردیاں ختم ہوئیں۔ ایک بار پھر بہار نے پر پھیلائے اور اس دن عالیہ نے مجھے فون کر کے بتایا۔ PCS نے ٹیسٹ کی ڈٹیس اناؤنس کر دی تھیں۔ میرے اندر ایک بار پھر پرانی حائقہ جاگ گئی۔ وہ بائیس سال والا جنون ایک بار پھر زندہ ہو گیا۔ ایک بار پھر سر شوکت راؤ والی فزکس یاد آ گئی۔ ایک بار پھر چار سو بچوں کی کلاس کو پڑھانے کا دل کرنے لگا۔ ایک بار پھر انگلیوں میں مار کر پکڑنے کا دل کرنے لگا۔ میں نے عمیر کی بہت متیں کیں۔ اس کے قدموں سے لپٹ کر میں رو رو کر بے حال ہو گئی۔ اس کے تھپڑ سہ لیے۔ اس کی دی ہر تکلیف برداشت کر لی مگر ضد کرنے سے باز نہ آئی۔ عالیہ نے مجھے میری رول نمبر سلپ بھی بھجوا دی۔ میری ضد اور بڑھ گئی۔ ”عمیر! خدا کے لیے مان جائیں۔ خدا کا واسطہ میں نے بہت انتظار کیا ہے اس دن کا پلیز میری بہت پرانی خواہش ہے یہ۔ میں نے خود سے وعدہ کیا تھا کالج دوبارہ جانے کا اب وقت آیا ہے تو مجھے نہ روکیں پلیز۔“ عمیر نے میری ایک نہ سنی۔ میں رو رہی رہ گئی۔ اسے زرا ترس نہ آیا۔

”حائقہ! تم پاگل ہو کیا جو تمہیں اپنی مرضی سے سانس لینے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ وہ کالج جانے کی اجازت کیسے دے گا۔“ میڈم شمینہ شاید اپنی جگہ درست تھیں مگر میں اپنے دل کا کیا کرتی جو روئے جا رہا تھا۔ ٹیسٹ والے دن عمیر نے مجھے اوپر کمرے میں بند کر دیا۔ میں دروازہ بجا بجا کر پاگل ہو گئی۔ کہنیوں سے خون رسنے لگا مگر عمیر کو ترس نہ آیا اسے کیسے ترس تا؟ ترس تو ان پر آتا ہے جن کے لیے دل میں ذرا سی بھی محبت ہوتی ہے اور اس کے دل میں میرے لیے صرف نفرت تھی۔ بے تحاشہ نفرت میں رو رو کر تھک گئی اور دن گزر گیا۔ دل رو رو کر خود ہی چپ کر گیا۔ عمیر نے شام تک دروازہ نہ کھولا۔ پورا دن بھوکی پیاسی رو رو کر مجھ پہ بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔ اور نہ جانے کب میری آنکھیں بند ہو گئیں۔



تقریباً رات کے دس بج رہے تھے جب وہ لاہور سے واپس آیا۔ آج اس کا Pcs کاٹھیٹ تھا۔ لاؤنج کی لائٹ جلاتے ہوئے وہ کچن میں آیا۔ فریج سے بوتل نکالی اور پانی پینے لگا۔  
 ”کیسا ہواٹھیٹ؟“ شمینہ راؤ نہ جانے کب دروازے میں آ کے کھڑی ہوئی تھیں۔  
 ”اچھا نہیں ہوا دیکھیں کیا بنتا ہے؟“ اس نے کرسی گھسیٹتے ہوئے کہا اور وہیں بیٹھ گیا۔ شمینہ راؤ بھی اسے کھانا گرم کر کے دینے کے بعد وہیں بیٹھ گئیں۔ وہ چپ چاپ کھانا کھانے لگا شمینہ راؤ چند لمحے اسے دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

”کیا تھا جو اسے بھی لے جاتے۔ سارا دن دروازہ بجانبجا کے روتی رہی ہے۔ اس نے کونسا لازمی پاس کر لینا تھا۔“ عمیر نے ایک نظر انہیں دیکھا۔  
 ”اور اگر کر لیتی تو.....؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”تو تمہارا کیا جاتا عمیر! کوئی شخص کسی کے حصے کا نہیں چراتا۔ سب اپنے اپنے حصے کا کھاتے ہیں۔“ عمیر نے ایک دم ان کی بات کاٹی۔  
 ”ماما پلیز! مجھے دوسروں کا نہیں پتہ لیکن وہ میرے حصے کا ہی چھینتی ہے۔“ شمینہ راؤ چپ ہو گئیں۔ عمیر نے کھانا ختم کر لیا۔

”جاؤ جا کر دیکھو کہ زندہ بھی ہے یا مر گئی۔“ وہ کھانے کے برتن اٹھاتے ہوئے بولیں۔  
 ”زندہ ہی ہوگی۔ بہت ڈھیٹ ہے اتنی جلدی تھوڑی ناں مرے گی۔“ مسکراتے ہوئے وہ اوپر آیا۔ لاک کھول کے اندر آیا تو پورا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے موبائل کی سرچ لائٹ آن کی اور نظر بیڈ پہ پڑی حائقہ کے چہرے پہ آ کے رک گئی۔ منظر نظر انداز کرنے والا تھا بھی نہیں۔ دائیں ہاتھ سے بائیں کندھے کو پکڑے وہ دوپٹے سے بے نیاز مٹی ہوئی بیڈ پہ پڑی تھی۔ بال چہرے پہ گرے ہوئے تھے اور گالوں پہ آنسوؤں کی مٹی سی قطاریں اب بھی باقی تھیں۔ عمیر لائٹ جلاتا بھول گیا۔ ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے عین سامنے آ بیٹھا۔ وہ ہولے سے کسمپائی تھی۔ عمیر نے جیسے کسی ٹرانس کے زیر اثر آہستہ سے اس کے چہرے پر سے بال ہٹائے اور..... بہت دیر تک نظریں نہ ہٹا سکا۔ نظریں تو وہ بہت دیر تک اس دن بھی نہیں ہٹا پایا تھا جب ٹریننگ کے پہلے دن لکھا تھا۔ جب ٹریننگ کے آخری دن دیکھا تھا۔ جب اسے اپنے سامنے روتے ہوئے دیکھا تھا جب اسے اپنے انتہائی قریب محسوس کیا تھا۔ جب اس کے پھول چہرے کو روئے دیکھا تھا۔ جب پہلی رات اس کی بھیگی آنکھوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ مانے یا نہ مانے۔ جادو تو اس پر بھی ہوا تھا۔ نظروں کے ارتکاز سے وہ دوبارہ کسمپائی اور عمیر کی بس ہو گئی۔ How dare you to sleep without me. تم میرے بنا کیسے رہ سکتی ہو؟“ سرگوشی میں کہتے ہوئے اس نے ایک دم اسے دونوں بازوؤں میں بھرا تھا۔ حائقہ نے یکدم آنکھیں کھولیں۔ عمیر پاگل ہوا جا رہا تھا۔ حائقہ اس کی سانسوں کی شورش سے ہاری گئی۔  
 ”عمیر میں نے واپس وہاں جانا تھا۔“ وہ کہتی ہوئی عمیر کی دھڑکنیں اوپر کر گئی۔  
 ”وہ میری لیب تھی عمیر وہ میری جگہ تھی۔“ عمیر نے اسے مزید بولنے ہی نہ دیا۔ اسے اپنے اندر گم کرنا چلا گیا۔

بہار کو مار بھگا کے گرمیاں ایک بار پھر حکومت کرنے لگیں۔ میں نے خود کو وقت کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا۔



مار یہ نے چلنا شروع کر دیا تھا۔ عالیہ کبھی کبھار چکر لگالیتی سرگرمیاں ختم ہوتے ہی ساون شروع ہو گیا۔ ہر طرف بوندیں ہر طرف بارش..... پتے جیسے ہی پیلے ہو کر جھڑے۔ میری گود میں ایک اور بیٹی آگئی۔ قدرت کو بھی رحم نہ آ رہا تھا۔ میں اس رات عمیر کے قدموں میں گر گئی اس کے پاؤں پر گرے ہوئے اپنے آنسوؤں سے گیلے کرتے ہوئے۔ منتیں کرتے ہوئے میں بے حال ہو گئی۔ ”عمیر! خدا کا واسطہ بس کر دیں۔ میں مر گئی ہوں اندر سے عمیر اب بس کر دیں چار بیٹیاں ہو گئی ہیں اب رحم کر دیں مجھ پر۔“ پر عمیر کو رحم کہاں آتا تھا۔

”ایک بیٹا دے دو بس۔“ مجھے پاؤں سے پیچھے کرتے ہوئے بولا۔ جیسے بیٹا دینا میرے بس میں تھا اور عمیر کو بیٹے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے صرف میری موت چاہیے تھی۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کے سسکتی ہوئی موت، بے رحم سردیاں پھر لوٹ آئیں۔ میں حد سے زیادہ بیمار ہو گئی منہ سے تھوک کے ساتھ خون بہنے لگا۔ موت میری نظروں کسمانے سے ہو کر پلٹ گئی۔ اسے بھی مجھ پر ترس نہ آیا۔ فروری میں میڈم شمینہ کی پرموشن ہو گئی سردیوں کے بعد بہار اور پھر سے لمبی، سنگتی گرمیاں اگست کے آخر میں قدرت نے پھر امتحان لے لیا۔ جڑواں بیٹیوں کو دیکھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ پتہ نہیں مجھ سے کیا گناہ سرزد ہو گیا تھا۔ جس کی سزا ختم ہونے میں ہی نہ آ رہی تھی ایسی کوئی سنگین غلطی ہو گئی تھی مجھ سے جو اللہ کو رحم ہی نہ آ رہا تھا۔

کہتے ہیں پروردگار کسی پر اس کی اوقات سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اب نہ جانے بوجھ زیادہ ہو گیا تھا یا شاید میری اوقات ہی اتنا بوجھ سہنے کی تھی۔ نہ جانے کب یہ سزا ختم ہونی تھی۔ نہ جانے کب یہ عذاب ٹلنا تھا میں نے تو رورو کر معافیاں بھی مانگیں۔ اپنی دعائیں لمبی سے لمبی کرتی چلی گئی۔ طاق راتوں میں گڑ گڑاتی سخت سردیوں میں تہجد پڑھ کے ماتھا رگڑا۔ لبوں پر بس ایک ہی جملہ ہوتا۔ ”اللہ مجھے معاف کر دے۔ میری آزمائش ختم کر دے۔“ وقت گزرتا چلا گیا۔ میڈم شمینہ کی وجہ سے میری بڑی بیٹیاں اسکول جانے لگیں۔ بارشیں ختم ہوئیں تو ظالم سردیاں ایک بار پھر لوٹ آئیں۔ مجھے برے طریقے سے شدید قسم کا نمونیا ہو گیا۔ آنکھیں کئی کئی انچ اندر اتر گئیں۔ خود کو آئینے میں دیکھتی تو خوف آتا، رورو کر سردیاں ختم ہوئیں، موسم ذرا بدلتا تو مجھے سکون آیا۔ گرمیاں شروع ہوئیں تو خون کی الٹیاں آنے لگیں۔ بمشکل عمیر کی منت سماجت کر کے میڈم شمینہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ رپورٹس دیکھ کر میں سن رہ گئی۔

ابھی تو شاید تکلیفوں کا ایک لمبا دور باقی تھا۔

ابھی مزید بہت امتحان باقی تھے۔

ابھی کہاں معافی ملنی تھی مجھے۔ شاید جرم ہی بہت سنگین تھا۔ مجھے بلڈ کینسر ہو گیا تھا۔

☆.....☆

اس دن عالیہ کی ڈیلیوری تھی۔ میڈم شمینہ، عمیر کے ساتھ اسے دیکھنے اسپتال چلی گئیں۔ عمیر باہر سے دروازہ لاک کر گیا تھا۔ میں نے ہولے ہولے سارے کام نمٹائے۔ فارغ ہوئی تو تقریباً بارہ بج رہے تھے۔ جڑواں بیٹیوں کو گود میں لیے میں لاؤنج میں آگئی۔ دونوں سو گئیں۔ انہیں صوفے پر لٹاتے ہوئے اچانک میری نظر ٹیلی فون ڈائری کے ساتھ پڑے بورڈ مارکرز پر پڑی۔ وہ یقیناً عمیر کے تھے۔ دل ایک دم چمک گیا۔ میں نے بہت کوشش کی خود کو روکنے کی مگر قدم ان کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ لرزتی انگلیوں سے میں نے وہ مارکر اٹھایا تھا۔ عجیب سا لگا۔ بہت عرصہ ہو گیا تھا انگلیوں سے اسے جدا کیے۔ میں ہولے ہولے چلتی ہوئی لاؤنج کی گلاس والی کے بالکل سامنے باہر کی طرف آگئی۔ گیٹ کا سارا منظر اس میں واضح نظر آ رہا تھا۔ چند لمحے یونہی کھڑے رہ کر



کے بعد میں نے مارکر کا ڈھکن کھولا۔ ول عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ مارکر سیدھے ہاتھ کی انگلیوں میں دبا کے اس کی نوک میں نے گلاس وال سے لگائی۔ ہاتھ بری طرح لرز رہا تھا۔ کچھ یاد ہی نہ آیا۔ میں دھک سے رہ گئی۔ کیا واقعی میں سب بھول چکی تھی۔ آنکھوں کو یقین نہ آیا تو بے یقین سی ہو کر بند ہو گئیں۔ وہ کیا چند دنوں کا سبق تھا جو میں بھول جاتی۔

ابو جی کی جھڑکیاں تھیں جو میں بھلا دیتی۔ وہ کیا کوئی حادثہ تھا جو میں چند دن ذہن میں رکھ کر محو کر دیتی۔ نہیں..... وہ میرے سولہ سال تھے۔ رل رل کے کندن کیے سولہ سال۔ وہ کوئی سبق نہیں تھا۔ کوئی کہانی نہیں تھی۔ کوئی افسانہ نہیں تھا جو میں بھول جاتی۔ وہ تو فزکس تھی۔ میرے خون میں شامل، میری سانسوں میں گھلی۔ میرا پہلا عشق..... کیسے بھول سکتی تھی میں۔

سولہ سال لحوں میں زندہ ہو کے میرے سامنے آکھڑے ہوئے۔ میں نے یکدم آنکھیں کھولیں، مارکر چلنا شروع ہو گئی تھی۔ میں لکھتی چلی گئی۔ گلاس وال سیاہ ہوتی جا رہی تھی۔ میری آنکھوں میں مرچیں سی بھرنے لگیں۔ آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔

آنسو رکنے میں نہیں آرہے تھے۔ میری تینوں بڑی پٹیاں حیرت سے کھڑی مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میرا پورا وجود کانپنے لگا۔ پوری گلاس وال سیاہ ہو چکی تھی۔ پیچھے کا منظر نظر آنا کم ہو گیا تھا۔ اچانک مجھے لگا جیسے گلاس میں کسی کا عکس ہلا ہو۔ آنسوؤں کے درمیان آنکھیں پھاڑ کے میں نے غور سے گلاس وال میں دیکھا تھا۔ مارکر ایکدم رک گیا۔ عمیر نہ جانے کب میرے پیچھے آ کے کھڑا ہوا تھا۔ نہ جانے کب سے میرا بالکل پن دیکھ رہا تھا۔ مارکر میری انگلیوں سے گر گیا۔ بمشکل میں پیچھے کو مڑی تھی۔ عمیر بے یقین نظروں سے کبھی مجھے دیکھتا اور کبھی سیاہ ہوتی گلاس وال کو۔ میں ایکدم وہیں فرش پر گر گئی تھی۔

”میرے دل سے کیسے نکالو گے یہ سب..... کیسے؟“ میں نے روتے ہوئے کہا تھا۔ عمیر بول نہ سکا۔

☆.....☆

اور اس دن کے بعد مجھ پر جو دور آیا اس کا ایک ایک لمحہ گزرے ایک ایک سال کے برابر تھا۔ دسمبر نے آتے ہی ساتویں بیٹی کا تحفہ دے دیا۔ چھ بیٹیوں کے ساتھ گزارے چار سال ایک طرف اور ساتویں بیٹی کے ساتھ گزرا پانچواں سال دوسری طرف۔ وہ پھر بھی بھاری تھا مجھے سانس لینا دو بھر لگنے لگا۔ عمیر نے بات کرنا تو چھوڑ ہی دیا صرف پھٹر، صرف ٹھڈے، صرف مار..... میں شکل سے بے شکل ہو گئی۔ بال سفید ہوتے چلے گئے۔ خون نچڑتا چلا گیا۔ رنگ ہلکی اور آنکھیں کئی کئی انچ اندر اتر گئیں۔ چہرے اور جسم پر نیل کے نشان جیسے مستقل ہو گئے۔ میں عمیر سے بات کرتے ہوئے بھی رو پڑتی۔ رورو کے آنکھیں سوج گئیں۔ مستقل بخار جیسی کیفیت رہنے لگی۔ کھانسی کے دورے پڑنے لگے۔ بے خوابی کا مرض الگ سے لاحق ہو گیا۔ بلڈ پریشر انتہائی لو رہنے لگا اور کینسر رفتہ رفتہ بڑھتا ہی گیا۔

واقعی موت کی سزا تو بہت آسان ہے۔ عمیر نے میرے لیے یہ ہی چنی میں پانچ سال جی جی کر مر گئی۔ ہر رات سونے سے پہلے وہ مجھے قبر میں اتار دیا اور صبح اٹھ کے واپس باہر کھینچ لیتا۔ دوبارہ سے درگور کرنے کے لیے۔

ان پانچ سالوں میں عمیر نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ سب کچھ۔



عارش نے رونے دھونے کے بعد لی ایس سی میں ایڈمیشن لے لیا۔ شروع شروع میں تو دل ہی نہ لگا۔ کتابوں کی شکل دیکھنے کو ہی دل نہ کرتا، یونہی بیٹھے بیٹھے رونا آ جاتا۔ جس چیز کے لیے آپ کوشش ہی نہیں کرتے اس کے نہ ملنے کا غم بھی زیادہ نہیں ہوتا لیکن جسے حاصل کرنے کے لیے انسان جان مار دے اور وہ چیز حاصل ہو کے لا حاصل ہو جائے۔ اس کے لیے غم بہت چھوٹا لفظ ہوتا ہے۔ عارش بھی لی ایس سی کرتے ہوئے سو سو بار مرا اور سو سو بار جیا۔ لی ایس سی اچھے نمبروں سے پاس کرنے پر اسکا لرشپ ملی تو بیسک سائنس میں ایم ایس سی کرنے کی بجائے اس نے ایم ایس فوڈ سائنس میں ایڈمیشن لے لیا۔ وقت نے آہستہ آہستہ ان کے زخموں پر مرہم رکھ ہی دیا۔ رائل اکیڈمی عروج پر جا پہنچی۔ جہاں فزکس، وہاں سر عمیر راؤ۔ مگر عمیر کی بادشاہت کے سائے میں بھی حادث نے دی اشار اکیڈمی کو قائم رکھا۔ ناعمہ اور نمرہ کی شادیاں ہو گئیں تو ماں باپ نے اسے بہت زور لگایا مگر اس کا ایک ہی جواب ابھی نہیں اور شاید کبھی نہیں۔ حمزہ نے بھی پہلی محبت کو بھولنے میں پانچ سال لگا ہی دیئے اور پھر بیمار ماں کے انتہائی مجبور کرنے پر شادی پر راضی ہوا۔

اس دن میں اور میڈم شمینہ لاؤنج میں بیٹھے عالیہ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے جب عمیر اندر داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کے ایک دم کھڑی ہو گئی۔ اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میڈم شمینہ کا سیل فون بجا تو وہ اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ عمیر چند لمحے یونہی مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔

”حالہ! ایک بات بتاؤ۔ کیا ملا تمہیں مجھ سے پیار کر کے۔“ میں اس کی بات کا فوری جواب نہ دے سکی۔

”کیا ملا تمہیں فزکس میں ایم ایس سی کر کے حادث کے کہنے پر دی اشار جوائن کر کے، سر شوکت راؤ کی جگہ کھڑے ہونے کے خواب دیکھ کے۔ ون اینڈ اونٹی ہونے کے خواب دیکھ کے۔“ وہ بولتا جا رہا تھا۔

”بولو! چپ کیوں ہو؟ کیا ملا تمہیں خواجواہ میرے آگے کھڑے ہو کے میرے رستے کی رکاوٹ بن کے میری ذات پر انگلی اٹھا کے۔“ مجھے لگا جیسے کچھ ہونے لگا ہو مگر کیا؟

بہت آرام سے میں نے تمہیں اس دن کہا تھا کہ میرے رستے میں مت آؤ۔ لیکن تم نہیں مانیں۔ پھر میں نے حادث سے کہا کہ تمہیں سمجھائے اس نے بھی میری بات ایک کان سے سن کے دوسرے سے نکال دی۔ کیا ملا تمہیں چند ماہ کے لیے اس کا ساتھ مل کر بولو۔ کیا ملا تمہیں کچھ عرصے کے لیے اتنا اونچا اڑ کر۔ مجھ سے الجھ کر۔ میرے حصے کا آسمان چھین کر۔ میری منزل میں حصے دار بن کر۔“ عمیر میرے سامنے آگھڑا ہوا۔ دونوں انگلیوں سے میرا چہرہ اوپر اٹھایا اور میری آنکھوں میں دیکھ کر پھر بولا۔

”کچھ بھی نہیں ہے ناں کچھ بھی نہیں ملا تمہیں مجھ سے چند ماہ کی دشمنی مول لے کر آج کیا ہے تمہارے دامن میں۔ ایک ذرہ بھی نہیں۔ ایک قطرہ بھی نہیں جسے تم اپنا کہہ سکو۔ نہ تو یہ زمین تمہاری ہے جس پر کھڑی ہو اور نہ ہی یہ چھت جس کے نیچے کھڑی ہو۔ کہاں ہے تمہاری وہ عزت، وہ غرور، جس پر کوئی بھی لڑکی ناز کر سکتی ہے۔ کہیں بھی نہیں کہاں ہے تمہارے گزرے سالوں کا صلہ۔ کہیں بھی نہیں سولہ سالوں کی پڑھائی۔ کہیں بھی نہیں کہاں ہے میرے ساتھ گزارے پانچ سالوں کا صلہ؟“ میں نے بھیگی آنکھوں سے نظر اٹھا کے عمیر کو دیکھا تھا۔

”وہ پڑا ہے۔“ عمیر نے میز کی طرف اشارہ کیا۔ میرا دل ایک دم ساکت ہوا۔ کیا تھا وہ شاید وہ جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔



”آج بالکل خالی ہاتھ ہوں! بالکل خالی ہاتھ اور میں ایسا ہی دیکھنا چاہتا تھا تمہیں۔ بے آسرا بے سرو سامان۔“ میرے آنسو ٹوٹنا شروع ہو گئے تھے۔ آگہی حقیقت سے زیادہ خوفناک لگ رہی تھی۔

”ویسے تم یہ بھی نہیں کہہ سکتیں کہ میں نے پانچ سالوں میں تمہیں کوئی صلہ نہیں دیا۔ یہ تمہاری سات بیٹیاں میرا ہی دیا تحفہ ہیں ناں۔“ وہ ہولے سے مسکرایا۔

”آج اگر میں تمہیں آزاد کرتا ہوں تو کیا کرو گی؟ کہاں جاؤ گی؟ اپنے گھر..... بالکل نہیں تمہارا باپ تمہارے لیے دروازہ ہی نہیں کھولے گا۔ حمزہ کے گھر چہ چہ کیا منہ لے کر جاؤ گی۔ اس کے گھر والے تم پر تھوکیں گے بھی نہیں اور ویسے بھی۔ کل رات اس کا نکاح ہے تو رہ گیا تمہارا ون اینڈ اونلی ہمدرد، حارث اسی کے پاس جاؤ گی ناں مگر اسے اپنی دو شادی شدہ بہنوں کے منتے بستے گھر تم سے زیادہ عزیز ہوں گے۔ صرف ایک ویڈیو اور تم تو جانتی ہو کہ ہمارے معاشرے میں غلط ہمیشہ لڑکی ہی ہوتی ہے۔“ میں کسی درخت کی طرح ساکت کھڑی اس سے اپنے آنے والی زندگی کا فلسفہ سن رہی تھی۔

”پھر تم کرائے مکان ڈھونڈو گی۔ اکیلی لڑکی کو سات بیٹیوں کے ساتھ کون اپنا گھر دے گا۔ کوئی نہیں کہاں بڑھاؤ گی۔ کیسے بڑھاؤ گی۔ کون تم سے بڑھنے پر راضی ہوگا۔ کوئی نہیں پھر کیسے اپنا اور اپنی بیٹیوں کا پیٹ بھرو گی۔ دوسروں کے گھروں میں کام کر کے مگر تمہیں کام کون دے گا۔ کوئی نہیں۔“ اب کے وہ ہنسا تھا۔

”ہر رستہ بند ہوگا حائق! یہاں سے نکلنے کے بعد کہاں جاؤ گی۔ کیا کرو گی؟“ عمیر میرے سامنے آیا۔

”میں جانتا ہوں تب تم کیا کرو گی۔ تم مر جاؤ گی۔ کیونکہ اس کے علاوہ تمہارے پاس اور کوئی رستہ نہیں ہوگا۔ کوئی نہیں۔“ عمیر نے زور سے ہنستے ہوئے میز پر پڑے کاغذوں پر سائن کیے تھے۔ میں اسے روک بھی نہ سکی۔“

”میں عمیر راؤ بہ ہوش و حواس حائق ارشد کو طلاق دیتا ہوں۔“ مجھے ایک دم ہوش آیا۔ اندر آتیں میڈم شمینہ بھی اس کے الفاظ سن چکی تھیں۔

”عمیر! رک جائیں خدا کے لیے رک جائیں۔ میں کیا کروں گی۔ خدا کا واسطہ اتنا بڑا ظلم نہ کریں۔ جو چاہے سلوک کر لیں۔ میں اف تک نہیں کروں گی۔ آواز تک نہیں نکالوں گی مگر ایسا نہ کریں۔“ میں اس کے قدموں سے لپٹ کے رو رہی تھی۔

”طلاق دیتا ہوں۔“ اس نے دوسری بار کہا۔ میں اونچی آواز میں روتے ہوئے میڈم شمینہ کے پاس آئی تھی۔

”میڈم پلیز! انہیں روکیں میں کہاں جاؤں گی پلیز۔“ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں عمیر کے لب تیسری بار بھی ہل گئے۔

”عمیر.....!“ اونچی آواز میں کہتی ہوئی میں تیر کی طرح عمیر کی طرف آئی تھی اور اس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھا مگر..... دیر ہو چکی تھی۔ اس نے جو کہنا تھا کہہ چکا تھا۔ ہولے سے اس نے مجھے پیچھے کودھکیلا۔ میرے آس پاس کی دنیا یکدم خاموش ہو گئی۔

”صرف آج رات تک کا وقت ہے تمہارے پاس۔ صبح تمہاری شکل نظر آئی تو خود باہر پھینک دوں گا۔“ وہ مجھے کہتے ہوئے اوپر چلا گیا۔ میں اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کر سکی۔ میڈم شمینہ بے یقینی کی سی صورت میں صوفے پر آکر گر گئیں۔ میں ہولے سے وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ واقعی آج کیا تھا میرے پاس، کچھ بھی



نہیں۔ ایک ذرہ بھی نہیں۔ ہر رستہ بند تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ اس لمحے میں سچ سچ مر گئی تھی۔  
واقعی.....!

ایسی ہی ہوتی ہے موت،  
انسان بے جان ہو جاتا ہے۔  
بے سرو سامان ہو جاتا ہے۔  
خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔  
آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں۔  
زبان خاموش ہو جاتی ہے۔  
جسم خالی ہو جاتا ہے۔

اور.....

روح ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔

وہاں اس لمحے اس فرش پر دیوار کے ساتھ گرے ہوئے میں بھی مر گئی تھی۔

☆.....☆

نہ جانے میری کون سی بیٹی روئی تھی۔ میں جیسے ہوش میں آئی۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ ہلکا ہلکا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ میں نے لاؤنج میں چاروں طرف نظر دوڑائی، سب سے چھوٹی بیٹی صوفے پر پڑی رو رہی تھی اور ماریہ اسے تھپک تھپک کے چپ کروانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں یکدم اٹھی کچن سامنے ہی تھا۔ میں بھاگ کے کچن میں آئی۔ ریک سے چھری کھینچی۔ واپس باہر آئی۔ ماریہ کو بازو سے پکڑ کے ایک طرف کیا اور چھوٹی والی کے گلے پر چھری رکھ دی۔

”جانتی ہو حائقہ! جس رات یہ ننھا وجود تمہاری گود میں آنے والا تھا ناں اس رات اس نے روتے ہوئے سات آسمانوں کے پروردگار سے پوچھا۔ میں زمین پر جا کے لوگوں سے باتیں کیسے کروں گی؟ پروردگار نے کہا۔ ”میں نے پہلے ہی ایک فرشتہ زمین پر بھیج دیا ہے۔ وہ تمہیں سکھائے گا یہ پھر روئی اور اس نے پوچھا۔ میں آپ سے دعا کیسے کروں گی۔ پروردگار نے کہا۔ فرشتہ تمہیں سکھائے گا۔ اس نے پھر کہا۔ مجھے کھانا کھانا کون سکھائے گا؟ پروردگار بولا۔ وہی فرشتہ۔ اس نے پھر پوچھا۔ میں روئی تو چپ کون کروائے گا۔ پروردگار نے پھر کہا۔ وہی فرشتہ۔ اس نے ہولے سے پوچھا۔ میں اس فرشتے کو کیسے ڈھونڈوں گی۔ تو پروردگار نے مسکرا کر کہا۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ زمین والے اس فرشتے کو ماں کہتے ہیں۔ میرے ہاتھوں سے چھری گر گئی۔ میں میڈم نمینہ کو دیکھتی رہ گئی۔

”پھر اس نے آخری سوال پوچھا۔ اور اگر فرشتے نے مجھے مارا تو؟ حائقہ رب مسکرا دیا اور بولا وہ میرا دوسرا روپ ہے۔ ماں صرف پیار کرنا جانتی ہے۔

میں جیسے بے آواز رو رہی تھی۔ میڈم ہولے سے میرے قریب آئیں۔  
”تکلیفوں اور مصیبتوں کے عروج پر بے بسی کی انتہاؤں پر دکھوں کی حدوں پر اندھیروں کے بام پر۔ ہمیشہ موت نہیں چنی جاتی حائقہ۔ ضروری نہیں ہے کہ قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر ہم زندگی اور موت میں سے موت ہی چنیں زندگی بھی چنی جاسکتی ہے۔“ انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔



”آخر کیسے؟“ میں بے جان سی ہو کر فرش پر گر رہی تھی۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

”کیا مطلب ہے کیسے حائقہ! تم اس نبی کی امتی ہو جس نے لہو لہان ہونے کے باوجود اپنے دشمنوں کو صرف دعائیں دیں۔ اس پاک ہستی سے زیادہ تنہا تو نہیں ہونا آج تم، اس سے زیادہ تکلیفیں تو نہیں سہی ناں تم نے۔ پھر کیوں اتنی مایوس ہو رہی ہو۔ کیا ہوا جو گھر چھن گیا رشتے چھن گئے۔ کھڑے ہونے کے لیے زمین تو ابھی بھی ہے ناں سر پر نیلا آسمان تو ابھی بھی سلامت ہے۔ سانس لے رہی ہو زندہ ہو۔ بے شک نہ جیو اپنے لیے اپنے وجود کے ان ٹکڑوں کے لیے جیو۔ ثابت کر دو کہ قبر میں اتر کے بھی جیا جاسکتا ہے۔“ وہ مجھے حوصلے پر حوصلہ دے رہی تھیں۔

”مگر کیسے کیا کروں میں؟“ میرے اندر کی حائقہ زندہ ہی نہیں ہو رہی تھی۔

”جب حضور پاک پر دکھوں اور تکلیفوں کی انتہا ہو گئی تھی تو جانتی ہوا نہوں نے کیا کیا تھا..... ہجرت! اپنا شہر چھوڑ دیا تھا۔ مدینہ چلے گئے تھے لیکن ہمت نہیں ہاری۔ حوصلہ نہیں کھویا۔ اللہ پر یقین نہیں کم کیا اور صلہ کیا ملا؟ اسی شہر میں فاتح بن کر واپس آئے۔ تم اسی رسول کی امتی ہو حائقہ۔“ وہ مجھے رستہ دکھا رہی تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

”چلی جاؤ یہاں سے۔ بہت ٹھٹھن ہے تمہارے لیے اس شہر میں۔ سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔ چھوڑ دو اس شہر کو۔ کہیں اور چلی جاؤ۔ شاید وہاں کی مٹی کو تم پر ترس آجائے۔“ میں نے ان کی طرف دیکھا اندھیرا چھانے لگا تھا۔

”اٹھو شاہاش! عمیر تم سے سب کچھ چھین سکتا ہے۔ تمہاری ہمت اور حوصلہ نہیں چھین سکتا۔ جاؤ اپنا سامان لو اور خود فیصلہ کرو کہ کہاں جانا ہے۔“ وہ میرے کندھے پر چھکی دیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں اوپر آئی۔ عمیر شاید باہر کہیں گیا ہوا تھا۔ میں نے اپنے اور بچیوں کے کپڑے باندھے۔ بمشکل دو بیگ ہوئے۔ اس کے علاوہ اور کچھ تھا ہی نہیں۔ سامان باندھ کے میں نے کاغذ اور پینسل اٹھائی۔ چند سطریں لکھیں اور چادر اٹھا کے نیچے آ گئی۔

”تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔“ میں نے میڈم ٹمینہ کے کمرے میں جھانک کر کہا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”کچھ قرضے باقی ہیں اب تک۔ جانے سے پہلے چکا دینا چاہتی ہوں۔“ انہوں نے ہولے سے سر ہلایا تھا۔ میں باہر آئی تو عشاء کی اذانیں شروع ہو گئی تھیں۔ آسمان سیاہ بادلوں سے بھر گیا تھا اور ٹھنڈی ہوا آر پار ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میں اس کے گھر تک پہنچی۔ دروازہ اسی نے کھولا اور مجھے دیکھ کے حیران رہ گیا۔

”حائقہ.....“ اس کی حیرانی سے لبریز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”آپ کے چند منٹ چاہئیں بس۔“ میں نے ہولے سے کہا۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ بہت دیر تک خاموشی رہی۔ آخر میں نے خاموشی کو توڑا۔

”آپ نے میرے لیے عمیر کے آگے ہاتھ کیوں جوڑے تھے۔“ میرے سوال پر وہ کافی دیر تک بول نہ سکا۔ خاموش سا بیٹھا رہ گیا۔ میں نے پہلی بار غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور زیادہ دیر تک دیکھ نہ سکی۔ وہاں کوئی ایک آدھ ندی نالہ ہوتا تو ناں وہاں تو محبتوں کے طوفان انگڑائیاں لے رہے تھے۔ میں نظریں جھکا گئی۔ وہ شاید مسکرایا تھا۔

”کیونکہ پتا نہیں کب کس لمحے تم سے محبت ہو گئی تھی۔“ میں سن رہ گئی۔ (جاری ہے)



# روحانی ڈائری

افشاں علی کی ڈائری سے

نوشی گیلانی کی نظم

بیٹیاں بھی تو ماؤں جیسی ہوتی ہیں  
منہ بٹ کے زور آنچل میں

روتے روتے ہنس پڑتی ہیں  
ہنستے ہنستے دل ہی دل میں رو لیتی ہیں

خوشی کی خواہش کرتے کرتے

خواب اور خاک میں اٹ جاتی ہیں

سوحصوں میں بٹ جاتی ہیں

گھر کے دروازے پر بیٹھی امیدوں کے ریشم بنتے

ساری عمر گنوا دیتی ہیں

میں جو گئے دنوں میں ماں کی خوش فہمی پہ

ہنس دیتی ہوں

اب خود بھی تو عمر کی گرتی دیواروں سے ٹیک لگائے

فصل خوشی کی بونی ہوں اور

خوش فہمی کی کاٹ رہی ہوں

جانے کیسی رسم ہے یہ بھی

ماں کیوں بیٹی کو ورے میں

اپنا مقدر دے دیتی ہیں

روشنی فیصل کی ڈائری سے

سعود عثمانی کی غزل

نہ کل رہے نہ کبھی کوئی شاہ پارہ بنے

سو حق تو یہ ہے کہ اب چاک بھی دوبارہ بنے

عجیب فیصلہ تھا روشنی کے خالق کا

کہ جو دیا بھی نہیں تھا وہی ستارہ بنے

یہ کیسے لوگ ہیں مٹی کی لائھیوں کی طرح

نہ خود بنے نہ کسی اور کا سہارا بنے

اور اب تو خواہشِ نظارہ یہ بھی چاہتی ہے

یہ کائنات میرے سامنے دوبارہ بنے

ہم ایسے لوگ تو اپنے بھی نہیں بن پاتے

تو خوب سوچ سمجھ کر کوئی ہمارا بنے

ریمانور رضوان کی ڈائری سے

نامعلوم شاعر کی غزل

سزا پر چھوڑ دیا جزا پر چھوڑ دیا

ہر اک کام ہم نے خدا پر چھوڑ دیا

وہ ہم کو یاد رکھتا ہے یا بھلا دیتا

اس کا کام تھا اس کی رضا پر چھوڑ دیا

اب اس کی مرضی بجا دے یا جلا رکھے چراغ

ہم نے جلا کر ہوا پر چھوڑ دیا

اب اس کا یاد بھی کرتے تو کس طرح کرتے

یہ مسئلہ دعاؤں کا تھا ہم نے دعا پر چھوڑ دیا

مہوش جواد کی ڈائری سے

امجد اسلام امجد کا کلام

نصف صدی ہونے کو آئی

میرا گھر اور میری بستی

ظلم کی آگ میں جل جل راکھ میں ڈھلتے ہیں



حقیقت کس قدر تلخ ہے جاناں  
کہ  
آج!

تمہاری شادی کے کارڈ پر  
تمہارے نام کے ساتھ  
کسی اور کا نام درج ہے

خالدہ عارف کی ڈائری سے

صدف غوری کا کلام

جس نے میری قسم کھا کے  
اپنی وفاؤں کا یقین دلایا تھا  
اور کہا تھا  
وقت بدل جائے گا  
موسم بدل جائے گا  
دنیا کی ہر چیز بدل جائے گی  
مگر  
میں نہ بدلوں گی

آج

وقت بھی وہی ہے  
موسم بھی وہی ہے  
دنیا کی ہر چیز وہی ہے  
بس

دو دل بدل گئے

ایک اس کا

ایک میرا

اس کے دل میں میرا پیار نہ رہا  
میرے دل میں اس کا اعتبار نہ رہا

☆.....

میرے لوگ میرے بچے  
خوابوں اور سرابوں کے ایک جال میں الجھے  
کٹتے مرتے جاتے ہیں  
چاروں جانب لہو کی دلدل ہے  
گلی گلی تعزیر کے پہرے  
کوچہ کوچہ قتل ہے

اور یہ دنیا

عالمگیر اخوت کی تقدیس کی پہرے دار یہ دنیا  
ہم کو جلتے کٹتے مرتے  
دیکھتی ہے اور چپ رہتی ہے  
زور آور کے ظلم کا سایہ پل پل لہبا ہوتا ہے  
وادی کی ہر شام کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوتا ہے  
لیکن یہ جو خون شہیداں کی شا میں ہیں  
جب تک ان کی لو میں سلامت  
تک ان کی آگ فروزاں  
درد کی آخری حد پر بھی یہ دل کو سہارا ہوتا ہے  
ہر ایک کالی رات کے پیچھے ایک سویرا ہوتا ہے

شہلا گل سحر صالح کی ڈائری سے

ایک خوب صورت نظم

میں نے دل  
اور زیست کی کتاب پر  
ہر پھول ہر گلاب پر  
پلکوں کی چلمن اور  
ہر خواب پر  
مانگ کی افشاں  
اور مہندی رچے ہاتھ پر  
تیرے نام کے ساتھ  
اپنا نام لکھا تھا  
مگر



# الشعار

کنول خان ————— ہری پور ہزار  
ہستی بستی زندگانی میری  
ہنتے ہنتے اجاڑ گیا کوئی

فرزانہ شوکت ————— کراچی  
کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہوا  
مایوس تو نہیں ہیں طلوع سحر سے ہم  
مانا کہ اس زمین کو نہ گلزار کر سکے  
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم  
ماریہ یاسر ————— کراچی

محبتوں کے ہوں دن ہزار  
جیسے گی یہ سو سال  
اس کے لیے نہیں ایک دن  
یہ تو چاہے بے شمار

ماریہ علی ————— گوجرانہ  
ہم تو محبت میں بھی توحید کے قائل ہیں فراز  
ایک ہی شخص کو محبوب بنائے رکھا  
نوشین مدثر ————— لاہور  
کی محبت تو سیاست کا چلن چھوڑ دیا  
ہم اگر محبت نہ کرتے تو حکومت کرتے  
عانیہ نیازی ————— ربوہ

اور پھر یوں ہوا کہ ٹوٹ گیا  
وہ جو اک رشتہ محبت تھا

مریم نواز ————— فیصل آباد  
دیار نور میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو  
کوئی تو ہو جو مری وحشتوں کا ساتھی ہو  
اریشہ ————— کمالیہ

نہ رنگ و روپ کی طرح نہ خود خال کی طرح  
وہ میرے من میں آسا کسی ملال کی طرح  
میں رستہ ہوں اور تمہاری یاد قافلہ ہے جو  
گزر رہی ہے مجھ سے میرے ماہ و سال کی طرح  
حوریہ صادق ————— حیدر آباد

اب یہ سوچوں تو بھنور ذہن میں پڑ جاتے ہیں  
کیسے چہرے ہیں جو ملتے ہیں پکھڑ جاتے ہیں  
کیوں تیرے درد کو دیں تہمت ویرانی دل  
زلزلوں میں تو بھرے شہر اجڑ جاتے ہیں  
دھنک ناز ————— کراچی

کیوں چپکے سے وہ لوگ اتر جاتے ہیں دل میں  
جن لوگوں سے قسمت کے ستارے نہیں ملتے  
مریم قادر ————— اسلام آباد

ہر کوئی روکے رکھائے ضروری تو نہیں  
خشک آنکھوں میں بھی سیلاب ہوا کرتے ہیں  
یمنی ناصر ————— اوکاڑہ

سوچا کہیں کہ ٹوٹ نہ جائے کسی کا دل  
گزری ہے اپنی عمر اسی دیکھ بھال میں  
خالد وہ بات تو اب اسے یاد بھی نہیں  
ہم جی کو خون کر گئے جس کے ملال میں



نگہت تو قیر ————— چیچہ وطنی  
گزرے سالوں کی طرح سب کچھ ویسا ہی ہے  
بس اک تو نہیں تیرا احساس نہیں  
رمنا را حیل ————— ملتان

کوئی اس طرح سے میرے ساتھ عداوت کرتا  
قید کر لیتا مجھے اور حکومت کرتا  
میں نے یہ کب کہا تھا کہ وہ سب کو چھوڑے  
وہ اپنے انداز سے کرتا پر محبت کرتا  
علیزے، زارا ————— راولپنڈی

اداس، لمحوں کا نہ کوئی ملال رکھنا  
طوفان میں بھی وجود سنبھال رکھنا  
کسی کے لیے شرط زندگی تم ہو  
کسی کی خاطر ہی اپنا خیال رکھنا  
نور بانو ————— کوئٹہ

آپ کی چاہت میں ہم زمانہ بھول گئے  
آپ کے بعد کسی اور کو اپنا بھول گئے  
آپ سے محبت ہے یہ بتایا سارے جہاں کو  
مگر آپ ہی کو بتانا بھول گئے  
صباحر ————— ہارون آباد

مجھ کو بھی راس آیا نہیں دوسرا کوئی  
اس کو بھی میرے بعد سہارا نہیں ملا  
برسوں سے پھر رہا تھا میں جس کی تلاش میں  
وہ مل گیا تو اس سے ستارا نہیں ملا  
عفاف ————— گجرات

تم کیا جانو کیا ہے تنہائی  
اس ٹوٹے ہوئے پتے سے پوچھو کیا ہے جدائی  
یوں بے وفائی کا الزام نہ دے جاناں  
اس وقت سے پوچھ کس وقت تیری یاد نہ آئی

بشری خان ————— لاہور  
تیرے بنا ہم جینا بھول جاتے ہیں  
زخموں کو سینا بھول جاتے ہیں  
تو زندگی میں سب سے عزیز ہے ہمیں  
تجھ سے ہر بار یہی کہنا بھول جاتے ہیں  
ارینہ کامران ————— لاہور

بہت چاہا مگر انہیں بھلا نہ سکے  
خیالوں میں کسی اور کو لا نہ سکے  
اس کو دیکھ کے آنسو تو پونچھ لیتے  
پر کسی اور کو دیکھ کے مسکرا نہ سکے  
زہرہ مگسی ————— سکھر

اترا ہے میرے دل میں کوئی چاند نگر سے  
اب خوف نہیں کوئی اندھیروں کے سفر سے  
وہ بات ہے تجھ میں کہ کوئی تجھ سا نہیں ہے  
اے کاش کوئی دیکھے تجھے میری نظر سے  
حناعلیٰ ————— ملتان

اب کے برس کچھ ایسی تدبیریں کرتے ہیں  
مل کے اک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں  
کچھ خواب یقین کی سرحد پر آ پہنچے  
آنکھ کھلنے سے پہلے ان کی تعمیر کرتے ہیں  
ثناء حیات ————— کراچی

میں پتھر ہوں مگر سچ بولتا ہوں  
وہ آئینہ ہے اور سچا نہیں ہے  
صراطِ عشق پر مڑ کر نہ دیکھو  
ملنے کا کوئی رستہ نہیں ہے

ملاہ اسلم ————— خانیوال  
بڑا زعم تھا مجھے اپنی چاہت پر مگر  
ٹوٹ کر بکھیر دیا کیونکہ وہ اپنے اختیار میں تھا  
☆.....



# اس ماہ میں

ہوتے ہیں باہر سے کچھ نہیں بدلتا اندر سے سب کچھ مٹی ہو جاتا ہے۔  
☆ ہر شخص ایک ضخیم کتاب ہے بشرطیکہ آپ کو پڑھنا آتا ہو۔

دھنک ناز۔ کراچی

اس ماہ کے شگونی

مریض ڈاکٹر سے۔ ”کوئی لمبی عمر کا طریقہ بتادیں؟“  
ڈاکٹر۔ ”شادی کرلو۔“

مریض۔ ”کیا اس سے عمر لمبی ہو جائے گی؟“  
ڈاکٹر نہیں۔ ”یہ شوق ختم ہو جائے گا۔“

☆

بیوی۔ ”اگر میں مر گئی تو کتنے عرصے بعد شادی کرو گے؟“

شوہر۔ ”مہنگائی کا دور ہے بیگم لہذا میری کوشش تو یہی ہوگی کہ ”قل“ کے ساتھ ہی ”ولیمہ“ بھی ہو جائے۔“

☆

پٹھان۔ ”میں تم سے آئی لو پو کہوں تو کیا کرو گی؟“  
لڑکی۔ ”خوشی سرمر جاؤں گی۔“

پٹھان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بولا۔  
”جامیری بہن جی لے اپنی زندگی۔“

☆

لڑکی۔ ”آپ مجھے منگنی پر کیا دو گے؟“

اس ماہ کی خوب صورت بات

زندگی توقعات کے پورا نہ ہونے اور غیر متوقع حادثات و واقعات کا سامنا کرنے کا نام ہے جب آپ دوست ہوں تو کوئی بھی آپ کو یاد نہیں کرتا مگر جب آپ غلط ہوں تو کوئی بھی آپ کو بھول نہیں پاتا۔

عانیہ نیازی۔ ربوہ

اس ماہ کی کر نیں

☆ اپنی مسرت کے لیے دوسروں کی مسرت کو خاک میں نہ ملاؤ۔

☆ ایک اچھی کتاب انسان کا بہترین سرمایہ ہوتی ہے۔

☆ بڑا قد سے نہیں کیے گئے کام اور اس کے معیار سے ہوتا ہے انسان، سمجھ کا تعلق عمر سے نہیں احساس سے ہوتا ہے۔

☆ پرانے لوگ ہوں یا معاملے ان سے دور ہی رہنا چاہیے۔

☆ زیادہ باتونی شخص پڑھنے کی طرف کم توجہ دیتا ہے۔

☆ ہر اچھے اور برے شخص کو ہنس کر قبول کرنا چاہیے کیونکہ یہ ہمارے نصیب (قسمت) کی وجہ سے ہوتا ہے۔

☆ برائی اور برے اعمال دیمک کی طرح



سردار۔ ”جو آپ کہو گی۔“

لڑکی۔ ”رنگ دے دینا۔“

سردار۔ ”ٹھیک ہے پر ریسومت کرنا ورنہ بیلنس کٹ جائے گا۔“

صباح۔ ہارون آباد

### اس ماہ کی مزاحیہ غزل

یوں مزاح کہنے پر اس کو خوش گمانی اور ہے  
یار سے رخ سے جھلکتی شادمانی اور ہے  
شادیاں کرنے کا میرے یار کو اک شوق ہے  
پہلے تھیں وہ مانیاں یہ مہارانیاں اور ہے  
خال چپکے بالوں کی مانند چلے جاتے ہیں جو  
کہہ دو ان سے پیارے بچو! نو جوانی اور ہے  
گٹھکے کھا کر جو سمجھتے ہیں بڑے ہیں پہلوان  
وہ کیا جانیں درحقیقت پہلوانی اور ہے  
یاد ہے قصہ ہمیں بھی شیریں و فرہاد کا  
آج کے لیلیٰ و مجنوں کی کہانی اور ہے  
بے ملاوٹ شے نہیں جو بیچتے بازار میں  
آج وہ ہی کہہ رہے ہیں بے ایمانی اور ہے  
راز یہ کھلتا ہے جب سرکاری آفس میں ہو کام  
چائے پینا اور ہے یہ چائے پانی اور ہے

شاعر: صدیق راز

انتخاب: شفاء ملک۔ کراچی

### اس ماہ کا افسانچہ

وہ پہلی بار مجھے میری آنٹی کے گھر ملا تھا۔ پھر  
کالج کینٹین میں، وہ جہاں بھی ملتا مجھے ایسا لگتا جیسے  
وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا ہو۔ مجھے وہ بہت برا لگتا۔ اب تو  
وہ میرے گھر تک پہنچ گیا تھا میں بے چاری صنف  
نازک اپنی عزت کی وجہ سے کسی کو نہ بتا پالی۔  
ایک دن میں کچن میں چائے بنا رہی تھی کہ

اچانک وہ میرے سامنے آ گیا مگر میں نے ہمت  
کر کے ساری بات اپنی امی کو بتادی۔ امی دوڑی  
دوڑی کچن میں آئیں مگر لگتا تھا کہ وہ امی کے ڈر  
سے بھاگ گیا تھا۔

ایک رات میں نیند میں مدہوش تھی کہ اچانک  
میرے گال پر گدگدی ہوئی۔ میں ڈر کے اٹھی اور  
میری نظر اس پر پڑی۔ میرے کمرے میں موجود  
اور میرے بستر پر آخر وہ کر کیا رہا تھا؟ میں نے  
زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ میری چیخ سن کر  
میرے گھر والے دوڑے چلے آئے آخر ان سب  
کو ساری بات پتا چل گئی۔

پہلے تو انہوں نے مجھے خوب ڈانٹا مگر پھر اس  
”کا کروچ“ کا خاتمہ کر دیا۔ وہ دن تھا اور آج کا  
دن میں اپنا بستر ہمیشہ جھاڑ کر سوتی ہوں۔  
نوشین مدر۔ لاہور

### اس ماہ کی غزل

قصے میری الفت کے جو مرقوم ہیں سارے  
آدیکھ تیرے نام سے موسوم ہیں سارے  
بس اس لیے ہر کام ادھورا ہی پڑا ہے  
خادم بھی میری قوم کے مخدوم ہیں سارے  
اب کون میرے پاؤں کی زنجیر کو کھولے  
حاکم میری بستی کے بھی محکوم ہیں سارے  
شاید یہ ظرف ہے جو خاموش ہوں اب تک  
ورنہ تو تیرے عیب بھی معلوم ہیں سارے  
سب جرم میری ذات سے منسوب ہیں محسن  
کیا میرے سوا شہر میں معصوم ہیں سارے  
کلام: محسن نقوی

انتخاب: ایم جے قریشی۔ ڈی آئی خان



اس ماہ کان کہیں جنہیں!.....!

انسان کے اہم ترین جسمانی اعضاء میں کان شامل ہیں۔ یہ سونے، ہیرے اور کوئلے کی کان والے نہیں بلکہ یہ وہ کان ہیں جن سے سنائی دیتا ہے۔ کان اگر نہ ہوتے تو علم کا حصول ناممکن ہوتا۔ بھی آخر عینک کیسے لگائی جاتی۔ خواتین شادی بیاہ پر اس قدر بنتی سنورتی ہیں کان بھی سجاوٹ میں کم نہیں ہوتے۔ اس قدر بھاری بھاری بندے، جھمکے پہنتی ہیں کہ کان لٹک جاتے ہیں۔ جب یہ جھمکے اتارتی ہیں تو کان بکری کے کان جیسے لمبے ہو جاتے ہیں۔

جو لوگ پڑھے لکھے نہیں ہوتے ان کے کان لمبے اور بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ جب وہ چھوٹے ہوتے ہیں اور اسکول نہیں جاتے بہانے بناتے ہیں اور جانے سے انکار کرتے ہیں تو ان کے والد انہیں کان سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے اسکول لے کر جاتے ہیں۔ جب اسکول پہنچ جاتے ہیں تو پھر استاد بھی سزا کے طور پر اتفاق سے اسی کان سے پکڑ لیتا ہے اور خوب کھینچتا ہے۔ اس طرح ان کے کان لمبے لمبے خرگوش کی طرح سے ہو جاتے ہیں۔

اگر کان نہ ہوتے تو وہ بچے اللہ کا شکر ادا کرتے جو گھر سے ہوم ورک کر کے نہیں جاتے اور ان کو کان پکڑنے پڑتے ہیں۔ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے کوئی بات کہی جائے تو وہ ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے یا ان کے ذہن میں بات بٹھانے کے لیے پہلے ان کا موڈ ان کا دھیان ان کی دلچسپی دیکھنی چاہیے۔ بعض لوگوں کو اگر کوئی راز کی بات بتادی

جائے تو یہ باتیں ان کے کان میں پڑتے ہی ان کا پیٹ پھولنے لگتا ہے، جب تک وہ کسی کو بتانہ دیں، ان کو چین نہیں آتا۔ اب قطعی طور پر یہ بھی نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ جن لوگوں کے پیٹ بڑے بڑے ہیں انہوں نے ابھی تک راز کی باتیں نہیں بتائیں اور وہ ابھی تک ان کے پیٹ میں ہیں۔

کہتے ہیں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کان ہوتے ہیں تو منہ، ناک، آنکھیں کیوں نہیں ہوتیں۔ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں کہ اگر ان کو کوئی بات بتائی جائے تو کہتے ہیں کہ میرے کان نہ کھاؤ، یہ بالکل غلط کہتے ہیں اگر ایسا ہوتا تو کئی لوگ کان کٹے ہوتے۔

کان، باتوں اور ارادوں کے امین ہوتے ہیں۔ اگر یہ اپنی ذمہ داری نہ نبھائیں تو دنیا میں فساد کھڑا ہو جائے۔ کانوں کے اندر ایسا پردہ موجود ہوتا ہے جو کبھی بھی نہیں ہٹتا۔ پتا نہیں اس کے پیچھے کون سا خوب صورت چہرہ چھپا بیٹھا ہے؟ ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اس ماہ انجیر کے فوائد

﴿ رنگ نکھارنے کے لیے: رنگت نکھارنے کے لیے روزانہ نہار منہ تین دانے انجیر کا استعمال کریں۔ ایک ماہ میں رنگ نکھر جائے گا۔

﴿ چہرے کے داغ: چہرے کے داغ دور کرنے کے لیے انجیر کے دودھ میں جو کا آٹا گوندھ کر داغ پر لگائیں۔ چند ہفتوں میں داغ دور ہو جائیں گے۔

﴿ موٹاپا دور کرنے کے لیے موٹاپا جسم کا بھدا پن ختم کرنے کے لیے: نہار منہ تین دانے انجیر کھائیں چند ہفتوں میں بھدا پن زائل ہو جائے گا۔

﴿ قبض دور کرنے کے لیے: قبض دور کرنے



کے لیے نہار منہ پانچ دانے انجیر کے کھائیں چند دنوں میں قبض دور ہو جائے گا۔

✽ پتے کی پتھری: اس مسئلے کے لیے دس دانے انجیر نہار منہ دو ماہ تک استعمال کریں۔  
✽ گردے فیل ہونا: اگر زندگی اتنی مہلت دے کہ کچھ عرصہ انجیر کھا سکیں تو چند ہفتے انجیر کھائیں فائدہ ہوگا۔

✽ بواسیر کا علاج: اس مرض کے لیے انجیر کو بہت مفید قرار دیا گیا ہے۔ اس مرض کے لیے نہار منہ تین باہ تک چار دانے انجیر کھالیا کریں بواسیر کا مرض رفع ہو جائے گا۔

احتیاط: انجیر اور کھجور کبھی بھی ایک ساتھ استعمال نہ کریں۔

ریمانور رضوان۔ کراچی

### اس ماہ کی ہری مرچیں

☆ کیبل کے سائے میں پلنے والے محمد بن قاسم یا ٹیپو سلطان نہیں بلکہ شاہ رخ اور عامر خان بنیں گے۔

☆ جس شادی کی مووی نہ بن رہی ہو اس شادی میں شریک لڑکیاں ایسے لگتی ہیں جیسے صدیوں کی بیمار ہوں۔

☆ عورت ایک جھوٹا آنسو بھی بہا دے تو مرد قربان ہونے کو تیار ہو جاتا ہے، پھر بھی صنفِ نازک کو شکوہ رہتا ہے کہ مرد وفادار نہیں۔

☆ عورت کو زبان درازی کا طعنہ دینے والے اس کی ایک لمحے کی خاموشی پر ٹپ کر رہ جاتے ہیں۔

☆ بھائی کے پاس بہن کے لئے وقت نہیں جبکہ دوسرے کی بہن کے لئے وقت ہی وقت ہے۔  
☆ مرد ہر حال میں رعب ڈالنا چاہتا ہے خواہ

باپ ہو، بھائی ہو یا خاوند۔

نور بانو۔ کوئٹہ

### اس ماہ لفظوں کے موتی

☆ قدر کرو ان کی جو تمہیں بنا مطلب کے چاہتے ہیں۔ کیونکہ دنیا میں خیال کرنے والے کم اور تکلیف دینے والے زیادہ ہیں۔

☆ رب کو عبادت سے اور مخلوق کو اخلاق سے رازی رکھو۔ دنیا اور آخر میں خوش رہو گے۔  
☆ ایسے شخص کو کبھی مت گنوانا جس کے دل میں تمہارے عزت، پیار اور چاہت ہو۔

☆ جب قرآن پاک پڑھتے ہو تو شیطان کے سر میں درد ہوتا ہے اور جب تم قرآن پاک کھولتے ہو تو شیطان پریشان ہو جاتا ہے اور جب تم قرآن پاک پڑھتے ہو تو شیطان کمزور ہو جاتا ہے۔ اس لیے قرآن پاک کی تلاوت کثرت سے کیا کرو۔

☆ اگر کسی کی یاد شدت اختیار کر لے اور تم اسے کبھی نہ بھلا پاؤ تو یہ تمہارا کمال نہیں۔ کمال اس کا ہے کیونکہ اس کے پیار اور خلوص میں کوئی ملاوٹ نہیں۔

فرح جواد۔ کھاریاں

### اس ماہ کا فلسفہ

زندگی بند دروازہ ہی سہی مگر جو لوگ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے ان کے لیے یہ بند دروازہ کھلنے پر کبھی مایوسی نہیں لاتا پس اللہ کے فیصلوں پر مکمل اعتماد اور رحمت کا کامل یقین ہی تو زندگی گزارنے کا اصل مقصد ہے۔

امبرین حیدر۔ اسلام آباد

☆.....☆.....





## حضور اکرمؐ نے فرمایا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ ”جو شخص آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس پر لازم ہے کہ اپنے ہمسائے کو تکلیف نہ دے اور اسے چاہیے کہ مہمان کا احترام کرے اور اسے چاہیے کہ بولے تو بھلائی کی بات کرے ورنہ خاموش رہے۔ (بخاری شریف)

تم لوگوں کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو تو صومحن بن جاؤ گے۔ (ترمذی)

سیدہ نورین - کراچی

## اپریل فول ڈے سے اجتناب

اپریل فول ڈے کے اس جھوٹے کام میں کسی طرح سے حصہ نہ لیں۔

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اور وہ جھوٹ میں شریک نہیں ہوتے اور جب بے ہودہ کام کے پاس سے گزرتے ہیں تو پہلو بچا کر گزرتے ہیں۔“ (الفرقان: 27)

اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: ”آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر لایعنی (بے فائدہ چیز) کو چھوڑ دے۔ (ترمذی)

## سیدھی اور اچھی بات

اللہ کا فرمان ہے۔ ”اور لوگوں سے اچھی بات

کرو۔“ (البقرہ: 88)۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ ”اور جب (کسی کی نسبت) کوئی بات کہو تو عدل و انصاف سے کیا کرو۔“ (الاسرا: 152)۔ یہی وہ درست رویہ ہے جس کا انعام بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اے اہل ایمان اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور بات بالکل سیدھی کیا کرو۔ اللہ تمہارے کاموں کو درست فرما دے گا اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا تو وہ عظیم کامیابی سے ہمکنار ہو گا۔ (الاحزاب: 70-71)

ایم جے قریشی۔ ڈی آئی خان

## باتوں سے خوشبو

☆ عمر بھی ضمیر اور جوتے کی مانند ہے ان کی موجودگی کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک وہ تکلیف نہ دیے لگیں۔

☆ محبت اعتبار کے بغیر کچھ بھی نہیں جب کہ اعتبار محبت کے بغیر بھی بہت قیمتی ہے۔

☆ جب ناخن بڑے ہو جاتے ہیں تو ناخن ہی کاٹے جاتے ہیں۔ انگلیاں نہیں بالکل اسی طرح جب رشتے داروں میں رنجش پیدا ہوتی ہے تو رنجش ختم کرنی چاہیے نہ کہ رشتے۔

☆ غلطیاں بے وقوف اور عقل مند دونوں سے ہوتی ہیں۔ فرق بس یہ ہے کہ ایک کو آخر تک



## زندگی کے ادوار

زندگی کے تین ادوار عجب رنگ میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

1۔ اسکول لائف ٹائم ہے دوست ہیں لیکن پیسہ نہیں ہے۔

2۔ شادی شدہ لائف۔ دوست ہیں پیسہ ہے لیکن ٹائم نہیں۔

3۔ اولڈ لائف۔ ٹائم ہے پیسہ ہے لیکن دوست نہیں۔

امبرین حیدر۔ اسلام آباد

## فضیلت نماز پنجگانہ

﴿نماز فجر: تمہاری خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔﴾

﴿نماز ظہر: تمہاری آمدنی میں اضافہ کرتی ہے۔﴾

﴿نماز عصر: تمہاری صحت میں اضافہ کرتی ہے۔﴾

﴿نماز مغرب: تمہارا مستقبل سنوارتی ہے۔﴾

﴿نماز عشاء: تم کو سکون کی نیند سلاتی ہے۔﴾

انمول موتی

مشکلات ہمیشہ بہترین لوگوں کے حصے میں

آتی ہیں کیونکہ وہ اس کو بہترین طریقے سے انجام

دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ (حضرت علیؓ)

مصباح مسکان رؤف اور امینہ رؤف۔ جہلم

کھوتی

ایک عورت نے ہرنی کا گوشت پکایا مگر بچوں

کو اس کا نام نہیں بتایا کہ کس کا گوشت ہے لیکن

ایک اشارہ دیتے ہوئے بولی۔

”بچوں! یہ وہ ہے جو تمہارے پاپا مجھے پیار

سے کہتے ہیں۔“

اچانک ایک بچہ بولا۔

احساس نہیں ہوتا اور دوسرے کو فوراً ہو جاتا ہے۔

☆ جب کبھی دل بھر آئے تو رولو جیسے آسمان

پر چھائے ہوئے بادل برستے ہیں کیونکہ اس کا

نتیجہ ایک چمکتا اور ابھرتا ہوا سورج ہے۔

☆ نعمت ملنے پر فوراً اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے

شکر ادا کرنے سے نعمت اور بڑھتی ہے۔

نورین نور۔ کراچی

## کام

فقیر نے ایک خاتون کو روک کر کہا۔ ”خدا

کے نام پر مجھے ایک روپیہ دے دو۔ ورنہ مجھے ایک

ایسا خوفناک کام کرنا پڑے گا جس کے خیال ہی

سے میری روح کانپ جاتی ہے روٹھنے کھڑے

ہو جاتے ہیں اور بدن پر پچی طاری ہو جاتی

ہے۔“

خاتون نے دہشت زدہ ہو کر فقیر کو ایک

روپیہ دے دیا اور ڈرتے ہوئے پوچھا۔

”بتاؤ وہ کون سا کام ہے؟“

فقیر نے جواب دیا محنت مزدوری۔“

صباحر۔ ہارون آباد

## منگل

ایک آدمی کی بیوی مر گئی۔ رشتے داروں اور

دوستوں نے اسے چپ کرانے کے بعد پوچھا۔

”تمہیں کچھ چاہیے؟“

آدمی نے جواب دیا۔ ”ہاں مجھے میرا لپ

ٹاپ لادیں۔“

لوگوں نے وجہ پوچھی۔ ”اس کا کیا کرنا ہے۔“

آدمی بولا۔ ”گیس بک پر اپنے اسٹیٹس کو

سنگل کرنا ہے۔“

نوشین مدثر۔ لاہور



”اوائے نہ کھاؤ کھوتی پکی اوائے کھوتی۔“

ریمانور رضوان۔ کراچی

جان لیں.....!

☆ پچھتاوا بھی نصیب والوں کو ملتا ہے۔

☆ کتنے بد نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جن تک

محبت آتی ہے اور بنا نوازے پلٹ جاتی ہے۔

☆ جب ہم اپنی نفرت یا محبت کو پوری طرح

ظاہر نہ کر پائیں تو پھر ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔

☆ وہ لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں جو

احسان تو کرتے ہیں لیکن اسے چکانے کا کوئی

راستہ نہیں چھوڑتے۔

☆ وہ محبت ہی کیا جو جرأت نہ دے سکے۔

☆ جب ضبط کا بندھن ٹوٹتا ہے تو جذبات

ٹھانٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرح بہہ نکلتے ہیں

لیکن وقت گزرتا ہے تو ہر طغیانی کو قرار آ جاتا ہے۔

☆ درد خرید کر درماں بیچنے والے کہاں گئے،

زندگی سک رہی ہے اور اس کے آنسو پونچھنے والا

کوئی نہیں۔

☆ زندگی کسی ایک فرد کے نہیں بلکہ ایک

شخص کے سدھرنے سے سدھرے گی۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

کردار

☆ انسانی شخصیت کی پہچان کردار ہے۔ یہ ایک

ایسی دولت ہے جس کی ہر کوئی عزت کرتا ہے۔

☆ کردار وہ سرمایہ ہے جو پرسکون ماحول مہیا

کرتا ہے۔ ایک ایسی دیوار ہے جس کو گرانا بہت

مشکل ہے۔

☆ کردار ایک انسانی شخصیت کا حصہ بن کر

رہے تو وہ انسان ستاروں کی طرح چمکتا ہے۔ بلند

کردار والا انسان بلندیوں پر رہتا ہے اور پست  
کردار والا انسان پستیوں میں جا گرتا ہے۔ دنیا  
کی ہر خوشی حاصل کر لینا کوئی کمال نہیں، کردار کو  
اپنے اندر سمولینا بہت بڑا فن ہے۔

خاموشی

ایک بند دروازہ ہے۔ جس کے پیچھے حماقت

بھی ہو سکتی ہے اور لیاقت بھی۔

فرزانہ شوکت۔ کراچی

کرنوں کی روشنی

☆ اللہ سے رجوع کرنے میں کوئی جھجک

محسوس نہ کرو۔ اس کے پاس تو گزرے ہوئے کل

کی معافی بھی ہے اور آنے والے کل کا انعام بھی۔

☆ خلوص اور عزت بہت نایاب تحفے ہیں۔

اس لیے پھر کسی سے ان کی امید نہ رکھو کیونکہ بہت

کم لوگ دل کے امیر ہوتے ہیں۔

☆ ڈاکٹر علامہ اقبال لکھتے ہیں میں نے

زندگی میں صرف 5 باتیں سیکھیں۔

i۔ ماں کے سوا کوئی وفادار نہیں۔

ii۔ غریب کا کوئی دوست نہیں بنتا۔

iii۔ لوگ اچھی سیرت کو نہیں اچھی صورت کو

ترجیح دیتے ہیں۔

iv۔ عزت صرف پیسے کی ہے انسان کی نہیں۔

v۔ انسان جس شخص کے لیے دل سے مخلص

ہو وہی شخص زیادہ دکھ دیتا ہے۔

☆ انسان کی بربادی کا وقت تب شروع ہوتا ہے

جب وہ اپنے مخلص دوستوں سے جدائی اختیار کر لیتا ہے۔

☆ انسان بڑی عجیب مخلوق ہے یہ جانور کو

مصیبت میں دیکھ کر برداشت نہیں کرتا لیکن کسی

انسان کو مصیبت میں مبتلا کر کے خوش ہوتا ہے۔

ایم جے قریشی۔ ڈی آئی خان ☆



# فردوسِ گہنا

نظم

میں نے تجھے پیار کا سا گر لکھا  
میں نے تجھے خواب کا منظر لکھا  
میں نے تجھے چاند سا سندر لکھا  
میں نے تجھے یاد کا محور لکھا  
میں نے تجھے پریت کا سمندر لکھا  
میں نے تجھے وفا کا پیکر لکھا  
میں نے تجھے وقت کا گوہر لکھا  
میں نے تجھے زیست کا سفر لکھا  
میں نے تجھے خواہش کا گھر لکھا  
میں نے تجھے اپنا مقدر لکھا

شہلا گل سحر

نظم

خاموش ہے آنکھوں کا دریا  
لوٹ کر آیا ہے  
جب سے تنہا یہ دل  
ٹوٹی ہے امید مگر  
اب بھی دھڑکتا ہے یہ دل

نور الصبا

غزل

گل پوش نظاروں کی ادا خوب لگی تھی  
اس شوخ کی آنکھوں میں حیا خوب لگی تھی  
جب بام پہ آیا تھا قمر دیکھنے اس کو

اس شام ستاروں کی ادا خوب لگی تھی  
جس روز قدم اس نے مرے گھر میں رکھا تھا  
اُس روز مجھے گھر کی فضا خوب لگی تھی  
سیکھے تو کوئی اس سے وہ انداز ستم کا  
ہر وار پر قاتل کی ادا خوب لگی تھی!  
اک جس کا موسم تھا مرے خانہ دل میں  
اُس رات جو برسی تھی گھٹا خوب لگی تھی  
جب زہر بھرا جام دیا پیار سے اس نے  
ہونٹوں پر تبسم کی ادا خوب لگی تھی!  
ہاتھ اپنے اٹھائے وہ مجھے مانگ رہا تھا!  
ان پھول سے ہونٹوں پر دعا خوب لگی تھی  
حکیم خان حکیم

جرم خاص

خوبرو لڑکی تھی بیٹھی تھی کیے سولہ سنگھار  
چار جانب تھے کھڑے  
اپنے ہی اس کے رشتے دار  
زہر کا پیالہ تھا ان کے ہاتھ میں  
ساتھ ہی تھا ایک ٹوکا تیز دھار  
سامنے تھی ان کی ہی لختِ جگر  
جس کو بخشا تھا انہوں نے اختیار  
زہر پی کر ختم کر لے زندگی  
یار ہے پھر ٹکڑے ہونے کو تیار  
لے پیالہ ہاتھ میں زہر اب کا



دیکھا اس نے محسنوں کو ایک بار  
 پی لیا سارا پیالہ زہر کا  
 اس کی آنکھوں میں اتر آیا خمار  
 اور پھر تڑپی تڑپ کر مر گئی  
 قاتلوں کے چہروں پر آیا نکھار  
 نام اس کو خود کسی کا دے دیا  
 بچ سکیں قانون سے وہ نابکار  
 پسند کی شادی تھا اس کا جرم خاص  
 جس نے اس کو کر دیا تھا داغدار  
 تھی بڑی معصوم وہ بنت حوا  
 ہائے اس کے ساتھ کیا کچھ ہو گیا

ریاض حسین عمر

### غزل

کسی کی عنایتوں نے یہ دن دکھائے ہیں  
 میرے اپنے بھی یوں پھر سے پرائے ہیں  
 کھل کے برستا نہیں آج یوں بھی ابر  
 ہم زمانے کے ہاتھوں سے ستائے ہیں  
 فریب دنیا ان کا ہے معیار زندگی  
 حسن والوں نے ہم پرستم کئی ڈھائے ہیں  
 بچھڑ جائیں تو مڑ کے دیکھتا نہیں کوئی بھی  
 یاروں کی باتوں نے کیا کیا گل کھلائے ہیں  
 دامن پر لگے داغ دیکھتا کوئی نہیں جاوید  
 شرارے بھی پھول بن کے پھر جگمگائے ہیں  
 محمد اسلم جاوید

### برسوں بعد

آج میں برسوں بعد  
 ان راستوں کی طرف گیا تھا جاناں  
 جہاں کبھی رہا کرتے تھے  
 ہماری محبتوں کے موسم

مگر  
 وہاں اب صرف تنہائی کا ڈیرہ ہے  
 ویراں ویراں سا بھی وہاں کا سو پر ہے  
 جیسے برسوں سے وہاں نہیں کوئی کھہرا ہے  
 جیسے ایک شکست کھائے ہوئے دیوانے کے  
 دل پر چھایا ہوتا اندھیرا ہے  
 وہاں اب کوئی کسی سے  
 کرتا وعدہ نہیں  
 جیسے زمانے میں کسی کا  
 محبت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں  
 وقت کے بے رحم پنجوں سے جب بھی  
 تمہیں فرصت ملے جاناں  
 اک بار وہاں سے ہو کے آنا  
 شاید وہاں تمہیں محبت ملے جاناں  
 جہاں سے میں آج آنسو لے کے آیا ہوں  
 بھٹکتی، سسکتی ہوئی برسوں پرانی  
 کسی دیوانے کی آرزو لے کے آیا ہوں  
 تھکاوٹ سے چور  
 نڈھال زمانے سے ہاری ہوئی  
 ایک جستجو لے کے آیا ہوں  
 وقت کی دھول سے دبی ہوئی  
 کچھ قسمیں، کچھ یادیں  
 کچھ وعدے کچھ ارادے  
 جوانی اہمیت کھو چکے ہیں  
 کچھ مسکراہٹیں کچھ ادائیں  
 کچھ معصوم سی، حیراں سی  
 پریشان سی باتیں  
 اور کچھ درد میں ڈوبے ہوئے لمحے  
 آج بھی تیرے دیدار کے منتظر لگے  
 ایک بار ان سے مل کے آنا



کہ ہم ان کے قصور وار ہیں  
ہم نے اپنی انا کی جنگ میں  
اس محبت کا خون کر ڈالا  
جواب بغیر لحد کے

کسی بے قرار روح کی طرح  
اپنے وجود کو تلاش کرتی پھرتی ہے

”ساتھی“ زیرِ نہیار

## غزل

بزم امکاں ہے میری ذات میں گم  
اور میں دشت کائنات میں گم  
کون پڑھتا نوشتہ دیوار  
ساری خلقت تھی حادثات میں گم  
خانقاہوں میں زندگی رقصاں  
قصر شاہی تحفظات میں گم  
منتظر ہیں کسی کرامت کے  
آئینے گرد کائنات میں گم  
امتیاز امروز کی تلاش میں ہے  
اک مسافر اندھیری رات میں گم

ایس امتیاز احمد

## غزل

آج پھر وہی دیدار سخن بنا ہوا ہے  
کھل کے وہی دیوارِ چمن بنا ہوا ہے  
میرا وجود خود ہی دیارِ چمن بنا ہوا ہے  
رقیبوں کا دربارِ جلن بنا ہوا ہے  
انہیں بھی درکارِ سخن بنا ہوا ہے  
وہ میرا دلہنارِ رتن بنا ہوا ہے  
دشمنوں کو میرا دستارِ چہن بنا ہوا ہے  
میرا دل اس کا دلدارِ سخن بنا ہوا ہے

مہرین کنول

## نظم

یہ جو قصے اور فسانے ہیں محبت کے  
انہیں ہم نے بہت دیکھا ہے زندگی میں  
بہت سوچا، بہت چاہا ہے رویوں سے  
کیا ہے ان کی سچائی دنیا میں حقیقت میں  
کیا دیتے ہیں یہ کوئی خوشی کسی انسان کو  
یا فقط دل کی لگی کے بہانے ہیں  
جب ہم نے محبت کی وادی میں قدم رکھا تھا  
بہت سوچا تھا، بہت جانا تھا جاناں کو  
جب ہم اس کو ملے تو یہ بھول بیٹھے  
نہیں کرتا کوئی کسی سے  
بے غرض محبت اس دنیا میں  
جو سوچا تھا جو جانا تھا جاناں کو  
سب ایک فریب اور دھوکا تھا  
یہ جو قصے اور فسانے ہیں محبت کے  
انہیں ہم نے بہت دیکھا ہے زندگی میں

ماریہ یاسر

## زندگی

ابھی ابھی سی رہی  
بے ترتیبی  
بکھری سی ملی مجھے  
سنواری تو بکھر جاتی  
باوجود کوشش کہ نہ منہ بھل پاتی  
جب بھی چاہا اسے سایہ دوں  
لگا مجھے جیسے بہت پرایا ہوں  
عجب ڈھنگ رہے ہمیشہ اس کے  
سدا رہے اس کے رنگ پھیکے  
کبھی خوشی نہ اس سے منسلک رہی  
تمام عمر ہی یہاں سے وہاں بھٹکتی رہی



کیا کہوں زبان سے اپنی  
میری زندگی ہمیشہ مجھ سے خفا رہی

کوثر ناز

### لوٹ آؤ

سنو تم لوٹ آؤ کہ لوٹ آنے سے  
کبھی راہیں جدا نہیں ہوتیں  
رابطے ختم ہو جانے سے  
محبتیں کم نہیں ہوتیں  
دوریاں بڑھ بھی جائیں  
لیکن.....!

دل سے جوڑے  
بندھن ٹوٹ نہیں جاتے  
سنو تم لوٹ آؤ  
کہ.....!

محبت کی مسافتیں  
یوں اکیلے طے نہیں ہوتیں

### تمہارا ساتھ

آج فلک انتہائی دلکش لگ رہا ہے  
ہلکا ہلکا دودھیا نیلا آکاش  
اور اس پر کہیں کہیں سفید روئی کے  
گو لے جیسے بادلوں کے ٹکڑے  
کبھی ہلکی تبھی تیز سرد ہوا کے جھونکے

میری جان میرے رضوان جی  
تمہاری سنگت میں ہر منظر ہر نظارہ  
بڑا ہی دلفریب سا محسوس ہوتا ہے  
تمہاری چاہت میں پور پور ڈوب کر  
جب یہ حسین منظر دیکھتی ہوں  
تو ایسا لگتا ہے یہ سارے حسین دلکش منظر

میرے ”معبود برحق“ کی حمد و ثناء میں  
مشغول ہیں میں بھی من ہی من میں  
اپنے باری تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں  
کہ اس نے مجھے یہ حسین منظر دکھائے  
اور تمہاری محبت میں سرشار ہو کر  
اوپر نیچی راہوں میں چلتی جاتی ہوں  
کبھی تم میرا ہاتھ تھام کر  
لڑکھڑانے سے بچاتے ہو تو  
کبھی کوئی شوخ سی شرارت کر جاتے ہو  
تمہاری اس قدر چاہت پر سرشار  
ہو جاتی ہوں آج فلک انتہائی دلکش رہا ہے  
رب کے کرم سے تمہارے ساتھ سے  
زندگی دلکش لگ رہی ہے

ریما نور رضوان

### نظم

میں نے پیار کیا تھا اک بلبل سے  
اک چہکنے والی کونل سے  
نجانے کہاں کھو گئی وہ مجھ سے  
آئے کبھی تو ملنے مجھ سے  
وہ جب بھی خیال میں آتی ہے  
دل چہکنے گانے لگتا ہے  
وہ جب بھی خیال سے جاتی ہے  
دل پھر سکوت میں ہوتا ہے  
اس پیاری کہانی کا امرت  
میں قطرہ قطرہ پیتی ہوں  
میں نے پیار کیا تھا اک بلبل سے  
اک چہکنے والی کونل سے

سعدیہ نواز

☆.....



# سفرِ دل

خوش رہیں اور ردا کو یونہی اپنی آمد سے حسین سے حسین تر بناتی رہیں۔ ردا کے مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح خوب صورت و دلکش اور دل پسند رہے اور اب اجازت۔ اللہ حافظ۔

## فریدہ فریدہ — پاک پتن شریف

آپ جان، نورین جی اور پیاری سکھی سہیلیوں کو بے انتہا سلام خلوص۔ اس ماہ ردا نے وقت پر انٹری دے کر ہماری بھی سندیے کی محفل میں حاضری کو ممکن بنا دیا ورنہ پچھلے دو ماہ سے ایک نشست میں رسالہ پڑھنے اور منٹوں میں لیٹر لکھنے کے باوجود پوسٹ کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ بہر حال ہماری پیدائش کے مہینے کا ردا نہایت خوب صورت ٹائٹل سے سجا آنکھوں کو خیراں کر گیا۔ ماڈل کا نام بھی افسانوی تھا ”صائم“۔ ویسے بھی ہمارا ردا افسانوی سرزمین ہے اور فروری کے ردا نے افسانوی تڑکے کی نئی تاریخ رقم کر دی۔ ویلنٹائن پر مثبت و منفی ہر طرح کی کہانیاں بہت پاور فل تھیں اور افشاں جی کے مکمل ناول نے تو دل جیت لیا ناول کی ابتدا نہایت سنسنی خیز اور مدلل تھی۔ صنحاک اور درنجف کی پہلی ملاقات کی منظر نگاری اور رومانس انتہائی دل فریب تھا۔ رابعہ افضل خان کے محبت کے قلم نے نام نہاد محبت کے دن کی اصلیت خوب اچھی طرح اجاگر کی۔ گل جی (شہلا گل) کی تحریر ہر لحاظ سے پختگی کا اثر لیے ہوئے تھی۔ غوث پاک کا قول پوری تحریر کی جان تھا۔ مارچ کے ردا میں ”گوشہ آگہی“ سے نگاہیں تر کرتے

## عانیہ نیازی — ربوہ

سوئیٹ سی آپلی اور میرے تمام قارئین و رائرز کو میرا پیار بھرا سلام قبول و مقبول ہو۔ سب سے پہلے ”گوشہ آگہی“ کو دل میں اتارا اور پھر ”ردائے جنت“ سے فیض یاب ہوئے۔ اس بار شازیہ جی کے ناول کی آخری قسط شامل تھی تمام کرداروں کے ساتھ شازیہ جی نے بھرپور انصاف کرتے ہوئے ناول کو ایک خوبصورت اختتام دیا، ویل ڈن۔ عائشہ ذوالفقار کا سلسلے وار جتنے بھرپور انداز سے شروع ہوا اتنے ہی عمدہ انداز سے آگے بڑھ رہا ہے۔ کہانی کا تانا بانا بہت خوب صورتی سے بنایا ہے انہوں نے۔ اس بار تو آپلی کمال ہو گیا کہ تین تین مکمل ناول واہ دل خوش ہو گیا۔ مجھے نائلہ طارق اور ایقان علی کے ناولز نے بہت متاثر کیا خاص کر ایقان علی کے ناول نے تو مجھے اپنا اسیر کر لیا۔ نائلہ طارق کا اپنا ایک مخصوص انداز تحریر ہے جو ہمیں گرفت میں لیے رہتا ہے۔ خوب صورت ناول پڑھیں مبارک باد۔ ناولٹ میں ثناء کنول نے اچھا لکھا مگر نہال چوہدری کے بارے میں تھوڑی اور تفصیل لکھی جانی تو زیادہ اچھا ہوتا مگر ثناء آپ مجھے اتنی پیاری اور عزیز ہیں کہ میں نے آپ کے ناولٹ کو دل سے پڑھا ویل ڈن، اب بات ہو جائے افسانوں کی تو بہت دنوں بعد روشنی کی آمد بہت ہی پیاری لگی اور ان کا افسانہ بھی عمدہ تھا۔ نظیر فاطمہ، عائشہ انصاری، مصباح مسکان، تبسم فیاض، قرۃ العین نے بھی ماشاء اللہ بہت اچھا لکھا۔ سب کے لیے بہت سی دعائیں،



داخل ہوتے ہیں۔ (خوشیاں ڈھونڈنے کے لیے فاصلوں کو نہیں قرب کو ڈھونڈتے ہیں) کیا بات ہے آبی جان موتی پر دئے الفاظ اسی کو کہتے ہیں۔ شازیہ مصطفیٰ کی ہر لائن شرارتیں بکھیرتی تحریر اپنے اختتام کو پہنچی۔ شکر ہے اب ردا میں طویل تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ام کلثوم نے انتہائی حساس ٹاپک پر مختصر لکھ کر کمال کر دیا عورت نئی نسلوں کے لیے مثال ہوتی ہے۔ نظیر فاطمہ بھی ام کلثوم ہی کے ٹاپک کی ایک اور صورت لیے حواس پر چھا گئیں۔ عائشہ انصاری نے آرمی کی مشکل مگر تا ابد اچھے عادات کا مالک بنانے والی ٹریننگ پر خوب لکھا۔ پیاری مصباح مسکان ایم اے اردو کرنا مبارک ہو، آپ ہماری ایم اے سکھی بھی بن گئیں آپ کی تحریر پردہ کے متعلق مثالی تھی۔ عبایا پردے کی علامت نہیں ہے کیسے اس لباس کے ساتھ مذاق کیا جاتا ہے آپ نے ابتدائے تحریر میں خوب اچھی طرح بیان کیا۔ امبرین ناز، تبسم فیاض، ایقان علی، درخشاں ضیاء، سائرہ عبدالغفار، قرۃ العین سکندر ہماری ہر سکھی نے ردا میں چار چاند لگائے۔ مختلف موضوعات اور جامع انداز، ویل ڈن۔ حورینہ سعد، عائشہ خان آپ ردا کے لاسٹ میں تھیں مگر انداز تحریر نے آپ کو فرسٹ کر دیا۔ آخر میں میری موسٹ فیورٹ نائیلہ طارق کے مکمل ناول کا مزے سے تسلی سے مطالعہ کیا۔ نائیلہ جی کے جادوئی قلم نے ایک ہی ناول میں سمیٹ لیا گویا دریا کو کوزے میں بند کیا۔ اشعار میں عانیہ نیازی کا انتخاب دل دہلا گیا۔ اس ماہ میں نورین جی کا شاہکاری انتخاب، ریمانور کی اہم معلومات سے مستفید ہوئے۔ سندیسے میں ماریہ یاسر کرسی صدارت پر براجمان تھیں۔ فروری کے ردا میں عانیہ جی کو یہ سعادت نصیب ہوئی عانیہ تو ویسے بھی نمبرون ہیں۔ ان کا سندیسہ یک نگاہی مطالعہ والا نہیں ہوتا، دھیان سے پڑھتے ہیں۔ افشاں جی ہمیشہ کی طرح مجبشیں بکھیرتی نظر آئیں۔ افشاں آپ

کی تحریر میں بہت پختگی ہے۔ سیدہ فرزین اور شانہ زبیر کی مختصر انٹری تھی مگر ہمیں اچھی لگی۔ صبا عبدالعنی کے تفصیلی تبصرے نے مجھے سندیسہ پوسٹ نہ کرنے کا دکھ کم کر دیا کم وبیش ہماری ہی رائے ہمیں صبا جی کے نام سے قرطاس پر نظر آئی۔ جانے صبا آپ میں اتنا اخلاص کیسے موجود ہے کہ برتھ ڈے وش کرنا بھی نہیں بھولتیں۔ مارچ کے مہینے کی برتھ ڈے وش میں نے بھی وصول کی شکر یہ قبول کرو۔ ہماری پیاری رابعہ افضال۔ یقیناً تاخیر سندیسہ کا شکار ہوئی ہوں گی بہر حال ہم نے ہر ایک گام بہت مس کیا جہاں رہو خوش رہو۔ سب کو دلی خلوص پیش کرتے ہوئے اجازت۔

### ثوبیہ ملک — کراچی

پیاری آپ! میری طرف سے آپ کے لیے ڈھیروں دعا میں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ڈھیروں خوشیاں عطا فرمائے۔ کیونکہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو اندھیرے میں دیا جلاتے ہیں۔ اب آتے ہیں اپنے پیارے ردا کی طرف تو جناب مارچ کا مکمل شمارہ ہی زبردست تھا۔ سلسلے وار ناول دونوں ہی زبردست ہیں۔ افشاں علی اور نائیلہ طارق کو بھی میری جانب سے مبارک باد کیونکہ جو سفر انہوں نے ردا کے سنگ شروع کیا تھا وہ اب بڑھتا ہی جا رہا ہے جس کا کرپڈٹ آپ صالحوں کے سر جاتا ہے کیونکہ ان کی حوصلہ افزائی سے وہ آگے بڑھتی چلی گئیں۔ خیر مکمل ناول اس بار زبردست تھے اور وہ بھی ایک ساتھ تین اور ناولٹ نیا کنول زبردست ہمیشہ کی طرح۔ افسانوں کی تو یہاں لائن لگی تھی جو شروع ہوئی روشنی فاطمہ سے اور عائشہ خان پر اس کا اختتام ہوا تو میں سب کے لیے ہی کہوں گی کہ سب نے اچھا لکھا۔ اس کے علاوہ سب ہی سلسلے اچھے بلکہ بہت زیادہ اچھے تھے۔ اب آخر میں سب قارئین کا شکریہ اور ردا کے لیے بے شمار دعائیں۔

### افشاں علی — کراچی

محببتوں و خلوص کا نذرانہ لیے افشاں علی سندیسے



ہوتے ہیں۔ میں نے تو یہ دور ایسے گزرا کہ میری Students آج بھی میرے رابطے میں ہیں۔ افشاں میری ڈیڈ آف برتھ 28 جون ہے۔ کبھی وقت ملے تو پچھلے سال کے سارے رسالے چیک کیجیے گا ساری شاعری میں نے اپنی بھیجی ہے۔ بتائیے گا کہ شاعر بننے کے کچھ جراثیم ہیں مجھ میں۔ ضرور بتائیے گا میری محبت اور دعائیں آپ لوگوں کے نام۔

### مہرین کنول — کراچی

السلام علیکم! ردا کی شان شفیق صالحہ آپلی نورین آپلی، قارئین ورائٹرز مارچ کا ردا ہاتھوں میں ہے۔ ”گوشتہ آگہی“ اور ”ردائے جنت“ صالحہ آپلی کی خوب صورت تحریر سے مستفید ہوئے جن میں نصیحت اور اسلامی معلومات ہوتی ہیں۔ آگے سلسلے وار ناول ”تجھ سے مانگوں میں تجھ کو“ شازیہ آپلی کو کامیاب ناول لکھنے پر مبارک باد۔ ”چل اڑ جا اب تیری باری“ عائشہ ذوالفقار جی اچھا لکھ رہی ہیں۔ اقراء چنا جی، نائیلہ طارق جی، ایقان علی جی اور ثناء کنول جی اپنے خوب صورت ناولوں کے ساتھ ردا پر چھا گئیں۔ روشنی فاطمہ، ام کلثوم، نظیر فاطمہ، عائشہ انصاری، امبرین ناز، مصباح تبسم فیاض، درخشاں، سائرہ عبدالغفار، قرۃ العین سکندر، حورینہ سعد، عائشہ خان سب ہی نے بہت خوب لکھا۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے زور قلم میں مزید روانی و خوب صورتی عطا کرے۔ مکمل ناول میں نائیلہ طارق ”اک خواب کا نیلا پھول کھلے“ ہم تو نام پڑھ کر ہی فدا ہو گئے۔ بالکل اپنے نام کی طرح تھا آپ کا ناول۔ ”تنہائیوں کے شہر میں“ اقراء چنا آپ نے بھی خوب لکھا۔ ثناء کنول ”سرِ فصیل سکوت جاناں“ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ سلسلے وار ناول ”چل اڑ جا اب تیری باری“ عائشہ ذوالفقار آپ کا ناول بھی بڑی خوب صورتی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ ”ردا کی ڈائری“ میں اسماء جمشید کی ڈائری سے وحی شاہ کا کلام بہت خوب صورت تھا۔ ایم جے قریشی کی ڈائری سے محسن نقوی کا کلام بھی دل کو چھو گیا۔ ”اشعار“ سب ہی اچھے لگے۔ ”اس ماہ میں“ اقوال حضرت علیؑ بہت اچھے لگے۔ ”خوشبو“ میں موجود ہر لفظ خوشبو کی طرح مہکتا ہوا تھا۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں سب ہی کا کلام بہترین تھا۔ ”سندے“ کی محفل میں ماریہ یاسر، افشاں علی، صبا عبدالغنی نے خوب رونق لگائی۔ اپنے تفصیلی تبصرے کے ساتھ پیاری ماریہ یاسر میری تحریر کو پسند کرنے کے لیے بہت شکریہ۔ سوئیٹ افشاں علی آپ کو میری تحریر اچھی لگی اس کے لیے جزاک اللہ۔ ڈیر صبا عبدالغنی میری تعریف اور میری تحریر کو پسند

### رابعہ افضل خان — کراچی

ردا سے جڑی تمام پیاری سی قارئین، سوئیٹ سی صالحہ اپیا، کیوٹ سی نورین ملک اور تمام ردا اسٹاف کو ڈھیروں دعاؤں اور محبت سے گندھا رابعہ افضل خان کا سلام محبت قبول ہو۔ سرورق پر موجود صائمہ انصار کی پیاری سی مسکان کے ساتھ مارچ کا شمارہ 14

مارچ کو ہمارے ہاتھوں کی زینت بنا فہرست دیکھی تو ردا کی محفل میں افسانوں کی بہار ہی بہار بکھری پڑی تھی۔ سب سے پہلے ”گوشتہ آگہی“ میں بکھرے لفظوں سے مستفید ہوئے پھر ”ردائے جنت“ کا مطالعہ کرتے شازیہ مصطفیٰ کے ناول ”تجھ سے مانگوں میں تجھ کو“ آخری قسط پڑھ کر اچھا لگا۔ افسانوں کی محفل میں سب ہی کی انٹری بہت خوب صورت تھی۔ روشنی فاطمہ، ام کلثوم، نظیر فاطمہ، عائشہ انصاری، امبرین ناز، مصباح مسکان، تبسم فیاض، درخشاں ضیاء، سائرہ عبدالغفار، قرۃ العین سکندر، حورینہ سعد، عائشہ خان سب ہی نے بہت خوب لکھا۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے زور قلم میں مزید روانی و خوب صورتی عطا کرے۔ مکمل ناول میں نائیلہ طارق ”اک خواب کا نیلا پھول کھلے“ ہم تو نام پڑھ کر ہی فدا ہو گئے۔ بالکل اپنے نام کی طرح تھا آپ کا ناول۔ ”تنہائیوں کے شہر میں“ اقراء چنا آپ نے بھی خوب لکھا۔ ثناء کنول ”سرِ فصیل سکوت جاناں“ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ سلسلے وار ناول ”چل اڑ جا اب تیری باری“ عائشہ ذوالفقار آپ کا ناول بھی بڑی خوب صورتی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ ”ردا کی ڈائری“ میں اسماء جمشید کی ڈائری سے وحی شاہ کا کلام بہت خوب صورت تھا۔ ایم جے قریشی کی ڈائری سے محسن نقوی کا کلام بھی دل کو چھو گیا۔ ”اشعار“ سب ہی اچھے لگے۔ ”اس ماہ میں“ اقوال حضرت علیؑ بہت اچھے لگے۔ ”خوشبو“ میں موجود ہر لفظ خوشبو کی طرح مہکتا ہوا تھا۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں سب ہی کا کلام بہترین تھا۔ ”سندے“ کی محفل میں ماریہ یاسر، افشاں علی، صبا عبدالغنی نے خوب رونق لگائی۔ اپنے تفصیلی تبصرے کے ساتھ پیاری ماریہ یاسر میری تحریر کو پسند کرنے کے لیے بہت شکریہ۔ سوئیٹ افشاں علی آپ کو میری تحریر اچھی لگی اس کے لیے جزاک اللہ۔ ڈیر صبا عبدالغنی میری تعریف اور میری تحریر کو پسند



دل کی تمام تر گہرائیوں اور سچائیوں کے ساتھ منفرد ہوتے ہوئے منفرد لفظوں کے ساتھ تمام ردا ریڈرز، ردارائٹرز، روائیلی ممبر سب کی ذہنی قلبی سکون کے دعا گو ہوتے ہوئے سب کے لیے پیار اور خلوص بھرا السلام علیکم۔ کیسے ہیں آپ؟ میں اس بزم میں چاہ کر بھی نہیں آ پاتی۔ جنوری، فروری، مارچ مینوں شماروں پر تبصرہ کروں گی۔ سب سے پہلے 2016ء سب کو بہت بہت مبارک ہو۔ محبتوں اور چاہتوں سے سجایا گیا۔ سال نومبر Awsom میری موسٹ فیورٹ رائٹر سباس گل ”مجھے چاہت تمہاری ہے“ بہت اچھا لگا۔ ناولٹ دونوں زبردست رہے۔ سالی نومبر افسانہ نمبر لگا۔ اچھا لگا بہت زیادہ۔ اتنی ساری پیاری لکھاریوں کی شمولیت نائیلہ طارق جی کامیاب ناول نگاری مبارک ہو۔ آپ کی تحریر نے یادگار نقوش چھوڑے ہیں دل و دماغ پر۔ جنوری کے شمارے پر تبصرہ تھا۔ اب فروری پر تبصرہ حاضر ہے۔ ماریہ رضوی

خوب صورت انداز و لباس میں آنکھوں کو بھاگئیں۔ تمام مستقل سلسلے زبردست رہے۔ فاطمہ خان نیو رائٹر ہیں۔ ان کا افسانہ اچھا لگا۔ مزید لکھیے گا۔ ایس حبیب آپ کی تحریر ”عنادل تمہاری ہوئی دل سے“ واؤ امیزنگ ماسنڈ بلونگ مزہ آگیا۔ قرۃ العین سکندر کا ناولٹ بہت اچھا لگا۔ عائشہ ذوالفقار کافی ٹائم بعد آئیں اور چھا گئیں۔ آپ کی تحریر بول رہی ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ فروری کے شمارے میں تمام افسانے بہترین لگے۔ شہلا گل سحر بھی رد امبر میں اچھا اضافہ ہیں۔ ”سندیے“ افشاں علی تو زبردست لکھتی ہی ہیں۔ اس بار تو صبا عبدالغنی کا سندیہ بھی بہت اچھا لگا۔ اب آپ آئی ہوں مارچ کے شمارے کی طرف سوری افشاں علی کا مکمل ناول بہت زیادہ اچھا تھا۔ مارچ کا ٹائٹل دلہن صائم انصار میری فضاء تو دیوانی ہے دلہنوں کی۔ ٹائٹل ہی دیکھے جارہی ہے ڈائجسٹ چھٹی رہی۔ کافی دیر بعد ہاتھ آیا۔ فہرست دیکھ کر اچھا لگا۔ کافی اچھے رائٹرز شامل تھے۔ گوشہ آگہی مائی فیورٹ ہے۔ واقعی آپ ایسا لگتا ہے۔ ہم آمنے سامنے بیٹھ کر بات کر رہے ہیں۔ سلسلے دار ناول عائشہ ذوالفقار کا رد کی جان بنا ہوا ہے۔ بہت خوب بہت اچھی طرح آگے بڑھا رہی ہیں کہانی۔ ناولٹ میں شاء کنول جگمگا رہی تھیں۔ خوب لکھا کیپ اٹ اپ۔ افسانے تمام ہی اچھے لگے۔ روشنی فاطمہ، ام کلثوم زینب، نظیر فاطمہ، عائشہ انصاری، امبرین ناز، مصباح مسکان، تبسم فیاض، درخشاں ضیاء، سائرہ عبدالغفار، قرۃ العین سکندر، حورینہ سعد، عائشہ خان سبھی کی انداز تحریر پسند آیا۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں اس بار سبھی نے کمال کا لکھا۔ ”ردا کی ڈائری“ ہمیشہ کی طرح سچی سچائی مبہوت کر گئی۔ کچن، سنگھار، خوشبو، اشعار تمام سلسلے بہت خوب صورت ہیں۔ اللہ حافظ۔ دعاؤں میں یاد رکھنا۔







”رکھتے والا“ سب سے بہترین تھا۔ یہ افسانہ حقیقت سے بے انتہا قریب ہے۔ حالات ہی کچھ ایسے ہیں کہ ہر انسان دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ناولٹ بھی اچھا تھا۔ ”سندیے“ میں سب کی حاضری اچھی تھی لیکن کیتی آراء آپ کدھر غائب تھیں اس بار؟ دوستوں کے نام پیغام میں میرے علاوہ (آہم) مجھے سیدہ فرزین کا انتخاب اچھا لگا۔ باقی سب کے بھی اچھے تھے۔ باقی سارا رسالہ بھی بہترین تھا۔ آئندہ ماہ پھر حاضری دوں گی تب تک کے لیے اللہ حافظ۔

### شہلا گل سحر۔ کوہاٹ کینٹ

سوئیٹ صالحہ آپی اینڈ نورین جی، سلام محبت خدا وند کریم آپ لوگوں کو صحت کاملہ، عمر دراز اور ڈھیروں دائمی خوشیاں عطا فرمائے، آمین ثناء آمین۔ ردا ہاتھ میں آتے آتے تبصرے کا وقت گزر جاتا ہے۔ ”دیکھو میری بے بسی“ نیوز ایجنسی اتنی کالنگ کرتی ہوں کہ اب آواز سن کے ہی ڈائریکٹ کہا جاتا ہے ”جی ردا ابھی تک نہیں آیا“ اور تو اور جس علاقے میں میری شادی ہوئی یہاں بھی ردا اب بہت مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اپنی ہلکی پھلکی تحریروں اور انفرادیت کی وجہ سے شازیہ اور نائیلہ طارق کے خوب صورت ناول بھی اچھے تھے۔ فریدہ فرید کی تحریر بھی زبردست تھی۔ رابعہ انضالی کی تحریر تو ویسے بھی میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ کیتی آراء کے افسانے اور سندیے دونوں ہی اچھے ہوتے ہیں۔ پڑھ کے مزہ آتا ہے۔ ثناء کنول کیسی ہوڈیر؟ دیکھو لڑکی دنیا میں اور بھی لوگ ہیں یاسین کے سوا۔ ہا ہا ہا۔ صبا لکھو ایک کہانی تمہارے سندیے کی طرح تمہاری کہانی بھی پیاری ہوگی۔ صالحہ آپی کے کیا کہنے منفرد ٹاپک کے ساتھ نمودار ہوتی ہیں اور ٹھاہ کر کے چھا جاتی ہیں۔ ویسے بھی آپ میرے میاں جانی کی ہم نام ہیں تو اور بھی اچھی لگتی ہیں۔ ہاں جی کس نے کہا کہ پچر سخت مزاج

اٹھایا ہے وہ واقعی قابل تعریف ہے۔ ویلڈن مصباح جی۔ محبت کا جرم، خوش بخت، زندگی جہد مسلسل یا ہاتھ کنکٹن کو آری کیا، اتنی سی بات بھی اچھی تحریر تھیں اور آخر میں درخشاں ڈھیروں سسپنس لیے ہمیں اینڈ جاننے کو بے تاب کرتی چلی گئیں۔ انداز بیاں بھی خوب رہا۔ ”ردا کی ڈائری“ کے بھی انتخاب اچھے تھے۔ ”اس ماہ میں“ اقوال حضرت علیؓ، چھٹی کا دودھ، اس ماہ کا افسانچہ، یادیں، اس ماہ کی کرنیں، اس ماہ کے اقوال، اس ماہ کی اہم معلومات، اس ماہ کے بہترین کالم تھے۔ ”خوشبو“ ہمیشہ کی طرح بیسٹ رہا۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں بھی نے خوب لکھا۔ صبا عبدالغنی کے سندیے میں اپنی تعریف پڑھ کر خوشی بھی ہوئی صبا اور افشاں پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ کچن میں بیف قیمہ ہری مرچیں زبردست رہا۔ ”سنگھار“ میں جلد کی ساخت کے مطابق میک اپ بے حد مفید معلوماتی رہا۔ اب اجازت باقی ردا ابھی زیر مطالعہ ہے۔ اب ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اجازت۔ ☆ پیاری کیتی! پچھلے ماہ آپ کا سندیہ لیٹ ملنے کی وجہ سے شامل اشاعت نہ ہو سکا اور جس انٹرویو کا آپ ذکر کرتی ہیں وہ متعدد بار ردا میں لگ چکا ہے۔ اپنا خیال رکھیے اور خوش رہیے۔

### ہاریہ یاسر۔ کراچی

آداب عرض ہے امید ہے پیاری نورین اور اچھی صالحہ آپی آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ وعدے کے مطابق ردا 8 تاریخ کو ملا۔ شکریہ صالحہ آپی اور نورین آپ دونوں کا۔ تھوڑا سا خود پر فخر ہوتا ہے کہ اللہ کے کرم سے لکھنے والوں کی بھیڑ میں ہم بھی شامل ہو گئے ہیں، الحمد للہ۔ اب آتے ہیں اس ماہ کے پرچے کی طرف سرورق پر سانولی سلونی سی ماڈل دہن کے روپ میں اچھی لگی۔ مکمل ناول سارے ہی اچھے ہیں۔ سلسلے وار ناول میں مجھے عائشہ ذوالفقار کا ناول پسند ہے۔ افسانے سب ہی اچھے تھے لیکن



# فروش گاہِ فلاحی

ہیں اللہ رب العزت ہر سال تمہیں یہ دن دیکھنا  
نصیب کرے اور بہت بہت بہت ساری خوشیاں  
نصیب کرے، آمین۔

خوشی کا دن مبارک ہو  
صبح جس دم میں جاگی ہوں  
عجب منظر یہ دیکھا ہے  
خوشی کا رقص ہے چار سو  
ہواؤں میں بسی ہے خوشبو  
درختوں کے ہر پتے  
خوشی سے لہلہاتے ہیں  
تویوں محسوس ہوتا ہے  
یہ سب تالی بجاتے ہیں  
پرندے چہچہاتے ہیں  
یا شاید گنگناتے ہیں  
کوئی تو بات ہے ایسی  
ہر شے پر ہے یوں مستی  
میرے دل میں ہوئی ہلچل  
مجھے کچھ یاد آیا ہے  
چند سال پہلے جب  
اسی دن کے کسی لمحے  
جو تم دنیا میں آئے تھے  
یہ موسم اور یہ ہوا میں سب  
درختوں کے بھی پتے

میرے پیارے ابو جان کے لیے

میرے پیارے ابو جی! آپ کو عمرے کی  
سعادت بہت بہت مبارک ہو۔ میں بہت بہت  
بہت خوش ہوں کہ میرے پیارے سونے رب  
نے میرے محترم جان سے عزیز ابو جی کو یہ نیک  
سعادت بخشی۔ سوچ کر ہی اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ  
پاک سرزمین پر میرے پیارے ابو جی کعبہ شریف  
کی زیارت کریں گے۔ مدینہ منورہ میں قیام کریں  
گے۔ جن گلیوں میں کوچوں میں میرے پیارے  
نبی کریم گزرا کرتے تھے۔ میرے ابو جی ان کی  
گلیوں میں آنا جانا کریں گے۔ میری طرف سے  
فضا کی طرف سے (رضوان جی)، گھر والوں کی  
طرف سے ردا کی طرف سے میرے پیارے ابو  
جی ڈھیر ساری نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ  
بخیر و عافیت جائیں اور آئیں، آمین ثم آمین۔

ریمانور رضوان۔ کراچی

ڈیر ہسپینڈ جی کے نام

بہاروں اور پھولوں کی طرح مسکراتے رہو۔  
جھرنوں و آبشار کی طرح کھلکھلاتے رہو۔ میرے  
پیارے ہمسفر جی (محمد رضوان جی) تمہیں تمہاری  
سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ 21 اپریل۔ پپی  
برتھ ڈے ٹویو۔ میرے دل میں لاکھوں نہیں،  
کروڑوں نہیں، بے حد بے شمار، ان گنت دعائیں



رندے اور فضا میں  
خوشی سے کہہ رہے ہیں  
تمہیں یہ دن مبارک ہو  
خوشی کا دن مبارک ہو

”رضوان جی سالگرہ مبارک ہو“

نا معلوم کس کی نظم ہے۔ شکر یہ جی جس کی بھی  
ہے۔ میری طرف سے اور فضا ڈول کی طرف  
سے پاپا جانی کو پپی برتھ ڈے ٹویو۔

ریمانور رضوان۔ کراچی

### دوستوں کے نام

نا کام چاہت دشت غربت میں  
مفلوسوں کا لہو عام بکتا ہے  
کسی کا جسم بکتا ہے تو کسی کا نام بکتا ہے  
دنیا دے گی کیا تم کو اور تم لوگے کیا اس سے  
آمیر ادا من تھا م کہ میکدے میں جام بکتا ہے  
حرص کے بازاروں میں حوا کی بیٹی کا آنچل  
پہلے رات کو بکتا تھا اب سر عام بکتا ہے  
امیر شہر کے محلات کی بات بھی خوب ہے  
فقیر شہر کی گود میں آرام بکتا ہے  
ایم جے قریشی۔ ڈی آئی خان

### اپنے ہسینڈ کے نام

میرے لیے اس دنیا میں میرے والدین  
کے بعد سب سے معتبر اور خوب صورت احساس  
اور ساتھ آپ ہیں۔ آپ کو آپ کی سالگرہ پر  
بہت بہت مبارک باد۔ احمد میری زندگی کے سب  
مل آپ کے نام اور خدا سے دعا ہے کہ خدا آپ کو  
جیسی عمر اور ایسی ہزاروں سالگرہ کے دن نصیب  
کرے، آمین۔

میرے ہیدم، میرے دلبر میرے جانم  
ہو مبارک تمہیں جنم دن

میرے جذبوں کی پاکیزگی  
نئی حیات و چاہت مبارک ہو تمہیں  
میری دعا ہے

صدا مہکے تیری چاہت کا گلشن  
کا میا بی صدا چوے تیرے قدم  
صدا تم سرور رہنا

غموں سے دور بہت دور رہنا  
بلندی کو چھولیں تیری سب صدا میں  
جو آئے کبھی تیری آنکھوں میں آنسو  
تو سمیٹ لوں گی بڑھ کر دامن میں

میں اپنے  
میرے محبوب ہو مبارک ہر گھڑی  
کہ کرتی ہوں بس یہ دعا  
تیری یہ خوشی یونہی برقرار رہے  
زندہ ہمارے دلوں میں  
سدا یہ محبت رہے

مسز احمد۔ کراچی

### صوبیہ کے نام

مائی لولی ڈول صوبی جانی آپ کو اپنے پیپر  
میں کامیابی پر بہت بہت مبارک ہو۔ خدا کرے  
کہ تم اپنی کامیابیوں کا یہ سلسلہ سدا یونہی جاری  
رکھو، آمین۔ تمہاری خالہ جانی، نانو، ماموں سب  
بہت خوش ہیں اپنی لعل پر سنز کی اس شاندار  
کامیابی پر کہ تم نے نہ صرف اپنی کلاس میں بلکہ  
اپنے اسکول میں ٹاپ کیا ہے۔ آئی پراؤڈ آف یو  
مائی لعل ڈول لو یو سوچ۔

صباحر۔ ہارون آباد

### ایک انا پرست کے نام

پھر یوں ہوا کہ راستے یکجا نہ ہو سکے



وہ بھی انا پرست تھا میں بھی انا پرست  
دھنک ناز۔ کراچی

### سعدیہ خالد کے نام

میری پیاری اور خوب صورت سی سعدیہ تم بہت  
بلد پیادیں جا رہی ہو وہ بھی سات سمندر پار۔ یعنی  
یو کے۔ تو ہم سب دوستوں کی طرف سے تمہیں  
شادی کی ڈھیروں مبارکباد خدا کرے کہ تمہارا یہ نیا  
سفر خوشیوں اور پھولوں بھرا ہو جتنی پیاری تم ہو اتنا  
پیارا تمہارا نصیب بھی ہو قدم قدم پر کہکشاں بکھری  
ہو جن پر تمام زیست تم نزاکت سے چلتی رہو۔ خوش  
رہو۔ سدا میری پیاری دوست۔

عانیہ نیازی۔ ربوہ

### ڈیر سسٹر ماہ رخ کے نام

تمہاری برتھ ڈے آنے والی ہے سو چاہیں بار  
کچھ اسپیشل طریقے سے تمہیں شکر کروں۔ تمہیں  
25 کو تمہاری 25 ویں برتھ ڈے بہت بہت  
مبارک ہو۔ میری دعا ہے یہ سال تمہاری زندگی  
میں بے شمار خوشیاں لے کر آئے۔ تمہارے دل کی  
ہر خواہش پوری ہو۔ سدا مسکراتی رہو۔ کوئی غم  
تمہارے پاس نہ پھٹکے۔ تمام عمر خوشیاں تمہاری  
منتظر ہوں۔ دائمی خوشیاں جو کبھی ختم نہ ہوں اور یہ  
نیا سال تمہارے لیے لگی ثابت ہو اور ہر دوش پوری  
ہو، (آمین)۔ اینڈ میں پوری فیملی کو کو میرا سلام۔  
عائشہ مری۔ کوئٹہ

### بہن انعم خان اور پیاری پیاری دوستوں کے نام

السلام علیکم ایسی ہو آپ سب۔ مجھ کو دیکھ کے  
حیران ہونے کی ضرورت نہیں دیکھو تم سب کی  
محبت میں، میں نے بھی آخر قلم تھام ہی لیا (ہاہا  
ہا)۔ سب سے پہلے تو انعم یا تم بھی اب کچھ لکھ ہی

لو۔ آرام بہت ہو گیا۔ ہاں تو پیاری پیاری  
دوستوں قرۃ العین سکندر، اقراء سیف، افشاں علی،  
فاطمہ خان، زینب ندیم، سونیا چوہدری، ریمیل  
آرزو تم سب کو ردا میں پڑھ کے بہت اچھا لگا۔  
ایسے ہی لکھتی رہو۔ سب اور میں بھی (ہاہاہا)۔ سیدہ  
فرزانہ آپ کو شادی کی بہت بہت مبارکباد۔  
کیٹی آراء آپ کا نام بہت پیارا ہے۔ خوش  
رہیں۔ دھنک ناز آپ کا نام بھی بہت پیارا ہے۔  
آخر میں شہزادی صاحبہ کے لیے بہت سارا پیار  
ہمیشہ ہنستی مسکراتی رہو۔ مہوش آپ سب کی  
دوست معصوم سی کڑی یعنی کے میں اب اجازت  
چاہتی ہوں۔ بائے بائے۔

کنول خان۔ ہری پور ہزارہ

### شازیہ آپی اور نائیلہ آپی کے نام

پیاری سی شازیہ آپی آپ کے ناولز مجھے بہت  
پسند ہیں جن میں رشتوں کی خوب صورت نوک  
جھونک دل کو لبھاتی ہے وہیں کہیں پیار کی چاشنی  
محبت پر یقین بڑھاتی ہے۔ مجھے آپ کا انداز تحریر  
بہت پسند ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔  
نائیلہ آپی آپ کا پہلا ناول بہت کمال تھا شیٹ اور  
سارا مجھے آج تک یاد ہے اپنے خوب صورت  
مکالموں اور جذبات کی شدت کی وجہ سے۔ خرمن  
اور عارش بھی اچھے تھے مگر شیٹ اور سارا تو کمال  
تھے۔ آپی آپ کی تحریر کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے  
جو ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ بہت سی دعائیں  
اور پیار آپ کے لیے۔ آپ کا قلمی سفر یونہی جاری و  
ساری رہے اور آپ ہمارے لیے یونہی لکھتی رہیں۔

صباحر۔ ہارون آباد

☆.....





## ریشمی بریانی

بر پھیلا کر خستہ کر لیں، پھر ہاتھ سے چورہ کر لیں۔  
گرم تیل کو مرغی پر ڈال دیں، تیل ٹھنڈا ہو جائے تو  
کریم ملا لیں۔ ایک کھلے منہ کی دیکھی میں آدھا کلو  
چاول، مرغی آدھا کلو، پیاز اور باقی چاول کی تہہ لگا  
دیں دودھ میں زردے کا رنگ ملا کر چاولوں پر  
ڈالیں اور دم پر رکھ دیں۔ مزیدار بریانی باقی پیاز  
اور پودینے سے سجا کر پیش کریں۔

### سبزی اور لہسن والی مرغی

اجزاء  
مرغی کی بوٹیاں (بغیر : تین سو گرام  
ہڈی)

شملہ مرچ : ایک عدد  
گاجر : ایک عدد  
ہری پیاز : دو عدد  
پانی : ایک پیالی  
بند گوبھی : تھوڑی سی  
ہری مرچیں : چار عدد  
ہرا دھنیا : پون گڈی  
لہسن : بارہ جوے

کٹی ہوئی کالی مرچ : ایک کھانے کا چمچہ  
وارچٹر شائرساس : دو کھانے کے چمچے  
کارن فلور (پانی میں گھلا ہوا) : دو کھانے کے چمچے  
چلی گارلک ساس : چار کھانے کے چمچے

اجزاء  
مرغی کا گوشت : ڈیڑھ کلو  
چاول (اُبے ہوئے) : ڈھائی پیالی  
پسا ہوا لہسن اور رک : ایک کھانے کا چمچہ  
دہی : ایک پیالی  
ہری مرچیں (کچل لیں) : آٹھ عدد  
کٹی ہوئی کالی مرچ : ایک چائے کا چمچہ  
لیموں کارس : چار کھانے کے چمچے  
تازہ کریم : آدھا کلو  
پیاز (باریک کٹی ہوئی) : تین عدد  
تازہ دودھ : ایک پیالی  
زردے کا رنگ : ایک چٹلی  
پودینہ : آدھی گڈی (سجانے کے لیے)

نمک : حسب ذائقہ  
تیل : ایک پیالی  
مکھن : ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب: دیکھی میں مرغی کا گوشت، لہسن،  
اورک، پودینہ، ہری مرچیں، دہی اور نمک ملا کر  
مرغی کا پانی خشک ہونے تک پکائیں۔ اس میں کالی  
مرچ اور لیموں کارس ملا کر چولہا بند کر دیں۔ کڑا ہی  
میں تیل گرم کریں اور پیاز تل کر نکالیں۔ اسے کاغذ



اسے دھنئے اور لیموں کے قلوں سے سجا کر پیش کریں۔

## دم والے کباب

اجزاء

گائے کا قیمہ : آدھا کلو  
پسا ہوا لہسن اور ک : دو کھانے کے چمچے  
کٹی ہوئی لال مرچ : ایک چائے کا چمچ  
پسا ہوا گرم مصالحہ : ایک چائے کا چمچ  
کچری پاؤڈر : دو چائے کے چمچے  
کٹا ہوا سفید زیرہ : ایک چائے کا چمچ  
انڈہ : ایک عدد

پیاز (باریک کٹی ہوئی) : دو عدد  
پیاز (لچھے کٹے ہوئے) : ایک عدد  
ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی) : چھ عدد  
ہر ادھنیا : پون گڈی (چھڑکنے کے لیے)  
سوکھی لمبی لال مرچیں : چھ عدد  
(بیج سے کٹی ہوئی)

نمک : حسب ذائقہ

تیل : دو کھانے کے چمچے

ترکیب: چوپر میں قیمہ، لہسن اور ک، لال مرچ، گرم مصالحہ، کچری، زیرہ، انڈہ، باریک کٹی پیاز، ہری مرچیں، ہر ادھنیا اور نمک ملا کر یکجان کر لیں۔ اس آمیزے کے لبوترے یا گول کباب بنالیں۔ دیتچی میں ایک پیالی پانی ابالیں، اس میں کباب رکھیں اور ہلکی آنچ پر ڈھکن ڈھانک کر پکائیں۔ ساس پین میں تیل گرم کریں، اس میں لچھے دار پیاز اور لال مرچیں ڈھک کر تلیں۔ اس پر

نمک : حسب ذائقہ

تیل : چار کھانے کے چمچے

ترکیب: مرغی، شملہ مرچ، گاجر، ہری پیاز، گوبھی، ہری مرچوں، ہرے دھنئے اور لہسن کو چھوٹا، چھوٹا کاٹ لیں۔ دیتچی میں تیل گرم کر کے لہسن سنہری کریں۔ اس میں مرغی ملا کر پانچ منٹ تک پکا کر تمام سبزیاں شامل کر دیں۔ مزید پانچ منٹ پکانے کے بعد کالی مرچ، وارچٹر شائر ساس، چلی گارلک ساس، پانی اور نمک ملا لیں۔ پانی ابلنے لگے تو چمچ چلاتے ہوئے کارن فلور ملائیں اور آنچ تیز کر کے اسے پانچ منٹ تک بھونیں اور ڈش میں نکال لیں۔

## مچھلی کے اچاری تکه

اجزاء

راہو مچھلی کے ٹکڑے : آدھا کلو  
(دھلے ہوئے)

لیموں : چار عدد  
پسی ہوئی ہلدی : ایک چائے کا چمچ  
بھنا اور پسا ہوا سفید زیرہ : ایک چائے کا چمچ  
کٹی ہوئی لال مرچ : ایک کھانے کا چمچ  
تکه مصالحہ (پکٹ والا) : دو کھانے کے چمچے  
سفید سرکہ : دو کھانے کے چمچے

نمک : حسب ذائقہ

تیل : تلنے کے لیے

لیموں کے قتلے، ہر ادھنیا : سجانے کے لیے

ترکیب: مچھلی میں مصالحہ ملا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ گرل پین یا فرائنگ پین میں تھوڑا سا تیل گرم کر کے مچھلی کے ٹکڑے اس پر دونوں جانب سے سنہری سینک لیں اور درمیان میں تھوڑا تھوڑا تیل لگاتے جائیں۔ انہیں سرورنگ ڈش میں نکال لیں،



کباب رکھیں اور ڈھکن ڈھک کر دم پر رکھ دیں۔  
مزید ارکبابوں پر ہر ادھنیا چھڑکیں اور گرم پیش کریں۔

## ترتی چنے کی دال

اجزاء

ترتی : آدھا کلو

چنے کی دال (ابلی ہوئی) : ایک پیالی

پیاز (باریک کٹی ہوئی) : دو عدد

سونف : ایک چائے کا چمچہ

کلو نجی : ایک چائے کا چمچہ

پسی ہوئی ہلدی : ایک چائے کا چمچہ

سوکھی گول لال مرچیں : آٹھ عدد

سوکھی ہوئی کھٹائی : چار عدد

ہر ادھنیا (باریک کٹا ہوا) : آدھی گڈی

ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی) : چار عدد

نمک : حسب ذائقہ

تیل : آدھی پیالی

ترکیب: ترتی چھیل کر باریک کاٹ لیں۔ دیکھی میں تیل گرم کریں اور پیاز تل کر نکال لیں۔ اسی دیکھی میں ترتی، ہلدی اور نمک ملا کر بھونیں۔ اس میں دال، لال مرچیں، سونف، کلو نجی اور کھٹائی ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ مزید ار ترتی میں ہر ادھنیا، ہری مرچیں اور تلی ہوئی پیاز ملا کر پیش کریں۔

## کباب بریانی

اجزاء

گائے کا قیمہ : آدھا کلو

پسا ہوا گرم مصالحہ سفید : ایک، ایک چائے کا چمچہ

زیرہ

پسا ہوا لہسن اور ک : ایک کھانے کا چمچہ

پیاز (پسی ہوئی) : ایک عدد

پیاز (تلی ہوئی) : دو کھانے کے چمچے  
خشخاش، بھنے ہوئے چنے : دو دو چائے کے چمچے  
پسی ہوئی لال مرچ، نمک : ایک، ایک چائے کا چمچہ  
چاول (ابلے ہوئے) : آدھا کلو  
مصالحے کے اجزاء :

پسا ہوا لہسن اور ک : ایک کھانے کا چمچہ

پسی ہوئی لال مرچ، سفید زیرہ : ڈیڑھ ڈیڑھ چائے کا چمچ

دہی، پیاز (تلی ہوئی) : ایک، ایک پیالی

ناریل کا دودھ، ہر ادھنیا : دو کھانے کے چمچے

جاو تری، جائفل، چھوٹی : پون پون چائے کا چمچ

الایچی (پسی ہوئی)

زردے کا رنگ : ایک چٹکی

ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی) : چار عدد

نمک : ایک چائے کا چمچہ

تیل : آدھی پیالی

ترکیب: چوپر میں قیمہ، کچی اور تلی ہوئی پیاز،

لہسن اور ک، گرم مصالحہ، زیرہ، خشخاش، چنے، لال

مرچ اور نمک ملا کر یکجان کر لیں۔ اس آمیزے کے

چھوٹے چھوٹے کباب بنالیں۔ دیکھی میں تیل گرم

کریں، اس میں پیاز، لہسن اور ک اور تھوڑا سا پانی

ملا کر بھونیں۔ مسلسل چمچہ چلاتے ہوئے لال مرچ،

دہی، جائفل، جاو تری، الایچی، پیاز، دھنیا، ناریل کا

دودھ اور نمک ملائیں۔ ابال آنے لگے کباب تہہ کی

طرح سے رکھ دیں۔ ایک دیکھی میں پون پیالی

پانی، پون پیالی تیل، آدھا کلو چاول، کباب کا

مصالحہ، ہر ادھنیا، ہری مرچیں، باقی چاول، زردے

کا رنگ اور کیوڑے کی تہہ لگائیں اور دم پر رکھ

دیں۔ اسے احتیاط سے ڈش میں نکالیں اور گرم گرم

پیش کریں۔

☆.....



# سنگھار

ہے، اس میں سے سونا وہی ڈھونڈ پائے گا جس نے اپنی محنت اور قوی توجہ اور جدوجہد سے اس میں مہارت حاصل کی ہوگی۔ آپ جب تک ذہنی طور پر اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے آمادہ نہ ہوں گے جب تک یہ کام آپ کو خوفزدہ اور پریشان کرے گا۔ ایک دفعہ آپ کے ارادے اور مضبوط عمل سے پابندی سے اس پر کمر کس لی تو یقیناً آپ بھی وزن کم کرنے میں کامیاب ہو ہی جائیں گے۔ مگر پہلا قدم شرط ہے۔

وزن گھٹانے کے کئی طریقے ہیں۔ آپ پہلے تمام چیزوں اور طریقوں کو صحیح طور سے جانچیں اپنے ڈاکٹر وغیرہ سے رجوع کریں اور پھر اپنے ڈائنٹ پلان کے مطابق عمل کرنا شروع کریں۔ سب سے اہم غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ عام سوچ کے مطابق کھانا چھوڑنے سے وزن کم ہونا شروع ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ بالکل غلط ہے کھانا چھوڑنے سے جسم میں کئی طرح کی پیچیدگیاں جنم لی سکتی ہیں، گھی، تیل، مکھن، مارجرین وغیرہ سے بالکل خوفزدہ نہ ہوں، استعمال کریں مگر اعتدال اور توازن کے ساتھ۔ اور قدرتی نعمتوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے وزن گھٹائیں اور خوب صورت، تندرست و توانا نظر آئیں۔

وزن گھٹائے خوب صورت نظر آئے  
کس کا دل نہیں چاہتا کہ وہ خوب صورت نظر آئے، لوگوں میں سراہا اور چاہا جائے! یقیناً یہ ایک فطری جذبہ ہے، ہر انسان کی انفرادیت اپنی جگہ مگر بے ڈول اور بھدا جسم کسی کو نہیں بھاتا، نہ بھانا یا ناپسند ہونا بھی اپنی جگہ مگر موٹاپا ہونا تمام بیماریوں اور جسمانی عوارض کی جڑ بھی ہو سکتا ہے تو ایسے لوگ جن کو یہ موضوع بیکار لگے وہ اس کی تفصیلات بس ایک مرتبہ دھیان اور توجہ سے پڑھ لیں، اس میں صرف خوب صورتی کے لیے ہی وزن کم رکھنے کی تاکید اور تراکیب نہیں ہیں بلکہ اس نے آپ کو موذی اور جان لیوا عوارض سے بچنے کی بھی کئی ہدایت نظر آئیں گی۔

20 ایسے سادہ طریقے بتائے ہیں کہ جن سے آپ باآسانی وزن کو کم اور کنٹرول میں لاسکتے ہیں، تو بڑی مستقل مزاجی سے آپ کو اس پر عمل پیرا ہونا پڑے گا تب ہی آپ کامیابی کی بلندیوں کو چھو پائیں گے، ہم میں سے کئی لوگ چاہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ تندرست، صحت مند، چست و توانا رہیں، وہ اس کے لیے بھرپور لگن اور انتھک محنت بھی کرتے ہیں۔ اور اس طرح وہ بہتر زندگی بھی گزارتے ہیں۔ وزن کم کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے یہ ایک سونے کی کان کی مانند



☆ کم چکنائی اور کم کیلوری والی غذائیں اپنائیں۔

☆ روٹی اور پاستا کم کر دیں۔

☆ مٹھائی کو ہفتہ میں ایک دفعہ استعمال کریں۔

☆ سوٹ ڈرنکس کو الوداع کہہ دیں۔

☆ پھل اور سبزی وغیرہ اپنائیں۔

☆ سلاد اور قدرتی اجزاء کی عادت اپنائیں۔

☆ پروٹین سے بھرپور چیزیں استعمال کریں جیسے کہ مچھلی اور مرغی۔

☆ جم وغیرہ جانے کے بجائے ایسی ورزش کا انتخاب کریں جو آپ خود گھر پر اچھے طریقے سے کر پائیں، انہیں اپنی عادات کا حصہ بنالیں۔

سادگی اپنائیں:

آپ کے کھانے جس قدر سادہ اور غذائیت سے بھرپور ہوں گے اتنی ہی جلدی آپ وزن گھٹا سکیں گے۔ اس سے نہ صرف آپ کا قیمتی وقت بچے گا بلکہ آپ مزید چاق و چوبند بھی رہ سکیں گے۔ مثال کے طور پر ہلکے تیل یا بھاپ میں بنی مچھلی، سلاد اور ہلکے پھلکے براؤن رائس کے ساتھ یقیناً ایک صحت بخش غذا ہے۔ دالیں، مکی، ابلے چاول، مچھلی، مرغی، نوڈلز یقیناً اچھا انتخاب ہو سکتے ہیں، بھنے ہوئے کھانے اور مصالے کئی بیماریوں کی جڑ ہیں۔ ہمارے دین نے بھی سادگی کا حکم اور تعلیم دی ہے۔

اپنے کھانے پر اپنی بھرپور نظر اور توجہ رکھیں:

آپ کو اپنے اور اپنے کھانے کے لیے ایک مقررہ وقت، مقررہ مقدار اور مثبت رویہ اپنانا ہو گا۔ آرام، اطمینان اور توجہ سے کھانا کھانے سے آپ کو شعوری اطمینان اور سکون حاصل ہو گا اور اس طرح وزن کم کرنے میں مدد حاصل ہوگی۔

کھانا چھوڑنے سے گریز کریں:

بہی یہ غلطی نہ کریں کہ کھانا چھوڑنے سے آپ وزن کم کرنے لگیں۔ یہ سراسر غلط رویہ ہوگا کیونکہ اس طرح آپ زیادہ بھوک لگنے پر زیادہ کھانے لگیں گے۔ اس طرح کرنے سے بہت سے لوگ کم شوگر لیول تک پہنچ کر خطرناک حد تک بیمار ہوتے نظر آئے ہیں۔ اس طرح سے ہم مزید بیمار ہو کر چڑچڑے پن، بد مزاجی اور اکھڑے مزاج کے مریض بن سکتے ہیں۔ لہذا اعتدال اور میانہ روی کے ساتھ کھائیں اور خوش باش صحت مند رہیں۔

پانی اور غذائیت سے بھرپور کھانے:

ایسے سوپ اور کھانے جن میں پانی اور شوربہ زیادہ ہوں وہ آپ کو شکم سیری کا بھرپور احساس دیں گے۔ ایسے کھانے جن میں ٹماٹر، کچنی اور کم چکنائی والی مچھلی اور مرغی بھی شامل ہیں۔ یہ کم خرچ اور بالائین کے مقاصد آپ کو کم کھانے میں بہتر اور مناسب کیلوری فراہم کرتے ہیں۔ اور بھوک کا احساس ختم کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اپنی پلیٹ کو سبزی اور فروٹ سلاد سے بھرپور بنائیں ان میں زیادہ مقدار میں پانی اور فائبر پایا جاتا ہے جو کہ آپ کو تندرستی بخشتے ہیں۔ جلد کے لیے:

(1)۔ مسور کی دال پیس کر دہی میں ملا لیں، اچھی طرح پھینٹ کر چہرے پر لگالیں، سوکھنے پر اتار دیں، جلد چمکدار ہو جائے گی۔

(2)۔ زیتون کا تیل، شہد، ہلدی اور صندل میں ملا کر چہرے پر لگائیں پندرہ منٹ بعد دھو لیں یہ عمل خشک اور مرجھائی ہوئی جلد کو تازہ کرتا ہے۔ ☆